هو الوارث الكريم

الدائم الحی القيوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان ھٰذہ تذکرۃ فمن شآء اتخذ الیٰ ربہ سبیلا (القرآن)

﴿ اہلِ ایمان کو اللہ سے بڑی محبت ہوتی ہے ﴾

منہاج العشقیہ

فی

ارشاد الوارثیہ

ملفوظات سیدنا حافظ حاجی **وارث علی شاہ** قدس سرہ العزیز

از تالیف منیف

جناب مرزا محمد ابراہیم بیگ شیداؔ وارثی لکھنوی

تسہیل وتخریج وحواشی: راشد عزیز وارثی المعروف فقیر مراد شاہ وارثی

ناشر: مکتبۂ وارثیہ سنگھوئی، جہلم۔ پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	منہاج العشقیہ فی ارشاد الوارثیہ
مؤلف	مرزا ابراہیم بیگ شیداؔ وارثی
تسہیل و تخریج و حواشی	راشد عزیز وارثی المعروف فقیر مراد شاہ وارثی
پروف ریڈنگ	ڈاکٹر راشد علی اویسی
کمپوزنگ	سبطین علی تاج
ٹائیٹل	ایاز شہباز (انجمی پرنٹنگ پریس، جہلم)
صفحات	۳۶۸
تعداد	۵۰۰
سنِ طباعت	۲۰۱۸ء
ہدیہ	۵۰۰ روپے
اشاعت باہتمام	فقیر ڈاکٹر قاضی تنویر شاہ وارثی
ناشر	مکتبۂ وارثیہ سنگھوئی، جہلم
مطبع	زاویہ فاؤنڈیشن، لاہور 0322-4695246

رابطہ برائے حصولِ کتاب

۱۔ ناظم حلقہ فقراء وارثیہ	دیوہ شریف (انڈیا)
۲۔ آستانۂ عالیہ وارثیہ	چھپر شریف (پاکستان)
۳۔ زاویہ فاؤنڈیشن	داتا صاحب والی گلی، لاہور (پاکستان)
۴۔ مکتبۂ وارثیہ	سنگھوئی، تحصیل و ضلع جہلم (پاکستان)

شرفِ انتساب

منہاج العشقیہ فی ارشاد الوارثیہ

کا یہ حسین و جمیل نقش ثانی

مرشد کریم سرکار حضور عالم پناہ

سیدنا حافظ حاجی وارث علی شاہ قدس سرہ العزیز

کی بارگاہِ بے کس پناہ میں بطور نذرانۂ عقیدت و محبت پیش ہے

بوساطت

پاکستان میں دیوہ شریف

آستانۂ عالیہ وارثیہ چھپر شریف

کے بانیان

سرکار حضور عالم پناہؒ کے آخری احرام پوش

پنجابی حافظ حضرت فقیر اکمل شاہ وارثیؒ

اور شبیہہِ وارثِ عالم نوازؒ

حضرت الحاج فقیر عزت شاہ وارثیؒ

مختصر شجرۂ عالیہ نسبتِ اویسیہ وارثیہ

محمدؐ گل است و علیؑ بوئے گل
بود فاطمہؑ اندریں برگِ گل
زِ عطرش برآمد حسینؑ و حسنؑ
و روحِ زِ عطرش یکے گل بدن
معطر زِ خوشبوئش ارض و سماں
و نامیست وارِث علیؓ دَر جہاں

نذرِ عقیدت بحضور وارثِ عالم نواز
قدس سرہ العزیز

وارثِؒ کارساز کے صدقے
مرشد بے نیاز کے صدقے
ہم فقیروں کو سربلند کیا
ایسے ذرّہ نواز کے صدقے
میری حیرتؔ انہیں کا صدقہ ہے
اپنے آئینہ ساز کے صدقے

(شہیدِ محبت حضرت الحاج فقیر حیرتؔ شاہ وارثیؒ)

فہرست مضامین

شمار	مضامین
حصہ اوّل	
(الف)	حرفِ آغاز نقش ثانی
	دیباچہ---(حصہ اول)
(ب)	ابتدائیہ----
۱	بیعت کے بیان میں---
۲	توحید کے بیان میں
۳	محبت کے بیان میں---
۴	کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ---
۵	حرص وطمع وحسد کے بیان میں
۶	کسب وتوکل------
۷	تشخیص انکارواشغال وغیرہ--
۸	اسم ذات کی تعلیم----
۹	اسم حق کی تعلیم----
۱۰	درودشریف-----
۱۱	تصور کی اہمیت----

۱۲
۱۳
۱۴
۱۵
۱۶
۱۷
۱۸
۱۹
۲۰
۲۱
۲۲
۲۳
۲۴
۲۵
۲۶
(ت)
حصہ دوم
(الف)

۱۲ خاص مجاہدات۔۔۔۔۔
۱۳ شغل سلطان الاذکار۔۔۔
۱۴ محبت کا اثر۔۔۔۔۔
۱۵ روزہ کے حکم میں۔۔۔
۱۶ حج کے بیان میں۔۔۔۔
۱۷ حکم گوشہ نشینی۔۔۔۔
۱۸ حکم خاموشی۔۔۔۔
۱۹ آنکھ بند رکھنے کا حکم۔۔۔۔
۲۰ آنکھ کھلی رکھنے کا حکم۔۔۔۔
۲۱ خدابخش صاحب کا واقعہ۔۔
۲۲ عام ہدایات۔۔۔۔
۲۳ نفی جانشین وخلافت کے بیان میں۔۔
۲۴ پیرومرید کی نسبت۔۔۔۔
۲۵ امداد غیبی۔۔۔۔۔
۲۶ فیضان وارث پاک۔۔
(ت) تقریظ بے نظیر از جناب حاجی سلیمان احمد

حصہ دوم

(الف) تمہید۔۔۔۔

۱ مقام فقر کے بیان میں---
۲ فقرائے وارثی کے بیان میں
۳ طریقہ تہبند پوشی----
۴ حضور انور کے احرام شریف پہننے کا انداز
۵ حضور انور کے حج کے بیان میں
۶ لباس (احرام شریف) کی بیان میں
۷ زرد رنگ کے احرام کے بیان میں
۸ اولیاء اللہ کی انبیائے سابقین سے مناسبت
۹ تبدیلی اسم کے بیان میں---
۱۰ اولاد صلبی و قلبی کے بیان میں
۱۱ مختلف احکامات فقر---
۱۲ فقیر کی تعریف---
۱۳ فقیر کو کسب سے احتراز--
۱۴ قناعت کے بیان میں---
۱۵ توکل خاص کے بیان میں---
۱۶ گنڈا، تعویذ، دعا و بددعا کی ممانعت
۱۷ زمین پر بیٹھنے لیٹنے کا حکم---
۱۸ پیر کی اطاعت کے بیان میں--
۱۹ مناکحت و تجرید کے بیان میں--

(ب) تقاریظ

۱ تقریظ بے مثل (حاجی اوگھٹ شاہؒ)

۲ تقریظ ریختہ (مولوی عمران احمد وارثی)

۳ تقریظ تاریخ (حکیم مولوی سید احمد وارثی

۴ تقریظ (شیخ اعجاز احمد عرف نوشہ میاں)

۵ تقریظ دل پذیر (مولوی ضمیر احمد وارثی)

۶ قطعہ تاریخ (قاضی سلیمان احمد وارثی)

حرفِ آغاز نقشِ ثانی

از قلم: راشد عزیز وارثی المعروف فقیر مراد شاہ وارثی

جناب مرزا محمد ابراہیم بیگ شیدؔا وارثی (۱۲۸۱ھ تا ۱۳۶۴ھ) مغلیہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ نے لکھنوی دبستان میں پرورش پائی۔ حسن و عشق کے دلدادہ تھے۔ صاحب مطالعہ بھی تھے، سخن شناس بھی تھے اور شعر گوئی کی صلاحیتوں سے بھی مالا مال تھے۔ بچپن میں ہی سرکار وارث عالم نوازؒ کے دستِ حق پرست پہ بیعت ہو گئے۔ انہوں نے سادہ لباس میں فقیری کی۔ سرکار کی وضع پہ ایسے عمل پیرا ہوئے کہ ساری زندگی مجرد رہے۔ سرکار سے محبت کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اپنا سب کچھ اس محبت میں ترک کیا، آبائی وطن چھوڑا اور ہجرت فرما کر ہمیشہ کیلئے سرکار حضور عالم پناہؒ کے کوچے میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ساری زندگی سرکار کے قدموں میں گزاری۔ اور بعد از وصال آستانہ کے پہلو میں کتب خانہ کے صحن میں آپ کا مدفن بنا۔

جبھی جا کے مکتب عشق میں سبق مقام فنا لیا
جو لکھا پڑھا تھا نیاؔز نے سو وہ صاف دل سے بھلا دیا

مثنوی شریف میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ''شریعت کتابوں سے مل جاتی ہے۔ لیکن عشق اور روحانیت و طریقت کیلئے مرشد کامل کی صحبت ضروری ہے۔''

صد کتاب و صد ورق در نار کن
روئے دل را جانبِ دلدار کن

شیدؔا میاں علمی اعتبار سے اپنی ذات میں ایک مکمل ادارہ تھے۔قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، منطق، فلسفہ، عروض، شریعت، طریقت ہر میدان میں انہیں دسترس حاصل تھی۔آپ کی جملہ کتب اس امر کی شاہد ہیں۔لیکن جب ہم سرکار وارث پاک کے دربارِ گہر بار پہ نظر ڈالتے ہیں تو وہاں شیدؔا میاں زبان کو تالا لگائے کہیں کسی کونے کھدرے میں دبکے نظر آتے ہیں۔نہ کوئی علمی موشگافی، نہ کوئی بحث مباحثہ، نہ کوئی نقطہ چینی اور نہ ہی کوئی رعب و دبدبہ کا اظہار۔سب کچھ بھلا کے مولانا رومؒ کا مشورہ پلے باندھ کر مرشدِ کریم کے قدموں میں بیٹھے رہے کہ جب کسی مولوی کی محفل میں جاؤ تو زبان قابو میں رکھو اور جب کسی مردِ کامل کی بارگاہ میں حاضر ہو تو دل قابو میں رکھو۔ وہاں کچھ سوچنا بھی ممنوع ہے کہ ولی کامل کی نگاہ اللہ کے فضل سے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والے معمولی سے معمولی خیالات کو بھی لمحہ بھر میں بھانپ لیتی ہے۔

تیری نگاہ کو رب کی نگاہ کہتے ہیں
اسی لئے تجھے عالم پناہ کہتے ہیں

شیدؔا میاں نے اپنی زبان کو اور اپنے دل کو قابو میں رکھا اور اپنا سینہ سیپ کی مانند چاک رکھا۔لہٰذا جب ابرِ بہار برسا تو رحمت کے جو قطرے اس چاک گریبان کے حصے میں آئے وہ سچے موتی بن گئے۔شیدؔا میاں نے انہیں چپکے سے سنبھال لیا۔لیکن جب وارثیوں کی صحت یابی کیلئے ان سچے موتیوں کی ضرورت پڑی تو انہیں حیاتِ وارثؒ، منہاج العشقیہ، خلاصۃ السلوک، بلوغ المرام اور توصیفِ وارثؒ کے نسخوں میں محبت کی روح کے ساتھ ملا کر اکسیر بنا کر منظرِ عام پہ لے آئے۔

ہم نے اکثر جید وارثی فقراء حضرت الحاج فقیر عزت شاہ وارثیؒ، حضرت

الحاج فقیر سید عنبر علی شاہ وارثیؒ، حکیم صابر شاہ وارثی مدظلہ العالی اور فقیر میاں احمد شاہ وارثی پنجتنی کی زبانِ گوہر افشاں سے یہ سنا ہے کہ اگر کسی نے وارثیت کو سمجھنا ہے تو وہ شیدؔا میاں کی منہاج العشقیہ کا مطالعہ ضرور کرے۔ شیدؔا میاں نے جو پھول سرکار حضور وارث عالم نوازؒ کی بارگاہِ اقدس سے چنے تھے ان کو ایک خوبصورت گلدستہ کی صورت میں اس تالیف منیف میں پیش کر دیا ہے۔

موصوف نے سرکار حضور کے ملفوظات کی تفہیم کیلئے بڑے ہی خوبصورت پیرائے میں ان کی بڑی مدلل، مبسوط، مفصل شرح قلمبند کی۔ لیکن آج کے دور کا المیہ یہ ہے کہ عربی، فارسی اور قدیم اردو سے دوری کے سبب سوائے چیدہ چیدہ احباب کے نسل نو کیلئے ان زریں اقوال اور ان کی شرح کو سمجھنا انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ برادرِ گرامی فقیر ڈاکٹر تنویر شاہ وارثی کے ایما پہ اس مفید ترین تصنیفِ لطیف کی تسہیل و تخریج اور حواشی کے ساتھ اشاعت ثانی کا اہتمام کیا گیا۔

میں نہ تو کسی قسم کے علم و فضل کا دعویدار ہوں اور نہ ہی کسی علمی و ادبی مقام و مرتبہ کا علمبردار۔ بس فقط ایک ہی دھن ہے کسی طور روحانیت و طریقت کا یہ سفر جاری رہے۔ اس راہ کے مسافروں کیلئے اصلاح اور فلاح کا سامان مہیا کیا جائے۔ جو حقیقی زادِ راہ ہے اس کی طرف سالکان کی توجہات مبذول کرائی جائیں۔ تا کہ اس راہ کے راہی فوز و فلاح کی دائمی منزل پا سکیں۔ ان تعلیمات کو سمجھنا، سمجھانا، پھیلانا اور ان پہ عمل پیرا ہونا ہی میرا مقصدِ وحید ہے۔

اس کتاب کی تسہیل و تخریج اور حواشی نویسی کے کام کو بطریق احسن پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میرے لائق صد تکریم و تعظیم عظیم درویش منش استاد جناب مولانا

عبدالسلام چشتی صاحب نے میری بھرپور رہنمائی فرمائی۔ اور قرآن و حدیث، فقہ اور سلف صالحین کی تعلیمات کی روشنی میں ان ملفوظات کی آسان اور سلیس شرح بیان فرمائی اور علم و حکمت کے خوب خوب موتی بکھیرے۔ میں حضرت موصوف کا دل کی گہرائیوں سے مشکور و ممنون ہوں کہ جناب نے اس ضعیفی اور کمزوری کے عالم میں بھی مجھے مکمل وقت دیا اور میرے وقت بے وقت تنگ کرنے پہ اپنی جبینِ نیاز پہ ذرا بھی شکن نہ آنے دی۔ اللہ انہیں جزائے خیر سے نوازے، سدا صحت و سلامتی سے رکھے، ان سے مزید استفادہ کا موقع دے اور ان کا سایہ ہمارے سروں پہ تادیر قائم رکھے۔ آمین۔

اگر وارثی احباب نے اس کتاب کے مطالعہ سے حقیقی وارثیت کی روشنی پا لی۔ تو میں سمجھوں گا کہ میری تمام تر محنت و کاوش بار آور ہوگئی۔

مولا کریم، حضور سرورِ کائناتؐ، پنجتن پاکؑ، سرکار وارث الاولیاءؒ کے شرفِ توسل و تصدق سے ہمیں اسلام، تصوف اور سلسلہ وارثیہ کی حقیقی تعلیمات پہ عمل پیرا ہونے اور ان کی روشنی میں مخلوق خدا کی اصلاح اور فلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین یارب العالمین بحق سید المرسلین ﷺ۔

خاکِ درِ حبیب ﷺ

راشد عزیز وارثی المعروف فقیر مراد شاہ وارثی

سنگھوئی، جہلم (پاکستان)

وارثا بنما جمالِ خویشتن ...... رحم کُن بر ما بحقِ پنجتنؑ

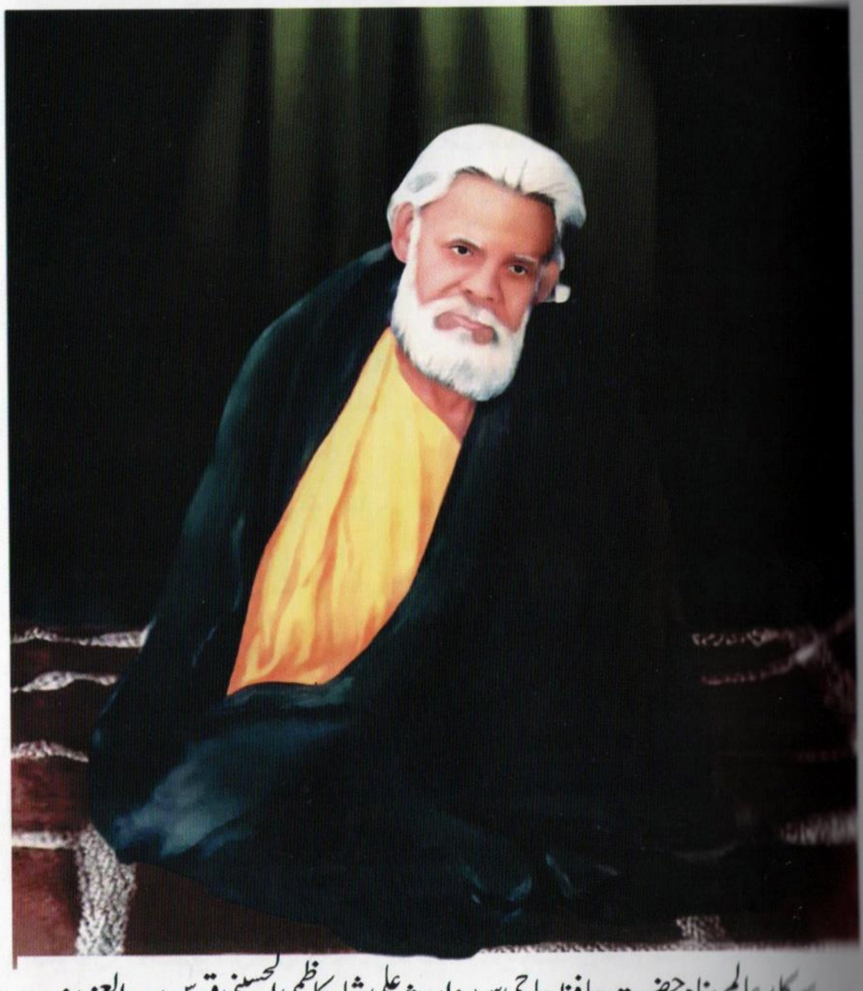

سرکار عالم پناہ حضرت حافظ حاجی سید وارث علی شاہ کاظمی الحسینی قدس سرہ العزیز

دیباچہ

عنقا شکارِ کس نہ شود دام باز چین

کانجا ہمیشہ باد بدست ست دام را

(عنقا پرندہ کسی شکاری سے شکار نہیں ہوتا۔ اے شکاری تو اپنا جال اٹھالے۔ کیونکہ اس کیلئے جال لگانے والے کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا، جال لگانا اور کوشش کرنا لاحاصل و بے سود ہے اسی طرح ذاتِ الٰہ کی محبت اور عشق کا کوئی ادراک نہیں کر سکتا لہٰذا اس بارے میں سوچ اور فکر بیکار ہے۔ عقل میں جو گھر گیا، وہ خدا کیونکر ہوا۔)

واقعی جو کام اپنے امکان سے باہر اور حیثیت استعداد سے زیادہ اور حد اختیار کے بہت آگے اور دور ہو اس کے حصول اور یافت کی کوشش کرنا اور جس تذکرہ کی گنجائش کے واسطے لفظوں کی چوحدی کا میدان تنگ اور ناکافی ہو اس کو تقریر یا تحریر کے احاطہ میں محدود کرنا شاید عالی خیال حضرات کا منصب اور لائق مصنفین اور بلند پایہ مؤلفین کا حصہ ہو۔ لیکن مجھ ناچیز کا ایسے اہم اور دشوار کام میں ہاتھ ڈالنا اور اس کے تکملہ کی جستجو کرنا نادان بچوں کے کھیل سے کم نہیں ہے۔ اور اگر یہ خیال خام جو درحقیقت خواب پریشاں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا دماغ میں سماجائے تو اس کو ایک قسم کا خبط یا مقدمۂ جنوں کہنا بے جانہ ہوگا۔

اس مختصر تمہید کا ماحصل یہ ہے کہ مجھ کو اپنی کمزور تحقیق اور ضعیف معلومات کا

پورا علم واندازہ ہے۔اور خوب جانتا ہوں کہ تالیف وتصنیف کا بار گراں میری واقفیت کے ناتواں کاندھوں کے واسطے ضرور نا قابل برداشت ہے لیکن اس کے بعد بھی ارادہ یہ کرتا ہوں کہ شہسوار میدان تجرید، تاجدار کشور تفرید، سلطان العاشقین، امام الواصلین، مرشدی وآقائی، وارثی ومولائی، قطب الاقطاب المستغنی عن جمیع الالقاب سالک مسالک لی مع اللہ حضرت حاجی حافظ سید وارث علی شاہ اعظم اللہ ذکرہٗ کے ارشادات میں ایسی چند ہدایتیں جن کو غلامان وارثی کے مذاق ومسلک سے گہرا تعلق ہو اگر فصل اور مشرح طور پر نہ ہوسکیں تو اجمال اور اختصار ہی کے ساتھ جمع کروں جو میرے فخر ومباہات کے واسطے کافی اور میری سعادت دارین کا باعث اور آئندہ نسلوں کے لئے مفید اور بکار آمد ہوں۔

اگر اس کوشش میں خدا نے مجھ کو کامیاب کیا تو یہ مجموعہ ''بیک کرشمہ دو کار'' (ایک پنتھ دو کاج) کا مصداق ہوگا کہ ظاہری صورت تو اس کی یہی ہوگی کہ جناب والا کے بعض ارشادات کا مختصر مجموعہ ہوگا۔اور دوسری نظر سے اگر دیکھا جائے گا تو حضور کے پاک حالات اور مبارک واقعات کا ایک چھوٹا حصہ بھی اس رسالہ کو کہہ سکتے ہیں۔

حالانکہ ضرورت اس کی تھی کہ جس رہنما نے غفلت میں کٹنے والی ہماری اس زندگی کو اپنی عنایت سے ہوشیار اور بے بہا زندگی بنا دیا۔اور ہم کو وہ سبق جو انسان کے شرف واعزاز کا سبب ہے از سر نو پڑھایا۔بس غلامان وارثی کا فرض منصبی نہیں بلکہ یہ فرض عین ہے کہ اپنے محسن حقیقی کے مبارک حالات مکمل طور پر جمع کرتے جس کے دیکھنے کے لئے کثیر التعداد جماعت کی آنکھیں مشتاق ہیں۔ورنہ یہ فروگذاشت یقینی ہماری خدمت اور جاں نثاری کے شفاف دامن میں بدنما دھبہ لگائے گی۔

اس وجہ سے بھی تذکرۂ وارثی کی زیادہ ضرورت ہے کہ ہزاروں غلامان وارثی وہ ہیں جن کو حضور نے سیر و سیاحت کے زمانہ میں اور مختلف مقامات پر داخل بیعت فرمایا، مگر پھر شرف زیارت حاصل کرنے کا ان کو موقع نہ ملا۔ اور متعدد حلقہ بگوش آپ کے ایسے ہیں جو دور دور سے خدمت والا میں حاضر ہوئے۔ اور تمغۂ غلامی لے کر اپنے وطن مالوف کو واپس گئے لیکن بعد مسافت کی مجبوری نے ان کو دوبارہ حاضری سے محروم رکھا۔ ایک گروہ کی یہ حالت ہے کہ وقتاً فوقتاً حاضری تو نصیب ہوئی اِلّا در دولت پر زیادہ قیام ان کا نہ ہوا۔ اور حالات حضرت سے پوری واقفیت نہیں رکھتے۔ اس لئے اگر حضور کے مفصل حالات اور مشرح واقعات لکھے جائیں تو قریب قریب جملہ غلامان بارگاہ کے واسطے وہ کتاب معلومات کا وسیلہ اور جمعیت خاطر کا باعث ہوگی۔ تذکرۂ وارثی کے مترتب ہونے کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ہمیشہ سے اسلام میں تصوف کا نقارہ بج رہا ہے۔ اور ہر عہد اور ہر قرن میں برگزیدہ اہل تصوف کے مقدس ہاتھوں سے وہ کام ہوئے جو بہادروں کی تلوار بھی نہیں کر سکتی لیکن دور وارثی میں حضرت عشق کا شاندار نشان ایسا بلند ہوا جس کے خوشنما پھریرے نے ہزاروں بنی آدم کے سر پر سایہ کر لیا اور یہ عہد وارثی دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار سمجھا جائے گا۔ لہٰذا ایسے مہتم بالشان مظہر انوار الٰہی کے پاک حالات اور مبارک واقعات جو پردۂ خفا میں مستور ہیں اگر غلامان وارثی کی سعی اور کوشش ان کو حجلۂ خلوت سے محفل جلوت میں لائے تو یہ معمولی بات نہیں، بلکہ اپنے ہم عصروں پر احسان کرنا اور آیندہ نسلوں کے واسطے خداشناسی کا قاعدہ بناتا ہے۔

تذکرۂ وارثی کا تکملہ اس خیال سے بھی اب جلد ہونا چاہئے کہ وہ غلامان

وارثی جو بلحاظ قدامت جناب والا کے حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں وہ معمر خداشناس بھی اس نیرنگ عالم فانی کی پوری سیر کر چکے۔ اب ملک جاودانی کا سفر درپیش ہے۔ کوچ کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ داعئ اجل کو لبیک کہنے کے لئے تیار ہیں۔ بقول

خیمے مسافران عدم نے نکالے ہیں
جس قافلہ میں ہم ہیں وہ سب جانے والے ہیں

عنقریب وہ زمانہ آتا ہے کہ یہ قدیم اور مغتنم صورتیں جو آج بزم عالم میں جھلملاتے ہوئے چراغ سحری کی طرح دکھائی دیتی ہیں کل بادفنا کا جھونکا جب ان کو معدوم کر دے گا اس وقت ان کا ہم عصر صحبت دیرینہ کو یاد کرے گا، اور حسرت وافسوس کے ساتھ کہے گا۔ رباعی:۔

یاران موافق ہمہ ازدست شدند — در پائے اجل یگان یگان بست شدند
بودند بیک شراب در مجلس عمر — یک دور زما بیشترک مست شدند

(موافقت کرنے والے دوست چلے گئے ہیں۔ موت کے پنجے میں ایک ایک کر کے سب گرفتار ہو گئے ہیں۔ زندگی کی مجلس میں وہ صرف ایک ہی شراب پیتے تھے۔ ہم سے ایک زمانہ پہلے وہ مست ہو گئے۔)

اس لئے جناب والا کے مبارک حالات جمع کرنے میں جہاں تک ممکن ہو عجلت کی جائے ورنہ آج جس کو مشکل کہتے ہیں کل اسی مشکل کا نام مجبوری ہوگا۔ اور جو کام آج اہم اور دشوار معلوم ہوتا ہے کل یہی ناممکن اور محال سمجھا جائے گا۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جس قدر تذکرۂ وارثی کی تکمیل نہایت تعجیل

کے ساتھ ہونا ضروری اور لازمی معلوم ہوتی ہے۔اسی قدر اس کار خیر میں تاخیر کا معمہ اور غلامان وارثی کی خاموشی بھی قابل غور ضرور ہے۔ اس لئے کہ سیکڑوں مطیعان حضرت کو تالیف اور تصنیف کی وہ مہارت ہے کہ ان کی قابلیت کی شہرت ان کی تصنیفات کے لحاظ سے دور دور ہے۔ لیکن پیشوائے حقیقی کا تذکرہ لکھنے میں قریب قریب سب کو سکوت ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ارادہ سے کوئی مجبوری ان کو روکتی ہے۔

نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس خاموشی کا سبب سوائے اس کے اور کوئی نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت وارث پاک کے حالات اور واقعات مکمل طور پر لکھنا آسان نہیں بلکہ یہ بہت اہم اور دشوار کام ہے۔ کیونکہ حالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔ لہٰذا حضور کے حالات باطنی کا تو ادراک بھی ہمارے فہم و خیال سے باہر ہے اور ان عطیات وہبی کو شرح و بسط کے ساتھ لکھنا یقینی ہماری طاقت سے بعید بلکہ ناممکن ہے۔

ہاں صفات ظاہری کا لکھنا اس وجہ سے ممکن معلوم ہوتا ہے کہ بادی النظر میں وہی عادات آپ کے بھی ہیں جو ہر فرد و بشر کے ہوا کرتے ہیں۔ فرق اس قدر ضرور ہے کہ عام مخلوقات کے عادات سے آپ کے عادات ممیّز اور ممتاز ہیں۔

مگر نہیں تھوڑا غور کرنے سے ہمارا یہ خیال و اندازہ بھی غلط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ درحقیقت حضور کے صفات ظاہری بھی ایسے ہیں جن کو قدرت ایزدی کا مجموعہ اور صنعت الٰہی کا گلدستہ کہا جائے تو زیبا ہے۔ بلکہ حضور کے عام اخلاق اور روزمرہ کا طرز معاشرت جس کو ہم انہیں آنکھوں سے دیکھتے تھے وہ بھی عجیب و غریب شان رکھتا

ہے۔ مثلاً آپ کی غیوری، خوش مزاجی، دردمندوں کی غم خواری، اہل حاجت کی دلداری، خادموں کی پرورش، غلاموں کا خیال، وضع کا لحاظ، اوقات کی پابندی، معتقدین پر عنایت، مریدین کی ہدایت، مہمانوں کی تواضع، مسافروں کی فکر، سائلوں پر مہربانی، اہل کمال کی قدردانی، کھانا نوش فرمانے کی عجیب شان، پانی پینے کی خاص صورت، بوقت خواب ہوشیاری، بیداری میں خوشنما سکوت، ایک پہلو سے ہمیشہ استراحت فرمانا، عاشقانہ مزاج، معشوقانہ انداز، باتوں میں دلفریب سادگی، وجاہت اور جامہ زیبی، مردانہ حسن، شاہانہ طبیعت، غرض یہ روزمرہ کی باتیں جن کو حضور کے اخلاق سے تعلق ہے۔ اور انسان اپنی عقل سے ان کا بخوبی اندازہ کرسکتا ہے۔ اور ان کے احساس کے واسطے نہ منطق کی بحث درکار ہے نہ فلسفہ دانی کی ضرورت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی صفات ظاہری کی ایک ایک صفت ہزار ہزار خوبیوں سے مملو ہے۔ اور آپ کی انہیں عادات کو بہ تصریح لکھنا نہایت مشکل اور دشوار ہے۔ کیونکہ جناب والا کی معمولی باتیں بھی غیر معمولی باتوں سے بہت زیادہ حیرت انگیز ہیں۔ اور اس کی پوری تصدیق وہی شخص کرسکتا ہے جو دربار وارثی میں باریاب ہوا ہے۔ اور حضور کے عادات اور طرز معاشرت کو دیکھ چکا ہے۔

لیکن میں اپنی حیثیت کے لائق اس بیان کی تائید میں جناب حضرت کے صفات ظاہری میں سے صرف ایک صفت مختصر تشریح کے ساتھ تمثیلاً نگارش کرتا ہوں۔ اور یہ بھی خوب سمجھتا ہوں کہ میری یہ تصریح ضرور کافی ہوگی۔ کیونکہ میری محدود استعداد ہرگز اس لائق نہیں کہ ایک صفت وارثی کی بھی پوری تصریح اور کما حقہ تشریح کرسکے۔ مگر اس ناتمام تشریح سے بھی ناظرین کو یہ اندازہ ضرور ہوجائے گا کہ حضور اقدس کے

صفات ظاہری بھی کس قدر جامع اور معنی خیز ہیں۔ اور آپ کی ایک ایک صفت کے واسطے کیسی طویل اور بسیط تشریح کی ضرورت ہے۔

چنانچہ حضور کی برجستہ تقریر جو روزمرہ کی بات ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ آپ کی معمولی تقریر بھی بے حد خوبیوں سے مملو ہوتی تھی۔

اگر آپ کی تقریر کو فصاحت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو باوجود اس مستقل استغراق کے برجستہ اور نہایت سلیس اور سادگی سے بھری ہوتی تھی۔

آپ کی تقریر میں اکثر مستند محاورات شامل ہوتے تھے۔ اور بعض اوقات کوئی حدیث یا آیت قرآنی تمثیلاً شریک ہوتی تھی۔

جناب والا کی تقریر عموماً مختصر مگر جامع اور خوشگوار اور معنی خیز اور متانت کے ساتھ انکسار آمیز ہوتی تھی۔

علاوہ اور خوبیوں کے آپ کی تقریر میں ایک حسن یہ تھا کہ حاضرین مختلف خیال کے ہوتے تھے مگر سب سمجھتے تھے کہ یہ ارشاد آپ کا ہماری موافقت میں ہے۔

جناب حضرت کا کلام ہمیشہ برائی اور ہجو سے مبرا تکدر اور تعصب سے پاک، سچائی اور محبت سے سراپا مملو ہوتا تھا۔

انداز تقریر کی یہ شان تھی کہ حاضرین مؤثر اور ہمہ تن گوش ہوجاتے تھے۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ آپ مجھی سے مخاطب ہیں۔

جوش محویت اور غلبۂ استغراق کے باعث اکثر سلسلۂ تقریر بدلتا رہتا تھا۔ مگر نہایت حسین اور خوشنما طریقہ سے اگر بہ سبیل تذکرہ کوئی اپنا گذشتہ واقعہ بیان کیا تو نیچی نظر کر کے اور ایسے سادہ الفاظ میں کہ خودستائی کی جس میں بو نہ ہو۔

آپ کی تقریر میں خوبصورت روانی اور بے تکلف آمد اور صفائی تھی جو فصاحت کے واسطے لازمی ہے۔ آپ کی برجستہ تقریر کا لہجہ ایسا خوش وضع اور ہر دل عزیز تھا جس سے بین طور پر شان محبوبیت کا اظہار ہوتا ہے۔

عموماً آپ سلیس اردو میں تقریر فرماتے تھے مگر اکثر اہل عرب سے عربی اور ایرانیوں سے فارسی میں اور اہل کابل سے پشتو میں بھی گفتگو کرتے تھے۔

بلحاظ بلاعت اگر دیکھا جائے تو آپ کی مختصر تقریر دقیق مسائل تصوف اور فقر اور لطائف معنوی سے مملو ہوتی تھی۔

آپ کی روزمرہ کی تقریر ایسی فیض رساں اور تصرف آمیز ہوتی تھی کہ طالب خداہدایت پاتے اور فائز المرام ہوتے تھے۔

آپ کی روزمرہ کی ایک تقریر ایک ہی وقت میں مختلف الخیال مریدین کی تسکین اور ان کے خواہشات کو پورا کرتی تھی۔ چنانچہ میرا مشاہدہ ہے کہ بیک وقت چار مسترشدین قدم بوسی کے واسطے حاضر ہوئے۔ ہنوز کچھ عرض نہیں کیا گیا تھا کہ حضور نے فرمایا ''جو شخص خدا پر بھروسہ کرتا ہے اس کی مدد خدا ضرور کرتا ہے۔ اور تم تو آج رہو گے کل چلے جانا''۔ یہ کہہ کر ان کو رخصت کر دیا۔ مگر وہ لوگ بہت خوش اور مسرور چلے۔ ان کی یہ غیر معمولی مسرت دیکھ کر خیال ہوا کہ ان سے خوشی کا باعث دریافت کرنا چاہئے۔ شب کو ان کی قیام گاہ میں گیا، اور مستفسر حال ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ ایک صاحب کا ہائی کورٹ میں مقدمہ ہے اور اس کی کامیابی کے لئے ملتجی تھے۔ ایک صاحب کو عقیدتاً کچھ خدشات تھے۔ ایک تہبند پوش تھے، ان کی یہ خواہش تھی کہ کوئی ذکر یا شغل مجھ کو تعلیم فرمایا جائے۔ اور چوتھے صاحب نکات توحید دریافت کرنا چاہتے

تھے۔ اور سب کو مسرت اس کی ہوئی تھی کہ فیضان وارثی نے ہماری خواہشات کو پورا کر دیا۔

اب اس مختصر تقریر کی قوت اور ان معمولی جملوں کے تصرفات کا اندازہ کون کر سکتا ہے کہ بظاہر تو سادہ الفاظ میں دو جملے فرمائے تھے۔ مگر نہیں معلوم کون سا لغت ان غلاموں کے پیش نظر کر دیا گیا تھا کہ اسی عبارت کے معنی اپنے اپنے خیال کے مطابق ہر شخص نے علیحدہ علیحدہ سمجھے۔ اور لطف یہ ہے کہ اپنی سمجھ پر اس قدر بھروسہ اور وثوق ہوا کہ مطمئن اور مسرور ہو گئے۔

اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ بعد کچھ عرصہ کے انہیں حضرات سے جب ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ صاحب مقدمہ کو کامیابی ہوئی۔ اور دوسرے صاحب کا خدشہ رفع ہو گیا۔ اور شاہ صاحب کو دیکھا تو اسم ذات کا ذکر جاری ہے۔ اور جن کو توحید کا سبق ملا تھا ان کا وجودی مسلک پایا۔

قربان ہدایت وارثی کی قوت وشان پر کہ معمولی الفاظ کے پردے میں یہ کرشمہ دکھایا کہ ان چاروں کے امراض گو مختلف تھے مگر اس طبیب باطنی کے ایک نسخہ نے سب کو شفاً کامل مرحمت فرمائی۔ طالب دنیا کو دنیا ملی اور طالب خدا کو خدا ملا۔ علیٰ ہذا اکثر واقعات اسی مضمون کے ہیں جن کا اعادہ بخوف طوالت نہیں کیا جاتا۔

آپ کی اسی برجستہ تقریر کا یہ روحانی اثر بھی دیکھا کہ اکثر غلاموں کے قلب خیالات وتکدرات نفسانیہ سے صاف ہو گئے۔ اور فیضان کلام سے یہ تصفیہ ایسا قوی ہوا کہ ہمیشہ قلب کو یقین اور اطمینان رہا جس کو عرف صوفیہ میں تصدیق کہتے ہیں۔ لہٰذا ایسی "پراسرار تقریر کی تصریح کون کر سکتا ہے۔ بقول حافظ شیراز علیہ الرحمۃ۔

زمرغ صبح ندانم کہ سوسن آزاد
چہ گوش کرد کہ بادہ زبان خموش آمد

(میں نہیں جانتا کہ صبح کے پرندے سے سوسن نے کیا بات سنی کہ اس کی زبان خاموش ہوگئی۔)

آپ کی برجستہ تقریر میں ایک عجیب شان یہ دیکھی کہ اگر کسی مخاطب سے متبسم لبوں کے ساتھ کچھ فرمایا۔ گو ظاہری مفہوم اس تبسم آمیز تقریر کا بھی روزمرہ کی باتوں کے مثل ہوتا تھا۔

لیکن مخاطب خودی سے بے خود اور شراب محبت سے مسرور ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ دربھنگہ میں نواب صادق علی خاں صاحب کے مکان میں قیام پذیر تھے کہ مابین عصر و مغرب ایک مدنی صاحب آئے۔ آپ نے یہ فرما کر ان کو اس وقت رخصت کر دیا کہ ''مدنی صاحب کل آپ کی خاطر ہو جائے گی۔'' دوسرے روز مریدین کا مجمع تھا، اور انوار علی خاں صاحب کے مکان سے حضور برآمد ہوئے۔ اور مدنی صاحب کو ایک ٹکڑا تہبند کا جو آسمانی رنگ اور مالیہ کا تھا متبسم لبوں سے یہ فرما کر عنایت کیا کہ ''لو یہ تمہارا حصہ ہے''۔ مدنی صاحب نے وہ ٹکڑا تو فوراً لے لیا۔ مگر دردناک آہ کی اور مضطرب ہو کر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، اور مثل ماہی بے آب تڑپنے لگے۔ اور ان کی سچی آہ کے اثر سے حاضرین کو جوش ہوا۔ لیکن حضور بار بار متبسم لبوں سے یہ فرماتے تھے ''مدنی صاحب کو یہ کیا ہو گیا؟'' آخر جب بستر پر تشریف لائے تو مدنی صاحب کو اسی حالت بے تابی میں لباس فقر یعنی تہبند مرحمت فرمایا اور ان کا عرب شاہ نام رکھا۔ اور حکم دیا کہ ''صادق علی خاں کے بنگلہ میں رہا کرو۔ اور اگر دل گھبرائے تو

مدینہ شریف چلے جانا جمعہ کے روز ہم سے ملاقات ہوا کرے گی۔"

معلوم نہیں کہ اس جملہ کے درحقیقت کیا معنی تھے کہ "لو یہ تمہارا حصہ ہے۔" جو مدنی صاحب سمجھے۔ اور اس معمولی تقریر کے پہلو میں کیسا نازک پیکان پوشیدہ تھا جس نے مدنی صاحب کو بے قرار اور سینہ کے اندر ان کے مرغ دل کو شکار کیا۔ اور اس چھوٹے سے جملہ میں کتنا بڑا فیض بھرا تھا کہ ایک آن واحد میں مدنی صاحب کو خلعت فقر نصیب ہوگیا۔ اور اس کی تصریح تو میرے امکان سے باہر ہے کہ "جمعہ کے روز ہم سے ملاقات ہوا کرے گی۔"

علاوہ مدنی صاحب کے اکثر غلامان وارثی اس وقت بھی اس تبسم آمیز تقریر کے شیفتہ اور فدائی موجود ہیں۔ اور دیکھنے والے جانتے ہیں کہ حضور کے متبسم لبوں کی دلفریب تقریر نے ان کو کیا سے کیا کر دیا۔ اگر ان کے واقعات تفصیل کے ساتھ لکھے جائیں تو طوالت ہوگی۔

آپ کی تقریر میں ایک خوبی یہ بھی دیکھی کہ حضور اپنے غلاموں سے ان کی عدم موجودگی میں خطاب فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک روز بعد مغرب آپ نے فرمایا کہ "یا باسط پڑھا کرو" اور بظاہر کوئی موجود نہ تھا۔ اتفاق سے بہت عرصہ بعد ایک حلقہ بگوش بارگاہ وارثی نے اثنائے گفتگو میں یہ بیان کیا کہ اس کے قبل میں بہت نادار ہوگیا تھا۔ ایک روز بعد مغرب حسب دستور تصور کیا تو حضور کی برزخ قائم ہوگئی۔ اور اسی حالت میں مجھ کو یہ ہدایت ہوئی کہ "یا باسط پڑھا کرو" میں نے اس کی تعمیل کی۔ اور بہت جلد میری پریشانی فراغت اور خوش حالی سے مبدل ہوگئی۔

اس خوش نصیب کی زبانی جب یہ قصہ سنا تو مجھے پہلا واقعہ یاد آ گیا اور سمجھا

کہ وہ ارشاد بے ضرورت نہ تھا بلکہ اس میں یہ راز مستور تھا۔

آپ کی تقریر کا ایک انداز یہ بھی دیکھا کہ کبھی کسی مسئلہ کی نسبت ایسے الفاظ ارشاد فرمائے جو بظاہر اس مسئلہ سے ربط نہیں رکھتے تھے مگر تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ نتیجۂ آخری اس مسئلہ کا یہی ہے۔

آپ حاجت مندوں کے باب میں اکثر صریح اور صاف الفاظ میں حکم نہیں فرماتے تھے شاید اس کا یہ سبب ہو کہ مزاج اقدس میں سادگی اور انکسار بہت تھا۔ اور نمود وشہرت سے بے حد نفرت تھی اس وجہ سے ایسے جملہ ارشاد ہوتے ہوں جن کا ظاہری مفہوم اہل حاجت کے معاملہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا لیکن بعض خدام کو کسی قدر مہارت ہوگئی تھی کہ بقدر حیثیت وہ حضور کے برجستہ کلام سے حاجت مند کی کامیابی یا عدم کامیابی کی نسبت اندازہ کر لیتے تھے۔

بارہا حضور نے آیندہ واقعات کو اشارتاً اور کبھی صاف لفظوں میں بھی ارشاد فرمایا ہے، چنانچہ ایام علالت میں ۲۹ محرم روز پنجشنبہ سہ پہر کے وقت دریافت فرمایا کہ ''کے بجے ہیں؟'' عرض کیا کہ تین بج گئے ہیں۔ اس کے بعد حضور نے چند کلمات ارشاد فرمائے جن کا ایک حصہ یہ ہے ''ابھی بہت دیر ہے، مشکی گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، بہلی آگئی ہے، چار بجے سوار ہوں گے۔''

حضور کے اس ارشاد سے جملہ حاضرین ساکت اور متحیر ہوگئے۔ اور اکثر خدام اس ارشاد کی تاویل سے غمگین اور مایوس ہوئے۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ مشکی گھوڑے سے شب تاریک مراد ہے تو شاید اس کا سلسلہ اب قریب اختتام ہے کہ ٹانگ ٹوٹ گئی اور بہلی سواری سفر کی ہے وہ آگئی، اور چار بجے کا وقت پسند فرمایا ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بارہ گھنٹہ کے بعد ٹھیک چار بج کے پندرہ منٹ پر وہ دلفریب صورت ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہوگئی۔

الغرض اس معمولی تصریح سے بھی ناظرین کو یہ ضرور معلوم ہو جائے گا کہ آپ کی روزمرہ کی باتوں میں کس قدر فیوضات اور خوبیاں ہیں۔ باوجودیکہ میری عدم قابلیت کی وجہ سے وہ نکات معنوی جن کا تعلق روحانیت سے ہے بغیر تشریح کے چھوٹ گئے بلکہ ظاہری خوبیوں کو بھی کماحقہٗ دکھا نہ سکا۔ اور نہ آپ کی تقریر کو مذکورہ بالا خوبیوں کے ساتھ محدود کر سکتا ہوں۔ کیونکہ جس قدر خوبیاں بیان ہوئیں یہ تو میرے فہم ناقص کا اندازہ ہے۔ اور جو سامعین عالی خیال اور صاحبِ ادراک ہوں گے خدا جانے انہوں نے آپ کی برجستہ تقریر کی شان و عظمت کیا سمجھی ہوگی اور کیا فیض اس سے حاصل کیا ہوگا۔

حق یہ ہے کہ حضرت وارث عالم پناہ کے ارشادات کی تشریح کرنا مجھ نا اہل کا کام نہیں ہے بلکہ آپ کے مبارک کلام کی تشریح وہ کر سکتا ہے جس کو دید اور یافت کی آنکھیں نصیب ہوئی ہوں اور محبت کا مارا ہوا دل اس کے پہلو میں ہو۔

بس اسی سبب سے اس کا خیال ہوتا ہے کہ جناب والا کے حالات کا بہ تشریح لکھنا ناممکن اور محال ہے اور یقینی اس وجہ سے ہمارے برادران طریقت ساکت اور خاموش ہیں۔ اگر یہ دقتیں نہ ہوتیں تو تذکرۂ وارثی کے مرتب ہونے میں اس قدر عرصہ نہ ہوتا۔ اور یہ خاموشی ان کی صحیح بھی ہے۔

درکارخانۂ کہ رہ علم و عقل نیست
وہم ضعیف ورائے فضولی چرا کند

(ایسے کارخانہ میں جہاں علم وعقل کو گزر یا رسائی نہیں ہے وہاں وہم اور فضول رائے کیوں کر کام کرے۔)

بعض ہمارے معزز اور عالی حوصلہ بھائیوں نے اس میں کوشش بھی کی۔ اور ان کو ایک قسم کی کامیابی بھی ہوئی کہ بقدر وسعت جناب والا کے حالات جمع کیے اور بہ صرف زر کثیر ان کو چھپوا بھی دیا۔ اور ایک طور پر وہ اپنا فرض منصبی ادا کر چکے۔ اور ان کی یہ خدمت قابل قدر ہے اور ان کا یہ ایسا احسان ہے جس کا شکریہ ادا کرنے سے ہم کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتے۔

مگر نہایت ادب کے ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ آج تک اس بیان میں جس قدر رسالے تالیف ہوئے وہ ناتمام اور ناکافی ضرور ہیں۔ اس وجہ سے کہ بڑی سے بڑی کتاب کو بھی اگر دیکھا جائے تو سرکار عالم پناہ کے حالات اور واقعات کا اس کو چھوٹا حصہ کہہ سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے ضروری باتوں کو بھی مجملاً بیان کیا ہے۔ اگر بقدر حیثیت ان کی بھی تصریح کر دیتے تو ہم کو زیادہ فائدہ پہنچتا۔ اور ہمارا خیال پختہ ہونے کا مفید ذریعہ ہوتا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مؤلفین مجبور تھے۔ اس لئے کہ واقعات کسی اور کے ہوتے تو یہ دقتیں نہ پیش آتیں۔ چونکہ حالات اس واقف اسرار الٰہی کے تھے جس کی معمولی بات بھی غیر معمولی باتوں سے زیادہ حیرت خیز ہے۔

اس سے اب یقین ہو گیا کہ حالات امام العاشقین کا بالتفصیل لکھنا دشوار ہے۔ اور اس اہم کام کے انصرام کے واسطے ایسا شخص درکار ہے جو علاوہ تبحر ظاہری کے باطنی طور پر اہل دل بھی ہو۔ مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ہم مایوس ہو جائیں

کہ غلامان وارثی کی جماعت میں ایسا شخص ملنا دشوار ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ''کل امر مر هون باوقاتها'' (ہر کام اپنے وقت پر گروی رکھا ہوا ہے۔) کا مضمون ہے جس وقت فیضان وارثی نے ہماری مجبوری پر توجہ فرمائی فوراً اس کا انتظام ہو جائے گا۔ اور ''شخصے از غیب بروں آید و کارے بکند'' (غیب سے ایک شخص ظاہر ہوگا اور یہ کام کر گزرے گا۔) کا مفہوم صادق آئے گا۔ اور انشاء اللہ تذکرۂ وارثی کو مکمل دیکھیں گے اور شکر کے ساتھ کہیں گے۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست

آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

(تمام تر تعریف اللہ کیلئے ہے۔ ہر وہ چیز جو دل چاہتا ہے آخر تقدیر کے پردہ کے پیچھے سے ظاہر ہوتی ہے۔)

لیکن میری عجلت اور جسارت کا دوسرا سبب ہے وہ یہ کہ اس تھوڑے عرصہ میں ایسا تغیر ہو گیا کہ ہدایت وارثی نے جو مذاق ہم کو سکھایا تھا ہم اس کو بھولنے لگے۔ اگر جناب والا کے حالات اور ارشادات مفصل طور پر لکھے جاتے تو یہ انقلاب کبھی نہ ہوتا۔ کیونکہ وہی کتاب ہمارے واسطے مکمل قانون کا حکم رکھتی۔ اور اب مشکل یہ ہے کہ اس کے انتظار کا بھی وقت نہیں رہا۔ خوف یہ ہے کہ ''از عراق تا تریاق'' کا مضمون نہ پیش آئے۔ کیونکہ آج کل ایسے بھی وارثی نما حضرات پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کی روش عام لوگوں کے خیالات کی صحت خراب کرنے کے واسطے مہلک وبا کا اثر رکھتی ہے۔ اور اس متعدی مرض کا یہی علاج سمجھ میں آتا ہے کہ ہدایت وارثی کا مجرب اور مستند نسخہ ہمارے پاس ہو۔ اور ہم اس پر عمل کریں۔

انہیں وجوہات سے اس ہیچمدان نے یہ جرأت کی ہے کہ ایک رسالہ مذاق و مسلک کے متعلق ایسے مستند طریقہ سے لکھا جائے جو غلامان وارثی کے خیالات کا بظاہر محافظ ہو۔ اور وہ مستند طریقہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ حضور اقدس نے وقتاً فوقتاً جو ہدایتیں فرمائی ہیں اس میں سے چند ارشادات کا خلاصہ مگر مسلسل نگارش کروں لیکن اس قید کے ساتھ وہ ہدایتیں نقل کرتا ہوں جن کو شخصی یا وقتی خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ بغیر کسی فرق و امتیاز کے جملہ غلامان وارثی کے واسطے جن کا ایک حکم ہے اور تمامی مریدین کو جن سے یکساں تعلق ہے۔ اور ہر فرد کو جن کی تعمیل ہر حالت میں لازمی ہے۔ اور وہ متواتر غلامان وارثی کے گوش گذار ہو چکی ہیں۔ یہ بھی کیا ہے کہ بعض ہدایات کی تصریح اس لحاظ سے کرنا چاہی ہے کہ مدلل اور عام فہم ہو تو ایسی حالت میں اکثر آیات قرآنیہ یا احادیث صحیحہ کا حوالہ دیا ہے۔ یا مشاہیر حضرات صوفیہ کے اقوال کتب مندرجۂ ذیل سے نقل ہیں:۔

عوارف المعارف مصنفہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمتہ، نعمت عظمیٰ: ترجمۂ طبقات الکبریٰ مصنفہ امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمتہ، فوائد الفواد مصنفہ مولانا حسن علا سنجری، مثنوی مولانا روم و شرح مثنوی مولانا روم مصنفہ مولانا بحر العلوم، صحائف السلوک مصنفہ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی، قول الجمیل مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مناقب رزاقیہ مصنفہ ملا نظام الدین فرنگی محلی، گنج الاسرار مصنفہ حضرت سلطان باہو علیہ الرحمتہ، رسالہ روح و عشق مصنفہ حضرت بوعلی شاہ قلندر، سبع سنابل، لطائف اشرفی، مرأۃ الاسرار، مثنوی بوعلی شاہ قلندر، سیر الاولیاء، تذکرہ اولیاء، تذکرۃ المصنفین، کتاب المکاتیب و الرسائل الی ارباب الکمال و الفضائل

مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، معدن المانی، وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ میری یہ معمولی واقفیت ہرگز اس لائق نہ تھی۔ مگر ''السعی منی و الا تمام من اللّٰہ تعالیٰ'' (کوشش کرنا میرا کام ہے اور کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اللہ کی طرف سے ہے۔) پر بھروسہ کر کے کوشش کرتا ہوں۔ اور اگر خدا کو منظور ہے اور اس کا فضل شامل حال ہے۔ اور یہ چھوٹا سا مجموعہ بھی اس بیان میں تیار ہو جائے تو برادران طریقت کی خدمت میں اس غرض کے ساتھ پیش کروں کہ بقول ''وہ ہی مثل ہے پھول نہیں پنکھڑی سہی''۔

ہر چند اس کا بھی پورا یقین ہے کہ غلامان وارثی کی ضرورت محسوس فرما کر آیندہ قابل مؤلفین انہیں مضامین کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ نقل فرمائیں گے۔ اور ان کی تالیف میرے اس رسالہ سے ہزار درجہ بہتر ہوگی۔ لیکن ضرورت چونکہ اس وقت ہے اس لئے گویا اس تختۂ زمین کے گوشہ میں ایک معمولی پودا نصب کرتا ہوں جہاں عنقریب ایسا پرفضا باغ لگایا جائے گا جس میں نایاب پھلوں اور خوش رنگ پھولوں کے ہزاروں شاداب درخت ہوں گے یا اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ آج اس افتادہ زمین پر داغ بیل ڈالتا ہوں جس پر کل انشاء اللہ ہمارے عالی منزلت اور بلند حوصلہ بھائی نہایت خوشنما نقشہ کی رفیع الشان عمارت بنائیں گے جس میں ان کے جوہر ذاتی کی سینکڑوں صنعتیں اور قابلیت کے ہزاروں نقش ونگار ہوں گے۔

میری اس عجلت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اگر یہ رسالہ جلد تیار ہو جائے تو اس کی صحت اور عدم صحت کا تصفیہ بھی واضح طور پر ہو جائے گا۔ کیونکہ ماشاءاللہ ابھی ہمارے وہ بزرگ اور ممتاز بھائی اس عالم فانی کی سیر میں مصروف ہیں جن کو بارگاہ

وارثی میں باریابی کا شرف اور خدمت دیرینہ کا افتخار حاصل ہے انہوں نے اگر پسند فرمایا تو یہ معتبر سمجھا جائے گا۔ اور یہی اس کے واسطے کافی سند ہوگی۔

اب یہ نیاز مند بہزار عجز وادب اپنے محترم بھائیوں کی خدمت عالی میں ملتمس ہے کہ اس رسالہ میں آپ کے پیشوائے برحق کے چند مشہور ارشادات نقل کرنے میں یہ جسارت بھی کی ہے کہ بعض ہدایات کی تشریح کرنا چاہی ہے جو میری نادانی کی صریح دلیل ہے۔ کیونکہ اس کا اعتراف ہے کہ میری عدم قابلیت ہرگز اس کی متقاضی نہیں کہ ایک ارشاد وارثی کی بھی شرح کرے۔ لہٰذا مستدعی ہوں کہ ناظرین مجھ نااہل کی بے ربط تحریر پر لحاظ فرمائیں۔ بلکہ نقطۂ نظر ہدایات وارثی مفہوم ظاہری اور نکات معنوی پر رہے۔ بقول حکیم سقراط کہ ''غوطہ خور کے بے حیثیت ہونے سے موتی کی آب و تاب اور قدر و قیمت میں فرق نہیں آتا''۔ اور یہ بھی گذارش ہے کہ جہاں غلطی ہو اس کی تصحیح کریں، اور بارگاہ وارثی کے اس ادنیٰ غلام کو اپنا ممنون کرم اور مشکور احسان فرمائیں۔

الملتمس آپ کا خادم

محمد ابراہیم شیدا وارثی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرت احدیت جل جلالہ نے اپنی عین رحمت سے ہم کو عبدیت کی تعلیم اور شکرگذاری کی ہدایت میں ایک طریقہ ادائے شکر کا بتایا ہے کہ ''وامـابـنعمة ربک فحدث'' (اوراپنے رب کی نعمتوں کا خوب تذکرہ کریں۔ سورۃ والضحیٰ:۱۱) لہٰذا ہم اپنے خدائے عزوجل کے بے شمار انعامات بلکہ لاتعداد غیر محصور احسانات میں سے ایک ایسے احسان کو شکر کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو ہماری اس حیات فانی کے واسطے باعث افتخار واعزاز اور عالم جاودانی کے لئے خاص سرمایۂ ناز ہوا۔ وہ یہ کہ خالق حقیقی کی بندہ پروری ہے کہ ہم کو دور وارثی میں پیدا کیا۔ اور ہماری یہی آنکھیں اس مظہر انوارالٰہی کی زیارت جمال جہاں آرا سے مستفیض ہوئیں جس کی شان محبوبیت کو دیکھ کر بے ساختہ زباں سے نکلتا ہے۔

تو بدیں جمال وخوبی سرطور اگر خرامی
ارنی بگوید آں کس کہ بگفت لن ترانی

(اگر تو اسی حسن وخوبی سے طور پر جلوہ فرما ہوتو وہی شخص ارنی کہے گا جسے لن ترانی کہا گیا۔)

اوردل سے، زبان سے، قلم سے خداوند عالم کا شکرادا کرتے ہیں کہ اس کے فیضان رحمت نے صرف ہماری آنکھوں ہی کو نہیں مشرف فرمایا۔ بلکہ ایسے وارث عالم کے سپرد کیا جو اس قرن میں ''یداللہ فوق ایدیھم'' (ان کے ہاتھوں پر (آپ کے ہاتھ کی صورت میں) اللہ کا ہاتھ ہے۔ سورۃ الفتح:۱۰) کا مصداق ہوا۔ اور اس کے

دست کرم نے ہمارے کمزور ہاتھوں کو پکڑا۔ اور اس رازِ مکنون سے خبردار کیا جو ہماری اسی ہیکل جسمانی میں مستور ہے اور آیہ وافی ہدایہ ''و فی انفسکم افلا تبصرون'' (اور خود تمہارے نفوس میں بھی ہیں، سو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ سورۃ الذاریات:۲۱) جس کی دلیل ہے اور عشق احدیت جل جلالہ کا دشوار سبق جو ہر مذہب وملت کی جان بلکہ عین ایمان ہے اور جس کا سمجھنا ہمارے ناقص فہم وادراک کو محال تھا، آسان لفظوں میں اپنی کمال شفقت سے پڑھایا۔ اور اس دشوار گذار راہ میں پوری دستگیری فرما کر اپنی قوت کاملہ سے اکثر غلاموں کو منزل مقصود تک پہنچایا اور جوار شاہد حقیقی کا تماشا دکھایا۔

لہٰذا اس پیشوائے کامل کے باطنی عطیات اور روحانی فیوضات کا اندازہ کرنا تو محالات سے ہے حتیٰ کہ ظاہری ریاضت ومجاہدات کے بارے میں جو ہدایتیں فرمائی ہیں ان کو بھی حصارِ تحریر میں محدود کرنا اس وجہ سے ناممکن ہے کہ یہ ہشتاد سالہ دور وارثی جس کی رفعت وشان کا چار دانگ عالم میں نقارہ بجا، اور لاتعداد مخلوق الٰہی شرف بیعت سے مشرف ہوئی۔ اور اس رہبر صادق نے اپنے ہر ایک حلقہ بگوش کو اس کے ظرف و استعداد کے مطابق ضرور ہدایت فرمائی۔ پس ہماری یہ محدود واقفیت ان تمامی ہدایات کی تفصیل وتصریح میں کیونکر نہ عاجز ہو۔

بظاہر یہ ممکنات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ارشادات وارثی نقل ہو سکتے ہیں جن کو بگوش خود یا ہمارے معزز بھائیوں نے سنا ہے۔ اور جو صفحہ خیال کماحقہٗ محفوظ ہیں لیکن نظر غائر سے دیکھا جائے تو یہ بھی آسان نہیں۔ چنانچہ عہد وارثی کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا جس کو میں نے اپنی اس قلیل مدت کی حاضری میں دیکھا ہے کہ مختلف طبقات

کے لاتعداد نفوس حلقہ غلامی میں داخل ہوئے۔ اور ہر شخص کو اس کی اہلیت اور حیثیت کے لحاظ سے حضور نے ہدایت فرمائی۔ لہٰذا جو جو ہدایتیں مریدین کو میرے سامنے تعلیم فرمائی ہیں خیال کرتا ہوں کہ انہیں ارشادات کا مجتمع کرنا معمولی کام نہیں۔

قطع نظر اس کے اگر کوشش بھی کی جائے اور بقدر اپنے علم و حافظہ کے ہدایات وارثی نقل میں ہوں تو وہ مجموعہ برادرانِ طریقت کے واسطے زیادہ مفید نہ ہوگا کیونکہ ہر طالب کی حالت جداگانہ ہوتی ہے۔ اور جس طرح ہر مرض کیلئے ایک دوا مقرر ہے اسی طرح طالبین کی طلب کے فرق و امتیاز کے لحاظ سے ان کی تعلیم بھی ان کے مناسب حال ہوتی ہے پس ہمارے طبیب باطنی نے اپنے ہر ایک دست گرفتہ کا علاج اس کے مرض و مزاج کی مناسبت سے کیا ہے' اور جو نسخہ اس کے لئے مفید متصور ہوا وہی اس کو مرحمت فرمایا ہے۔ اس لئے ایک مریض کا نسخہ دوسرے بیمار کے مناسب حال کیونکر ہوسکتا ہے۔

مثلاً ایک مرتبہ میلہ کاتک میں منشی امیر جان صاحب منصف و رئیس سہسرام نے مجھ سے کہا کہ میری تمنا ہے کہ جناب حضرت کوئی وظیفہ مجھ کو تعلیم فرمائیں۔ میں ان کو جناب حضرت کے حضور میں لایا۔ اور بعجز و ادب ان کی خواہش کا اظہار کیا۔ حضور نے مسکرا کے ایک اسم حضرت باری ان کو تعلیم فرمایا۔ اس وقت منصف صاحب کے ہمراہ ان کے بھائی اور بھتیجے اور صاحبزادے بھی تھے۔ انہوں نے یہ بندہ پروری دیکھی تو یکے بعد دیگر یہی درخواست کی۔ میں نے دیکھا کہ حضور نے ہر مرتبہ قدرے سکوت فرما کر سب کو مختلف اسمائے الٰہی کی ہدایت فرمائی۔ اور ہر مرتبہ جو آپ نے غور فرمایا تو اس سے صاف یہ محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح طبیب نبض دیکھتا اور بیمار کے مرض کی

تشخیص کرتا ہے اسی طرح حضور بھی ہر ایک کے درد دل کو دریافت فرماتے ہیں۔ اور یہی ہوا کہ جس کا جیسا درد تھا ویسی دوا اس کے لئے تفویض ہوئی۔

بلکہ یہ بھی دیکھا ہے کہ حضور نے ایک وقت میں دو طالبوں کو ایک ہی ذکر تعلیم فرمایا۔ مگر قاعدہ مختلف تجویز ہوا۔ چنانچہ جناب حضرت سے فقیر شاہ شاکر صاحب نے ایک مرتبہ یہ تمنا ظاہر کی کہ کوئی ذکر مجھ کو تعلیم فرمایا جائے۔ پیشوائے برحق نے ذکر اسم ذات جلالی قاعدہ سے ان کو تعلیم فرمایا۔ اور اسی جلسہ میں احمد علی شاہ صاحب متوطن شیخ پورہ نے بھی یہی درخواست کی۔ اور اتفاق سے ان کو بھی ذکر اسم ذات کی ہدایت ہوئی۔ مگر دوسرے قاعدہ سے اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ طالبین کی حالت اور واردات میں تفرقہ تھا لہٰذا ان کی تعلیم بھی اسی رعایت سے فرمائی گئی۔

بدیں خیال وہ ہدایتیں جن کی نسبت یہ علم بھی ہے کہ مختلف مریدین کے حق میں ارشاد فرمائی ہیں، ان کا ذکر اس رسالہ میں نہ کروں گا بلکہ وہ طریقہ اختیار کرتا ہوں جو باوجود اختصار کے انشاء اللہ زیادہ مفید ہو گا یعنی ایسے چند ارشادات نگارش کرتا ہوں جن کو حضور نے عام طور سے متواتر فرمایا ہو اور جن کا عقائد اور اعمال، مذاق و مسلک سے گہرا تعلق ہو، اور جن کا تخاطب جمیع غلامان بارگاہ وارثی کے شامل حال ہوا۔ اور جن کو قریب قریب جملہ مسترشدین نے بگوش خود سنا ہے۔ اور جن کی تعمیل سے سرکار عالم پناہ کا کوئی حلقہ بگوش مستثنیٰ نہیں ہے اور جن کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں کیسے دقیق اور بڑے بڑے مسائل کا سبق دیا ہے۔ اور اس کا بھی اندازہ بخوبی ہو جائے کہ غلامان وارثی کا مذاق کیا ہے اور کیا کیا پابندیاں ان کے واسطے لازمی ہیں۔

لہٰذا پہلے بیعت کا ذکر کرتا ہوں جس میں مریدین کی مساوی حیثیت ہے اور خاص و عام کا فرق و امتیاز قطعی نہیں ہے۔ کیونکہ اقرار اطاعت جمیع غلامان وارثی نے ایک طور پر کیا ہے لیکن حلقہ غلامی میں داخل کرنے کے وقت حضور نے کیا ارشاد فرمایا، وہ البتہ قابل غور ہے۔

یہ مسلمہ ہے کہ جناب والا کا جوش عشق اور غلبۂ استغراق کبھی اس کا متقاضی نہ تھا کہ آپ ہم دنیاداروں کی جانب متوجہ بھی ہوتے۔ علاوہ اس کے مزاج ہمایوں کا یہ انداز تھا کہ کوئی معاملہ کیسا ہی اہم کیوں نہ ہو مگر اس میں طوالت ناپسند تھی۔ شاید انہیں وجوہات سے بیعت لینے کے وقت جو قواعد مروج ہیں ان میں حضور نے اختصار فرمایا۔

اس اختصار کو یا تو جناب والا کا اجتہاد کہنا چاہئے۔ کیونکہ اکثر مقتدر حضرات صوفیہ کرام نے بعض مسائل طریقت میں اپنے اجتہاد کو دخل دیا ہے جیسے مخدومان حضرات چشت نے جملہ خانوادگان کے برعکس مقامات سلوک میں نہایت اختصار فرمایا ہے۔

یا حضور نے اس وجہ سے قواعد بیعت میں اختصار پسند فرمایا کہ اصولاً بیعت کے واسطے جو شرائط لازمی ہیں انہیں کو اختیار کیا، اور فروعات کی ضرورت نہ سمجھی۔ کیونکہ حضرات صوفیہ کرام نے بیعت لینے کے وقت ایک صورت نہیں اختیار فرمائی ہے۔ بیعت کے قواعد مروجہ میں بہت اختلاف ہے۔ مثلاً بعض خانوادوں میں بیعت کے وقت خطبہ کے ساتھ جو دعائیں پڑھتے ہیں تو دوسرے خانوادہ میں دیگر ادعیہ قواعد بیعت میں مروج ہیں۔ بعض بیعت کے وقت شجرۂ بزرگان طریقت بھی پڑھتے ہیں، بعض نے موتراشی کو بھی لازمی گردانا ہے، کسی خاندان میں کلاہ و خرقہ پوشی بھی ضرور

ہے۔کسی سلسلہ میں جام نوشی بھی بیعت کی ایک شرط خاص ہے۔مگر تمامی پیشوایان طریقت نے اصول بیعت اسی کو مانا ہے اوراسی کی پابندی فرمائی ہے کہ توحید حضرت احدیت کی تصدیق اور اطاعت مرشد کا اقرار ہو۔اس سے معلوم ہوا کہ اقرار اطاعت اور تصدیق وحدانیت کے بعد جس قدر قواعد بیعت کے وقت مروج ہیں وہ سب فروعات میں داخل ہیں،اوران کو مشائخین عظام نے بھی ضروری نہیں سمجھا ورنہ یکساں مطابقت کرتے۔کیونکہ رواسم مروجہ اصول بیعت نہیں ہیں۔بلکہ عہد رسالت سے چند صدیوں کے بعد یہ قواعد بیعت رائج ہوئے ہیں۔چنانچہ صاحب کتاب معدن المعانی نے حضرت مخدوم سید شرف الدین یحییٰ علیہ الرحمۃ کا یہ ارشاد صفحہ ۱۶۴ میں نقل فرمایا ہے ”درعہد رسول علیہ السلام حلق وقصر و بیعت بدیں ہیئت نبود۔خواجہ جنید از خود ابداع کردہ است۔“(رسول اللہ ﷺ کے دور میں حلق،قصر اور بیعت کا طریقہ اس صورت میں رائج نہ تھا بلکہ اسے خواجہ جنید بغدادیؒ نے ایجاد کیا۔)شاید اسی وجہ سے آپ کی اختصار پسند طبیعت نے یہ منظور فرمایا کہ قواعد بیعت کا خلاصہ مگر مطابق اصول بیعت مرید سے یہی اقرار لینا کافی ہے کہ ”ہاتھ پکڑتا ہوں پیر کا پنجتن پاکؑ کا خدا رسولؐ کا“اور باقی فروعات کو چھوڑ دیا۔

لیکن بیعت کی دوسری شرط یعنی اطاعت مرشد پہ کسی قدر تصریح طلب ہے کہ اطاعت پیر سے صرف ہاتھ پکڑنا ہی نہیں مراد ہے بلکہ مرید کو لازم ہے کہ ظاہری احکام پیر کی اتباع کا بھی تہیہ مستقل ہو۔اور باطنی اطاعت یعنی رجوع بیعت کے وقت محبت پیر بھی ہو جس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بیعت کے واسطے شرط لازمی محبت پیر ہے کیونکہ جس قدر عقائد مرید کے لئے منضبط ہیں یہ سب محبت پیر پر محول ہیں۔مثلاً

پیر کو موجودہ تمام عالم سے بزرگ و برتر سمجھنا جو عقیدتاً لازمی ہے۔ یہ بغیر محبت کے ممکن نہیں کیونکہ محبت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ محبّ اپنے محبوب کو تمام عالم سے بہتر سمجھتا ہے۔ یا جس چیز کو پیر سے نسبت ہو اس کا نقصان بیان کرنا قطعی ممنوع ہے تو مرید کا یہ خیال بھی بغیر محبت کے قائم نہیں ہوسکتا۔ یا تصور پیر جو مرید کے واسطے بہت ضروری ہے لہٰذا یہ بھی مقتضائے محبت ہے۔

چنانچہ امام شعرانی طبقاۃ الکبریٰ میں لکھتے ہیں کہ شیخ عدی بن مسافر علیہ الرحمتہ کا (جن کا ۵۵۸ ہجری میں انتقال ہوا۔ اور ملک شام کے قصبہ بالس میں مزار ہے) قول ہے کہ ''تم اپنے پیر سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے مگر اس صورت میں کہ محبت ہو اور تمہارا اعتقاد اس کی نسبت ہر اعتقاد سے بڑھا ہوا ہو۔'' اور صاحب فوئدالفواد نے لکھا ہے کہ ''ارادت و بیعت عبارتیست از عشق و محبت پیر'' (ارادت و بیعت عشق و محبتِ پیر سے عبارت ہے۔) جس کا خلاصہ یہی ہوتا ہے کہ مرید کا محبت کے ساتھ رجوع ہونا اصل بیعت ہے۔ علیٰ ہذا ہمارے وارث عالم پناہ نے بھی اس اعلان میں ایسا ہی فرمایا ہے جو ضبط تحریر میں آیا اور جس کا ذکر کسی جگہ آئے گا کہ ''چمار ہو یا خاکروب جو ہم سے محبت کرے وہ ہمارا ہے۔'' شاید اسی وجہ سے حضرت نے قواعد مروجہ کی تقلید ضروری نہیں سمجھی۔ اور جب صاحب ارادت نے محبت سے رجوع کیا تو اس کی محبت ہی اس کی بیعت کے واسطے کافی متصور ہوئی۔ گو بظاہر سنت حضرات صوفیہ کو بھی نہیں چھوڑا کہ مرید کا ہاتھ بھی پکڑا اور خلاصہ طور پر مشروط بیعت کا بھی اقرار لیا۔ بلکہ اکثر حضور نے بیعت لینے کے وقت عبارت مذکورۂ بالا کے پہلے انابت واستغفار کا بھی بایں الفاظ اقرار لیا ہے کہ استغفروا اللّٰہ ربی من کل ذنب و اتوب

الیہ۔ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب۔(میں اپنے رب کریم سے گناہوں اور خطاؤں کی معافی چاہتا ہوں۔ زبان سے اس کا اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرتا ہوں۔)

اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ اس مختصر عبارت میں اور اختصار فرمایا ہے یا کبھی یہ ہوا کہ اہل ارادت کے صرف رجوع پر یہ فرمایا کہ تم مرید ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یہی راز مستتر تھا کہ جیسی محبت ارادت مند کی ہوئی اسی قدر اس کی بیعت میں اہتمام ہوا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ بیعت کے لئے صرف ہاتھ پکڑنا کافی نہیں ہے بلکہ شرط اولیٰ محبت پیر ہے۔

اکثر حضور نے اہل ارادت کی غائبانہ بھی بیعت لی ہے۔ چنانچہ متعدد حلقہ بگوش ایسے ہیں کہ جو بذریعہ خط کے خواستگار بیعت ہوئے اور آپ نے ان کی یہ استدعا قبول فرمائی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کے فقیر حاجی اوگھٹ شاہ صاحب نے کسی طالب صادق کا منظوم عریضہ پیش کیا جس میں غائبانہ بیعت کا وہ مستدعی تھا۔ آپ نے فرمایا کہ لکھ دو ''اگر محبت ہے تو مرید ہیں۔'' اور بعض مریدین نے عالم خواب میں بیعت کی اور اس واقعہ کو جب عرض کیا تو جناب والا نے اس بیعت کو قائم رکھا۔ یہ جملہ صورتیں اسی کی دلیل ہیں کہ بیعت کے واسطے خلوص اور محبت کافی ہے۔

حضور کے تصرفات باطنی اور فیوضات روحانی کی یہ شان بھی دیکھی ہے کہ آپ نے اکثر گذشتگان ماسبق کی ارادت ان کے ورثاء کی استدعا پر قبول فرمائی۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا مدار شاہ صاحب متوطن مضاضات گیا نے یہ گذارش کی کہ میری قرابت میں ایک بی بی ہیں جو بسبب اُجدِ مسافت حاضری ہے قاصر ہیں مگر بیعت کی

متمنی ہیں۔ آپ نے فرمایا ''ہم نے ان کو مرید کرلیا۔'' شاہ صاحب نے یہ عنایت دیکھی تو ملتجی ہوئے کہ میرے لڑکوں کو بھی مرید کرلیا جائے۔ ارشاد ہوا کہ ''وہ بھی مرید ہیں۔'' جب دریائے فیض ورحمت کا یہ جوش دیکھا تو شاہ صاحب نے دست بستہ گزارش کی کہ میرے بزرگان ماسبق کو بھی داخل بیعت فرمائیے۔ آپ نے تبسم کے ساتھ فرمایا ''اچھا سب کو مرید کرلیا۔''

علیٰ ہذا ایک مرتبہ قاضی منیر عالم صاحب مختار دربھنگہ نے عرض کیا کہ مجھ کو تو شرف غلامی نصیب ہوا، مگر میرے آباؤ اجداد اس نعمت سے محروم ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ''ان کو بھی مثل اپنے ہمارا مرید سمجھو۔'' قاضی صاحب نے یہ شفقت وارثی دیکھی تو مستدعی ہوئے کہ میرے خاندان میں آئندہ پیدا ہوں وہ بھی میری طرح حضور کے غلاموں میں محشور ہوں۔ ارشاد ہوا کہ ''منیر عالم محبت سے سب ہوسکتا ہے۔ اچھا ان کو بھی مرید کرلیا۔''

یہ طریقہ بیعت گو بظاہر عجیب بلکہ بعید العقل معلوم ہوتا ہے، مگر نہیں۔ یہ محبت کی زبردست نسبت کا ثمرہ ہے۔ وہ باتیں جن کے سمجھنے میں ہمارا ادراک قاصر ہے وہ بجہت محبت سب ہوسکتی ہیں۔ بلکہ اکثر صاحبان قوت بزرگان طریقت نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ چنانچہ صاحب ''سبع سنابل'' نے لکھا ہے کہ سید فتن نے حضرت مخدوم شیخ صفی قدس سرہ کی خدمت میں عرض کیا کہ خدا نے مجھ کو فرزند نرینہ عطا کیا ہے لہٰذا آپ اس کو کلاہ و شجرہ مرحمت فرمائیں۔ حضرت مخدوم نے کشف باطنی سے معلوم فرمایا کہ سید فتن کے آئندہ پانچ لڑکے ہوں گے۔ اور اس وقت تک نہ رہوں گا۔ ''پس پنج کلاہ و پنج شجرہ حاضر کرد۔ وفرمودہ کہ ہر پنج پسران شمارا مرید کردیم۔ بعد از مدتے حضرت

مخدوم فوت شد۔ ودرخانۂ سید فتن پنج پسر متولد شدند۔ ازیں معلوم شد کہ پیش تولد مردم نیز انابت وارادت درست است۔'' (پس پانچ ٹوپیاں اور پانچ شجرے حاضر کئے گئے اور فرمایا کہ تمہارے پانچوں بچوں کو ہم نے مرید کرلیا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت وصال فرما گئے۔ سید فتن کے ہاں پانچ بچے پیدا ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی غیر موجودگی میں بھی بیعت اور انابت وارادت درست ہے۔)

اور صاحب سبع سنابل نے سنبلہ دویم میں لکھا ہے کہ حضرت مخدوم شہ مینا قدس سرہ نے ایک شخص کو اس کے مرجانے کے بعد کلاہ وشجرہ (اس سلسلہ میں کلاہ پوشی بھی شرائط میں داخل ہے) مرحمت فرمایا۔

اور صاحب تذکرہ المتقین نے حضرت بدیع الدین قطب مدار علیہ الرحمتہ کے سفر جونپور کے قصہ میں لکھا ہے ''شہاب الدین درہنگامہ سفر عرض کرد کہ درافادہ بیعت خلق اللہ چہ حکم می شود، فرمودند ہر کہ بحضور بالشرف ارادت مشرفت گشت او را تا ہفت پشت قبول کردیم۔ وہر کہ بہ غیبت ما با میدارادت دست صادق ما خواہند بوسید و براں نیز تاہفتم اولاد برگزیدیم''۔ (دورانِ سفر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے عرض کیا کہ مخلوق کی بیعت کا کیا فائدہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ جو کوئی بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہو جاتا ہے اس کی سات پشتیں قبول ہو جاتی ہیں۔ اور جو کوئی غیر موجودگی میں بھی ارادت کی امید سے ہمارے دستِ حق پرست کو بوسہ دے گا تو اس کی بھی سات پشتیں برگزیدہ ہوگئیں۔)

لہٰذا حضرت مخدوم شیخ صفی علیہ الرحمتہ کا پسران سید فتن کو قبل ولادت کے مرید کرنا۔ اور حضرت مخدوم شاہ مینا قدس سرہ کا ایک موتی[1] کو مرید کرنا۔ اور حضرت

قطب المدار کا اپنے مرید کی ہفت پشت قبل و ہفت پشت آیندہ کی ارادت کو قبول فرمانا اس کی کافی دلیل ہے کہ غائبانہ بیعت بھی جائز ہے۔ اور ہادیان راہ طریقت کے تصرفات باطنی سے غیر موجود ارادتمند بھی مستفیض ہوئے ہیں جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مرید کی عقیدت ومحبت اور پیر کے فیض وتصرف کو قلب اور باطن سے سروکار ہے جو عین کرشمہ روح ہے۔ اور روحانی تعلقات اس عالم مثال میں اسی نسبت سے ہوتے ہیں جو عالم ارواح میں قائم ہو چکے ہیں حالانکہ مرید کی ارادت ومحبت اور پیر کی عنایت وشفقت بظاہر اس عالم ناسوت کے ارتباط واتحاد کا سبب معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ اتحاد عالم ارواح میں قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ ''**الا رواح جنود مجندة فما تعارف منها ایتلف وما تنا کر منها اختلف**۔'' (روحیں ایک آراستہ کیا ہوا لشکر ہے۔ پس جن روحوں نے اس وقت ایک دوسرے سے جان پہچان حاصل کر لی۔ ان میں یہاں التفات ہوا۔ اور جنہوں نے ایک دوسرے سے نفرت کی انہوں نے دنیا میں بھی اختلاف کیا۔)

لہٰذا مقبولان بارگاہ ایزدی کے فیض وتصرف سے عالم ارواح میں جو روحیں مستفیض ہوتی ہیں ان کی ارادت بدستور قائم رہتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ہادیان برحق ہمیشہ ان کے نگران اور معین الحال رہتے ہیں۔ اور جب عالم تمثال میں تشریف لاتے ہیں، تو ان کو اپنی بیعت میں داخل فرماتے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ کبھی بقید اجسام اور کبھی غائبانہ محض روحانیت سے ان کی ارادت اس عالم میں قبول کرتے ہیں۔ اور جس طرح شخص موجود کو اپنے تصرف سے فیض یاب کرتے ہیں اسی طرح شخص غیر موجود یا گزشتہ یا آیندہ نسلوں کو بھی اپنے فیض سے مستفیض فرماتے ہیں۔ لیکن یہ انہیں ذی

اقتدار اور صاحب اختیار حضرات کا منصب ہے جو عنایات وہبی سے سرفراز ہوتے ہیں۔ چنانچہ شیخ عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمۃ طبقات الکبریٰ میں لکھتے ہیں کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری فرماتے تھے کہ ''میں اپنے مریدوں کو روز الست بربکم سے پہچانتا ہوں۔ اور اسی راز سے میں اپنے مریدوں کی تربیت کرتا رہا ہوں اور وہ صلبوں میں تھے مگر مجھ سے پوشیدہ نہ تھے''۔ اور اسی کو حضرت شیخ اکبر محی الدین عربی علیہ الرحمۃ نے فتوحات میں نقل کیا ہے۔

علیٰ ہذا حضور کے بھی بعض ارشادات کا یہی مفہوم ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایام میلہ کاتک میں چند معتقدین بہ یک وقت خدمت والا میں حاضر ہوکر حصول شرف بیعت کے مستدعی ہوئے۔ جناب حضرت نے تین یا چار شخصوں کی حسب دستور دست گیری کی، اور اقرار اطاعت لے کر داخل بیعت فرمایا۔ لیکن اس کے بعد ایک طالب کا جب ہاتھ پکڑا تو فوراً چھوڑ دیا، اور مسکرا کر فرمایا ''اب بیعت کی کیا ضرورت ہے تم تو ازلی مرید ہو'' اور باقی طالبین کو پھر حسبِ دستور مرید کیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب حضور بانکی پور تشریف لے گئے۔ اور وہاں کے معزز حضرات حلقہ بگوش ہوئے۔ اسی وقت سے مولوی محمد احسن صاحب جو معمر اور نہایت مقتدر شخص تھے بکمال خلوص و بشوق ارادت ہمیشہ خدمت والا میں حاضر ہوتے رہے۔ مگر جناب حضرت نے ان کو مرید نہیں فرمایا۔ آخر مولوی عبدالکریم صاحب نے سفارش کی تو ارشاد ہوا کہ ''ان کو بیعت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو روز ازل سے ہمارے مرید ہیں۔ اور اگر یہی خوشی ہے تو ہاتھ پکڑ لو۔''

الغرض اس سے معلوم ہوگیا کہ اصل بیعت محبتِ پیر ہے اور یہ محبت قدیم

یعنی ازلی ہوتی ہے۔ اور علاوہ اس کے جس قدر قواعد بیعت مروج ہیں وہ مفید ضرور ہیں۔ مگر لازمی نہیں ہیں۔ اگر ان کو بھی پابندی کی جائے تو اچھا ہے ورنہ ان کے ترک سے بیعت میں نقصان نہیں آتا۔

اگر یہ خیال ہو کہ اطاعت مرشد اور توحید حضرت رب العزت کی تصدیق کے بعد اطاعت پنجتن پاک کا اقرار کیوں لازمی گردانا۔ اس کی نسبت پہلے یہ عرض کروں گا کہ یہ مسئلہ بہت نازک ہے اور اس کی تصریح لائق سفینہ نہیں ہے۔ ایسے ہی مسائل کے اظہار کے لئے حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے ؎

احوال شیخ وقاضی و شراب الیہود شان
کردم سوال صبح دم ز پیرے فروش
گفتا نہ گفتنیت سخن گرچہ محرمی
درکش زبان و پردہ نگہدار و مے بنوش

(شیخ اور قاضی کی شراب نوشی کے متعلق پیر مغاں سے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ ناقابل بیان بات ہے۔ اگرچہ تو محرم راز ہے۔ پس اپنی زبان بند رکھ اور پردہ کو مدنظر رکھ اور چھپ کر پی لے۔)

اسی قدر سمجھنا کافی ہوگا کہ حضور کا سلسلۂ نسب بکمال صحت حضراتِ پنجتن پاکؑ سے ملتا ہے۔ چنانچہ اکثر آپ نے فرمایا ہے کہ "ہمارے بزرگ سادات نیشا پوری تھے۔ اور ہماری غیر خاندان سے مناکحت نہیں ہوئی۔"

علاوہ اس کے آپ کو حضرات پنجتن پاکؑ سے خاص نسبت تھی۔ اور اسی قومی نسبت کا یہ اثر تھا کہ آپ نے بیعت لینے کے وقت گو دیگر پیران طریقت کا ذکر نہیں کیا

لیکن بکمال اہتمام مریدین سے اطاعت پنجتن پاکؑ کا اقرار ضرور لیا۔ جو حضور کی عین بندہ پروری کی بھی دلیل ہے کہ ہم غلاموں کو اپنے اجداد طاہرین کے سپرد فرمایا جہاں ہمارے وہم وخیال کی بھی رسائی ناممکن اور محال تھی۔ چنانچہ اپنی نسبت کو جناب والا نے بارہا بلکہ متواتر یوں فرمایا ہے کہ ''جب ہم جنت البقیع میں گئے اور حضرت خاتون جنتؑ کا مزار دیکھا تو اس طرح قبر سے لپٹ گئے جیسے کوئی اپنی ماں سے لپٹ جاتا ہے۔ اور مزدر بھی دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ خون کا جوش ہے۔''

یا اس کا سبب یہ تھا کہ حضور نے اکثر فرمایا ہے کہ ''ہمارا مشرب عشق ہے۔ اور سلسلۂ عشق حضرات پنجتن پاکؑ پر ختم ہوتا ہے۔ بقول مولانا عشق امیر المومنین حیدر بود۔ تو حضور کا کرم تھا کہ اپنے ہر ایک حلقہ بگوش سے ان برگزیدۂ خدا کی اطاعت کا اقرار لیا جو سرچشمۂ عشق حقیقی ہیں۔

ہر چند کہ جملہ حضرات صوفیہ کرام کا مشرب عشق سے ماخوذ ہے۔ ارباب طریقت کا یہ کلیہ ہے کہ بغیر عشق صادق عرفان الٰہی اور اسرار احدیت سے آگاہی محال ہے۔ مگر حضور نے عشق کی ناگزیر منزل جس صبر واستقلال سے طے فرمائی۔ اور جس شان وخوبی سے ہو کے ویران اور سنسان میدان میں مردانہ وار بسر کی اس کی نظیر چند صدیوں سے نہیں ملے گی حتی کہ لوازمات عشق کو بھی نہیں چھوڑا۔ اور ایک ایک کو اتمام و اختتام کی حد تک پہنچا دیا۔ لہٰذا آپ کے شوق باطنی سے تو ہم بالکل بے خبر ہیں مگر چند ظاہری آثار نگارش ہوتے ہیں جن سے آپ کے عشق کامل کا اظہار ہوتا ہے۔

مثلاً پہلے آپ کے وضع لباس کو دیکھئے جس سے سراپا غلبۂ روحانیت اور شان عشق آشکار ہے۔ مزید برآں رنگ بھی وہ پسند فرمایا جو خاص عاشقوں کا نشان ہے۔

کیونکہ اصل رنگ آپ کے احرام کا زرد ہے۔ اور آپ نے زرد ہی رنگ کا تہبند زیادہ استعمال فرمایا ہے جو خاکساری کی نمایاں دلیل ہے کہ زرد رنگ مٹی کا ہوتا ہے۔ اور مٹی مٹنے والوں کا نشان ہے یا مٹ جانے کا سبق دیتی ہے جو عاشقان جانباز کا شیوہ ہے۔ اسی کے ساتھ برہنہ پا رہنا عین آزادی اور دنیا سے بے تعلق ہونے کا ثبوت ہے۔ معہذا برہنہ سر رہنا اہل محبت کی بے چینی کی تصویر ہے۔

علیٰ ہذا آپ کے صبر وقناعت میں بھی خاص خصوصیت ہے۔ اور یہ اختصاص آپ کے عشق کامل کی بین دلیل ہے کہ نہ رہنے کو مکان بنایا۔ نہ کھانا پکانے کا سامان مجتمع کیا ہمیشہ سیر وسیاحت میں بسر کی۔ اگر کسی نے دعوت کی تو کھایا۔ بلکہ اکثر آپ فرمایا کرتے تھے کہ ''ہم تو مسافر ہیں''۔ اور کھانے کا تو کیا ذکر ہے۔ آپ نے پانی بھی کبھی اپنی مرضی سے نہیں پیا۔ چنانچہ اکل وشرب کے بارے میں حضور کی عادت یہ تھی کہ جس سے صبر وقناعت کی عجیب شان نمودار ہوتی تھی کہ جناب والا نے کبھی یہ نہیں فرمایا پانی لاؤ۔ بلکہ خادم سے مخاطب ہوکر نہایت نرم لہجے میں یہ ارشاد فرماتے تھے کہ ''پانی پی لیں''، اگر خادم نے کہا کہ اس وقت مناسب نہیں ہے تو آپ خاموش ہوجاتے تھے۔ اور اگر وہ لے آیا تو آپ نے پی لیا۔ گویا آپ کا پانی پینا بھی خادم کی مرضی پر منحصر تھا۔ اور کھانا کھانے میں تو یہ بھی نہ تھا۔ دعوت کرنے والا جب کھانا لے کر حاضر ہوتا تھا، اس وقت خادم عرض کرتا تھا کہ حضور کھانا آگیا ہے جس کے جواب میں اکثر آپ یہ فرماتے تھے کہ ''کھانا آگیا'' اور کبھی متبسم لبوں سے یہ ارشاد ہوتا تھا کہ ''آپ آگئے اور بہت تھوڑا کھانا تناول فرماتے تھے۔ اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ذائقہ کی جانب مطلق التفات نہیں ہے کیونکہ خدام کھانے کا نام لے کر رکابی پیش کرتے تھے تو اکثر یہ

ہوا ہے کہ حضور نے دال کو زبان پر رکھا اور فرمایا کہ شیر برنج اچھی پکائی ہے''۔

تحمل کی یہ حالت تھی کہ کبھی بیماری کی سخت تکلیف بھی بیان نہیں کی۔ انداز سے خادم پہچان جاتے تھے اور بہ اسرار علاج کرتے تھے۔ حتیٰ کہ طبیب نے بھی مزاج پوچھا۔ تو یہی فرمایا کہ ''اچھا ہے'' کبھی حرف شکایت سے زبان آشنا نہیں ہوئی۔ ہمیشہ راضی برضائے مطلوب حقیقی رہے۔ اور بارہا آپ نے فرمایا کہ ''رضا وتسلیم تو اہل بیت کے گھر کی چیز ہے۔'' دنیا اور اسباب دنیا سے نفور جملہ تعلقات سے تجرید مرادات سے فراغ خواہشات سے انقطاع اور تمام عالم سے بے سروکار رہنا آپ کے عادات روزمرہ کی معمولی شان تھی۔

اس سے بھی آپ کے عشق کامل کا اظہار ہوتا ہے کہ بلالحاظ حیثیت واستعداد اور بغیر کسی خصوصیت کے جس معتقد نے حضور کے چہرۂ انور کو دیکھا بے ساختہ قلب میں تحریک محبت اور کشش پیدا ہوئی۔ اور کم یا زیادہ طبیعت گداز اور پرجوش ہوگئی۔ اور خیال مائل بہ آزادی ضرور ہوا۔ اب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ حضور کے عشق کامل کا یہ اثر تھا کہ وہ شخص جو مذاق محبت سے محض نابلد ہوتا تھا۔ اس کے دل میں بھی بغیر کسی کوشش کے محبت قبول کرنے کی کم وبیش صلاحیت فوراً پیدا ہو جاتی تھی۔ جس طرح نور آفتاب ہر تیرہ وتاریک مقام کو روشن کر دیتا ہے اسی طرح آپ کے کمال عشق کا یہ تقاضا تھا کہ جو دیکھتا اس کے دل میں کشش عشق کا ضرور اثر ہوتا تھا۔

اور بعض عادات وآثار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضور کو افاضہ عشق بغیر واسطہ اور بے حجاب بارگاہ حضرت مرتضوی سے ہوا جس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بظاہر سلسلۂ قادریہ رزاقیہ اور چشتیہ نظامیہ سے آپ کو صغرسنی میں ضرور تعلق ہوا مگر کبھی آپ

لے غلاموں کی بیعت وتعلیم میں سلسلہ قادریہ و چشتیہ کے قواعد مروجہ کی تقلید نہیں فرمائی۔ ہمیشہ اور ہرامر میں آپ نے اجتہاد فرمایا۔ پس اگر آپ کو بے واسطہ فیض حاصل نہ ہوتا اور حضرت مرتضوی سے بے حجاب اور مخصوص نسبت نہ ہوتی تو لازمی تھا کہ مثل دیگر مشائخین عظام آپ بھی پیران طریقت کی پوری تقلید فرماتے۔

علیٰ ہذا پیران طریقت مریدین کو شجرہ مرحمت فرماتے ہیں۔ اور اس کے ورد کی ہدایت کرتے ہیں۔ مگر یہ اہتمام بھی حضور نے نہیں کیا۔ نہ خود کسی حلقہ بگوش کو سلسلہ پیران طریقت کا شجرہ دیا۔ اور نہ داخل اور ادا کرنے کا حکم فرمایا۔ بلکہ سلسلہ قادریہ و چشتیہ کا شجرہ جو دربار وارثی میں تقسیم ہوتا تھا اس کی ابتداء بقدر واقفیت مجملاً نگارش کرتا ہوں۔

جہاں تک معتبر ذرائع سے سنا وہ یہ ہے کہ ۱۲۶۷ھ ہجری کے قبل دربار وارثی میں شجرہ کی تقسیم نہیں جاری ہوئی تھی۔ بلکہ شجرہ کا وجود بھی نہ تھا۔ اور جس طرح غیر معمولی طریقہ سے مریدوں کو آپ نے شجرہ نہیں دیا، اسی طرح خلاف معمول مرید بھی شجرہ کے طالب نہیں ہوئے جس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ حضور کو بلا واسطہ ایک ذات سے تعلق تھا۔ لہٰذا اسی نسبت کا یہ عکس تھا کہ مریدوں کو بھی ایک ہی ذات سے سروکار رہا۔

اور یہ عکس ایسا قوی تھا کہ سلسلہ کا خیال بھی غلاموں کے قلب سے خودبخود محو ہوجاتا تھا۔ بجز نظارۂ جمال وارثی ان کو کوئی اور جستجو نہ تھی چنانچہ آج بھی جو قدیم حلقہ بگوش باقی ہیں۔ ان کی یہی حالت ہے کہ نہ ان کے پاس کوئی شجرہ ہے۔ نہ اس سے کوئی غرض ہے کہ کسی سلسلہ میں مرید ہوئے۔ اگر دریافت کرو تو فخر ومباحات کے

ساتھ اسی قدر کہتے ہیں کہ ہم وارثی ہیں۔

لیکن ۱۲۶۷ ہجری کے بعد بعض خدام نے حضرت حاجی سید خادم علی شاہ اعلی اللہ مقامہ کا شجرہ قادریہ و چشتیہ لاکر حضور کو دکھایا۔ اور عرض کیا کہ آپ کا نام بھی اس میں لکھ دیں؟ آپ نے فرمایا لکھ دو۔ جب سے وہ شجرہ بیاض میں نقل بھی ہوا۔ اور منشی خدابخش صاحب شائق نے نظم بھی کیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد چھپ بھی گیا۔ اور جس طرح دیگر تحائف جناب والا کے سامنے پیش ہوتے تھے وہ چھپا ہوا شجرہ بھی پیش ہوا۔ حضور نے کسی کو دس کسی کو بیس دلوا دیئے۔ اور باقی شجرے مولوی عبدالکریم صاحب متوطن شیخ پورہ سے کہا کہ یہ تم لے جاؤ۔ اس وقت سے یہ طریقہ جاری ہو گیا کہ غلامان وارثی نے جدید طرز پر شجرہ نظم بھی کیا۔ اور بعض عقیدت منداس کو چھپواتے بھی تھے جس کو خدام تقسیم کیا کرتے تھے۔ مگر حضور نے اس دور میں بھی کسی کو مرید کرنے کے بعد خود شجرۂ سلسلۂ طریقت نہیں دیا۔

چونکہ آپ کے برادر نسبتی حضرت حاجی سید خادم علی شاہ صاحب نے صغرسنی میں آپ کی نگہداشت کی۔ اور اسی زمانے میں مرید بھی کر لیا تھا۔ اس لئے خاندان قادریہ و چشتیہ سے جو تعلق تھا اس لحاظ سے شجرہ جو دوسروں نے لکھا اور چھپوایا اس کی تقسیم کو بھی جائز رکھا۔ لیکن مثل مشائخین عظام مریدین کو خود شجرہ دینا اور اس کے ورد کی ہدایت فرمانے کو آپ نے لازمی نہیں متصور کیا۔ حالانکہ قواعد مروجہ میں یہ بھی ایک جز و خاص ہے اور شجرہ دینے کا اہتمام نہ کرنا، یہ اس کی بین دلیل ہے کہ آپ کو بغیر کسی ذریعے اور توسل کے افاضہ ہوا۔

علیٰ ہذا عادات روزمرہ میں سے آپ کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ سائل کا

سوال سن کر آپ بے چین ہو جاتے تھے۔اور چہرۂ اقدس پر آثار ہمدردی کے ساتھ تفکر بھی نمایاں ہوتا تھا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ حاجت روائی میں عجلت منظور ہے۔ اتنا توقف بھی ناگوار تھا کہ خادم کو حکم دیں اور وہ سائل کی حاجت کو پورا کرے۔ بلکہ بار ہا یہ ہوا ہے کہ ادھر سائل کا سوال سنا اور فوراً اپنا خاص فرش یا احرام پاک حوالہ کر دیا۔ کیونکہ سوائے فرش زیریں اور ایک تہبند کے اور آپ کے پاس کیا رہتا تھا۔

چنانچہ ایک مرتبہ کا یہ واقعہ ہے کہ حضور شکوہ آباد میں قیام پذیر تھے۔اور شب کو غریب مگر پردہ نشین عورتیں قدمبوسی کو حاضر ہوئیں۔ گو دیگر ممتاز خدام بھی ہمراہ تھے لیکن اس وقت مجھ حقیر کو حضوری نصیب تھی۔ آپ کے حکم سے باہر آیا۔اور وہ عورتیں کمرہ میں بہر زیارت جانے لگیں۔اور میں اپنی ضرورت سے اس مکان کے دوسرے حصہ میں چلا گیا۔مگر بابو کنہیا لال صاحب وکیل عرف غلام وارث متوطن علی گڑھ کو حضور کے کمرہ کے پاس اس لئے بٹھا گیا کہ جب آپ طلب فرمائیں تو مجھ کو بلا لیجئے گا۔ جب عورتوں کی آمدورفت موقوف ہوئی تو بابو صاحب موصوف نے کمرہ میں دیکھا تو جناب والا کو تنہا اور عجیب حالت میں پایا۔ بے تاب ہو کر مجھ کو بلایا۔ میں نے جا کر یہ دیکھا کہ نہ تو فرش کی چادر ہے نہ رضائی، نہ لحاف، بلکہ تہبند بھی دے دیا ہے۔صرف لنگوٹ باندھے ہیں۔میری زبان سے اضطرابی حالت میں یہ نکل گیا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟'' حضور نے مسکرا کر فرمایا کہ عورتوں نے مانگا تھا ان کو دے دیا۔'' اسی قبیل سے متعدد واقعات ہیں کہ حضور نے سائل کو محروم نہیں رکھا۔ اور اس خوبی سے اس کی حاجت روائی فرمائی جس سے کامل طور پر سخائے پنجتن کا اظہار ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ خاندانی شرف تھا جو آپ کو وراثۃً تفویض ہوا تھا۔ چنانچہ مولانا عبدالحق

دہلوی نے اپنی مستند تالیف شرح سفر السعادت میں لکھا ہے کہ ''بخاری و مسلم از حدیث جابر آوردہ اند کہ سوال کردہ نشد رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم از ہیچ چیز ہرگز در برابر آں لا گفتہ باشد وقال الفرزوق فی نعتہ صلے اللہ علیہ وسلم ۔ (بخاری و مسلم حضرت جابرؓ والی حدیث کے بارے میں متفق ہیں کہ حضورؐ سے کسی شے کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا کہ جس کے جواب میں آپ نے فرمایا ہو ''نہیں''۔ یعنی آپ نے نہ کی ہو۔)

ماقال لا قط الافی تشھد

لو لا التشھد کانت لاوہ نعم

(آپؐ نے کبھی لا نہیں کہا سوائے تشہد کے۔ اگر تشہد نہ ہوتی تو آپ کے منہ سے لا بھی نعم کے معنیٰ رکھتا۔)

اور فرزوق کے اس شعر کا ترجمہ کسی عجمی شاعر نے بھی کیا ہے۔

نرفت لا بزباں مبارکش ہرگز

مگر باشہدان لا الٰہ الا اللہ!

(آپؐ کی زبان مبارک سے ہرگز لا کا کلمہ سرزد نہیں ہوا۔ مگر صرف یہ کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں۔)

چونکہ ہمارے سرکار عالم پناہ کو اپنے جد اعلیٰ سے کامل نسبت تھی۔ لہٰذا اسی نسبت کا یہ اثر تھا کہ آپ نے کبھی سائل کا سوال رد نہیں کیا۔

ازاں جملہ آپ کے مزاج ہمایوں کا یہ انداز بھی اسی نسبت کامل کو ظاہر کرتا ہے کہ جب کوئی بات آپ کو بہت زیادہ ناپسند ہوئی۔ اور اس سے انکار قطعی منظور ہوا تو آپ حضرات پنجتنؑ کی قسم کھاتے تھے۔ پھر غلاموں کو اصرار کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

کیونکہ اکثر دیکھا کہ حضور نے حضرات پنجتنؑ کے واسطے سے جو عہد فرمایا اس کے خلاف کسی کی کوشش بکار آمد نہیں ہوئی چنانچہ سب کو معلوم ہے کہ پہلے آپ کے لباس میں تین کپڑے ہوتے تھے۔ لنگوٹ، تہبند، رومال اور جو شخص آپ کے واسطے تہبند لاتا تھا۔ وہ لنگوٹ اور رومال بھی لاتا تھا۔ رومال کا مصرف یہ تھا کہ آپ کی عادت تھی کہ ہمیشہ دا ہنی کروٹ سے استراحت فرماتے تھے۔ اور رومال داہنے ہاتھ لے کر زیر سر رکھتے تھے جس پر کچھ حصہ رخسار کا بھی ہوتا تھا۔ یا جب کہیں تشریف لے جاتے تھے تو وہ رومال کمر سے باندھ لیا کرتے تھے۔ ایک روز دیوے شریف میں چند پردہ نشین عورتیں قدمبوسی کو آئیں۔ اوران کے جانے کے بعد خادم نے تلاش کیا تو رومال نہ ملا۔ چونکہ رومال ہمیشہ پاس رہتا تھا، اس لئے اس کے استعمال کی عادت تھی تو حضور کی آزاد مزاجی نے اس کو بھی ناپسند کیا۔ اور اسی وقت آپ نے حضرات پنجتنؑ کے واسطے سے فرمایا کہ آج سے رومال نہ رکھیں گے۔ اور ایک عرصہ تک صرف ہاتھ کو زیر سر رکھ کر استراحت فرماتے رہے۔ جب ہر وقت کی یہ تکلیف غلاموں سے نہ دیکھی گئی۔ اور نہ رومال کی بابت اصرار کرنے کی جرأت ہوئی تو بعض مقرب مریدین نے ململ کا سفید تین گز کا ٹکڑا اس التجا کے ساتھ پیش کیا کہ اس کو رخسار کے نیچے رکھنا قبول فرمایا جائے۔ کیونکہ یہ نہ رومال ہے نہ تہبند کا ہم رنگ، جناب والا نے غلاموں کی استدعا کو یہ فرما کر منظور کیا کہ ”تم کو محبت ہے ورنہ ہم کو تکلیف نہ تھی۔“ مگر رومال نہ حضور نے پھر رکھا اور نہ مریدین نے پیش کیا۔

اور جناب والا کا بارگاہ مرتضوی سے بلا واسطہ مستفیض ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور نے اکثر مریدین کی بیعت اویسیہ طریق سے لی۔ یا متعدد حلقہ

بگوش آپ کے ایسے ہیں جن کو ہدایت بھی اویسیہ طریقہ سے فرمائی۔

علیٰ ہذا بعض ارشادات سے بھی حضور کی یہ نسبت کامل ثابت ہوئی ہے حالانکہ وہ غیور مزاج اس قدر کتمان واخفا کی جانب راغب تھا کہ ہمیشہ اس کی احتیاط رہی کہ خلوت میں بھی ایسا ذکر نہ ہو جو نمود وشہرت اور خودستائی پر مبنی ہو۔ بلکہ فروتنی کی جانب اس قدر طبیعت مائل تھی اور یہاں تک گمنامی پسند تھی کہ کبھی اپنی زبان سے اپنا نام بھی نہیں لیا۔ چنانچہ دستور تھا کہ قصائد وغیرہ میں اگر آپ کا نام نامی نظم ہو جاتا تھا تو آپ اس مصرع کو نہیں پڑھتے تھے۔ پس جو مزاج اس قدر سادگی پسند ہو وہ اپنے علوی مرتبت کی صاف لفظوں میں کیونکر بیان کر سکتا ہے۔ مگر تاہم بعض ارشادات خصوصیت کے ساتھ اس قوی نسبت کو ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کو بغیر واسطہ فیض حاصل ہوا۔

چنانچہ آپ نے فرمایا ہے کہ ''عشق جس کو ملا ہے حضرات پنجتنؑ سے ملا ہے۔'' اور یہ بھی متواتر ارشاد ہوا ہے کہ ''عشق وہی ہے جو کسب سے نہیں ملتا۔'' یہ بھی حضور نے بطور قصہ کے اکثر فرمایا ہے کہ سیدواڑہ کے ایک صاحبزادے ہمیشہ لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اور پڑھنے سے غیر ملتفت دیکھ کر اہل بستی کہتے تھے کہ میاں لڑکے تم ضرور سیدواڑہ کا نام خراب کرو گے۔ مگر وہ لڑکا یہی کہتا تھا کہ ہم جن کے ہیں۔ اگر ان کو شرم ہوگی تو خود پڑھا لیں گے۔ اور یہی ہوا کہ تھوڑے عرصہ کے بعد وہی لوگ جو لڑکے کے دادا کے برابر تھے اس کے مرید ہو گئے۔''

یہ قصہ اگر بلحاظ واقعات کے دیکھا جائے تو ''گفتہ آید درحدیث دیگراں'' (کسی دوسرے کی بات بیان کرتے ہوئے اپنی، اندر کی بات کہنا) کا مضمون صادق آتا ہے۔ کیونکہ دیوے شریف کے معمر حضرات کا بیان ہے کہ آپ صغرسنی سے مستغرق

الحال تھے۔ زیادہ وقت آپ کا تنہائی یا صحرا میں گزرتا تھا۔ اور اہل بستی کہتے تھے یہ لڑکا سیدواڑہ کا نام خراب کرے گا۔ لیکن آخر میں وہی معمر اور مقدس حضرات بھی آپ کے مرید ہوئے۔

ازاں جملہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جب آپ پہلی مرتبہ حجاز گئے تھے تو جوش وجذبات کی یہ کیفیت نہ تھی جو بعد مراجعت کے دیکھی۔ اور بعض خدام کا بیان ہے کہ قیام نجف اشرف میں آپ کے جوش قلبی کی یہ کیفیت ہوئی کہ جمیع تعلقات سے دست بردار اور ہمہ تن محو تجلیات دلدار ہو گئے۔

چنانچہ اس حقیر کو ۱۳۱۲ھ ہجری میں آنحضرت نے سفر عراق کی جب اشارت فرمائی تو بھی حکم ہوا کہ ''نجف اشرف پہنچنا تو وادی السلام میں در نجف ڈھونڈھنا۔ اور باون نگینے در نجف کے اور باون موئے نجف ہمارے واسطے لانا۔'' حسب ارشاد ایسا ہی کیا۔ اور بعد واپسی نجف اشرف کے جب ہر دو قسم کے نگینے پیش کئے، تو حضور نے متبسم لبوں سے فرمایا ''موئے نجف تو لائے مگر تصویر نجف بھی دیکھی تھی؟'' میں نے عرض کیا کہ دیکھنا کیسا نام بھی نہیں سنا۔ اور نہ تصویر نجف کی حقیقت معلوم ہے۔ فرمایا کہ ''جس طرح در نجف میں بال دکھائی دیتے ہیں اور اس کو موئے نجف کہتے ہو۔ اسی طرح شیر خدا کی شبیہہ دکھائی دیتی ہے کہ کھڑے ہیں اور ذوالفقار ہاتھ میں ہے اور اسی کو تصویر نجف کہتے ہیں۔'' میں نے عرض کیا کہ حضور نے تصویر نجف دیکھی تھی۔ اس وقت جناب حضرت نے نیچی نظر کر کے آہ سرد کے ساتھ بے ساختہ فرمایا کہ ''اسی کو دیکھ کے تو یہ حال ہوا''

غرض ارشادات مذکورہ سے ظاہر ہو گیا کہ آپ کو بغیر کسی واسطہ اور ذریعہ کے

حضرت خاتم الولایۃ الکبیرہ، سیدالاولیاء الشہیر، قطب دائرۃ المقاصد والمطالب مولانا و مولی الکل اسداللہ الغالب سیدی علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہ سے فیض باطنی حاصل ہوا۔ اسی وجہ سے بہت قوی اور ممتاز نسبت آپ کو حضرات پنجتنؑ سے تھی جو دیگر صوفیہ میں عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ اور یہی سبب تھا کہ آپ کے جوش میں خاص قسم کی خصوصیت اور کیفیت میں غیر معمولی اثر تھا۔

حالانکہ جملہ واصلان حق کو افاضہ بارگاہ مرتضوی ہی سے ہوا اور ہوتا ہے اور ہوگا۔ مگر ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ فیضان جو پیران طریقت کے سلسلہ سے پہنچتا ہے، اس میں اور فیض بلاواسطہ میں بدیہی امتیاز ہوتا ہے۔ چونکہ اول الذکر میں حجاب حائل ہوتے ہیں اس لئے وہ خصوصیت نہیں ہوتی جو بغیر واسطہ اور بلا حجاب حاصل ہونے میں ہوتی ہے جیسا کہ نور آفتاب جب بلا حجاب ہوگا تو اس میں خاص قسم کی ضو ہوگی اور جب ایک شیشہ کے بھی حجاب سے دیکھا جائے گا تو گو شیشہ مصفا ہوتا ہے مگر اس نور میں وہ صفائی نہ ہوگی۔ چہ جائیکہ چند حجاب حائل ہوں تو کیونکر وہ شان رہے گی جو نور بلا حجاب میں ہوتی ہے۔

چنانچہ وہ خاصان خدا جو فیض بلاواسطہ سے مستفیض ہوئے ہیں۔ ان کی حالت میں ضرور خصوصیت ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت شاہ بدیع الدین قطب المدار قدس سرہ کا حال خاص طور پر ممیّز اور ممتاز تھا جس کی وجہ یہی تھی کہ آپ کو بلاواسطہ حضور نبویؐ سے فیض نصیب ہوا۔ جس کی تصریح اور آپ کے ذوق و شوق جوش و جلال کا احوال کتاب تحفۃ الابرار فی مناقب قطب المدار مصنفہٗ شاہ عزیز اللہ مداری۔ اور سفینۃ الاولیاء مصنفہ مرزا دارا شکوہ اور کتاب اکمال فی اسماء الرجال مصنفہ شیخ عبدالحق محدث

دہلوی اور رسالہ ایمان محمودی مصنفہ قاضی محمود کنتوری اور بحر المعانی وغیرہ میں مذکور ہے۔ اور لطائف اشرفی میں مرقوم ہے کہ جب حضرت قطب المدار مدینہ منورہ میں حاضر اور شرف آستان بوسی سے مشرف ہوئے تو ''بروحانیت پاک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صفائے باطنی اور امیسر گشت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بکمال مہربانی خود دست او گرفتہ اسلام حقیقی تعلیم فرمودند و بروحانیت حضرت مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ سپردند'' (حضرت قطب مدار کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی روحانیت پاک سے باطنی صفائی میسر ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے بڑی مہربانی سے ان کز ہاتھ پکڑا اور ان کو صحیح اسلامی تعلیم عطا فرمائی اور انہیں روحانیت کیلئے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے سپرد فرمایا۔) اس کے بعد لکھا کہ ''پس شاہ مدار حسب الحکم در نجف اشرف رفتہ و کار خود تمام کردہ باز بہ مکہ آمدند۔'' (پس شاہ مدار حکم کے مطابق نجف اشرف تشریف لے گئے اور اپنا کام مکمل کیا اور پھر مکہ واپس آ گئے۔)

علیٰ ہذا سیدی محمد ابوالمواہب شاذلی علیہ الرحمۃ جو اپنے وقت کے بہت بڑے ابرار اور صاحب جوش تھے۔ اور جنہوں نے موشحات زبانیہ نظم فرمائے ہیں۔ اور اکثر حالت سکر میں رہتے تھے۔ آپ کی کتاب شرح الحکم اور القانون سے امام عبدالوہاب شعرانی نے آپ کا یہ قول طبقاۃ الکبریٰ میں نقل کیا ہے ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری بیعت لی اور مجھ کو خرقہ تصوف پہنایا۔'' اور نیز طبقاۃ الکبریٰ میں لکھا ہے کہ سید ابراہیم متولی جو ولایت میں صاحب دوائر کبریٰ تھے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے سوا ان کا کوئی پیر نہ تھا۔ اور یہ بیداری میں آں حضرت صل اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے معاملات میں مشورہ لیتے تھے۔

اور تاج العارفین حضرت شیخ محی الدین ابن عربی علیہ الرحمتہ کو علاوہ اس فیضان کے جو ذریعہ اور واسطہ سے ملا ہے باطنی طور پر بھی افاضہ حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ صاحب مراۃ الاسرار نے لکھا ہے کہ ''شیخ اکبر خرقہ بے واسطہ از دست خضر علیہ السلام نیز پوشیدہ است۔'' (شیخ اکبرؒ کو خرقۂ طریقت بلا واسطہ حضرت خضرؑ سے ملا۔)

غرض کتب سیر میں ایسے مقبولان حضرات احدیت کا ذکر اکثر ہے جن کو بغیر توسل پیران طریقت خاص بارگاہ رسالت یا حضرت مرتضوی کے حضور سے بلا واسطہ فیض حاصل ہوا۔ اور ان کے علوی مرتبت کا اظہار اسی طرح خلق میں ہوا جس طرح ہمارے وارث عالم پناہ کے ذوق و جوش کا نقارہ چار دانگ عالم میں بجا۔ اور عرف صوفیہ میں اسی کو عنایت وہبی کہتے ہیں۔ اور یہی وہ مرتبہ ہے جو کسب و کوشش سے نہیں ملتا۔

علاوہ اس کے اکثر حضرات متقدمین کو دوسرے سلسلہ کے ایسے پیران طریقت کے فیضان باطنی سے بطریق روحانیت استفاضہ ہوا ہے جن کا زمانہ صدیوں پہلے تھا۔ چنانچہ حضرات صوفیہ کرام کے حالات میں اس مضمون کے تذکرے متعدد موجود ہیں جن میں سے ایک مستند واقعہ تمثیلاً نگارش کرتا ہوں۔

محقق ملا نظام الدین فرنگی محلی علیہ الرحمۃ جن کے تبحر اور تقدس کا زمانہ معترف ہے۔ آپ نے رسالۂ مناقب رزاقیہ کے وصل اول میں مرشد الآفاق حضرت عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہ کے شجرۂ قادریہ کی تصریح کے بعد ارقام فرمایا ہے کہ سلسلہ چشتیہ میں بطریق روحانیت جس کو طریق اویسیہ کہتے ہیں جناب ممدوح کو خاص خواجہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ عنہ سے اجازت یوں حاصل ہوئی

کہ جب قصبہ موہان میں آپ تشریف لے گئے اور ایک شخص کی تمنائے بیعت آپ نے قبول فرمائی۔ ''آں مرید صادق گفت من گرید گی بجناب خاندان چشت دارم۔ ہر چند ہمہ خانوادہا برحق و بزرگ اند لیکن عقیدہ بایں خانوادہ تعلق گرفتہ۔ پس آں حضرت سکوت فرمودہ، گفتند کہ بحضرت خواجۂ بزرگ ملاقات معنوی شدہ اجازت فرمود پس آں شخص مرید در طریقہ چشت شد۔'' (اس سچے مرید نے کہا کہ میں جناب کے خاندان چشت کا گرویدہ ہوں۔ اگرچہ تمام خانوادے سچے ہیں۔ لیکن میرا تعلق اس خاندان سے ہے۔ پس آپ نے سکوت فرمایا۔ پھر وہ شخص اس طریقہ میں مرید ہو گیا۔) اس کے بعد ملا صاحب نے لکھا ہے کہ اس مرید کے لئے خاندان چشت کا شجرہ خود آں حضرت قدس سرہ نے اس ترتیب سے لکھوایا۔ ''نویسایندہ بایں طریق کہ الٰہی راز و نیاز یکہ فقیر عبدالرزاق بتو دارد۔ الٰہی بحرمت راز و نیاز یکہ خواجۂ بزرگ شیخ الاسلام خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ تعالےٰ عنہ بتو دارد......الیٰ آخرہ۔'' (آپ نے اس طریق سے یہ شجرہ لکھوایا کہ اے اللہ تعالیٰ اس راز و نیاز کے صدقے جو فقیر عبد الرزاق تیرے ساتھ رکھتا ہے الٰہی اس راز و نیاز کی حرمت سے خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین چشتی جو آپ سے رکھتے ہیں.....سے آخر تک) پھر ملا صاحب رائے لکھتے ہیں کہ ''بر ہمیں اعتبار اگر طریق چشتی شمارند دور نخواہد بود۔'' (اس اعتبار سے اگر طریق چشت کو شمار کیا جائے تو یہ دور نہیں ہوگا۔)

چونکہ قطب الاقطاب حضرت شاہ سید عبدالرزاق قدس سرہ کو بظاہر خاندان چشت سے تعلق نہ تھا۔ لیکن بلاواسطہ بطریق روحانیت حضرت خواجۂ بزرگ سے اجازت حاصل ہوئی اسی وجہ سے آپ نے شجرہ میں اپنے نام کے بعد حضرت خواجۂ

بزرگ کا نام لکھوایا۔ چنانچہ سلسلۂ رزاقیہ میں ہنوز شجرۂ چشتیہ بدستور جاری ہے کہ آپ کے نام کے بعد بلا واسطہ حضرت خواجۂ بزرگ کا نام نامی ہے۔ بلکہ منظوم شجرۂ چشتیہ جو رسالۂ کرامات رزاقیہ میں چھپا ہے۔اس کا ایک شعر یہ ہے:۔

از طفیل شہ غلام دوست آقائے زمن

عبدالرزاق و معین الدین حسن ہندالولی

(اس بادشاہ کے صدقے جو زمانے کا آقا ہے اور غلام کو دوست رکھنے والا ہے۔ جیسے معین الدین عبدالرزاق کو رکھتے ہیں۔)

اس کے بعد سلسلہ چشتیہ صابریہ کی نسبت جناب ملا صاحب اپنے پیشوائے برحق کا یہ واقعہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''ونیز در قصبۂ ردولی نزول فرمودہ بود۔ مردم ارادۂ بیعت آوردند حضرت قدس سرہ در خطرہ آوردند کہ ایں قصبہ ولایت شیخ احمد عبدالحق است رضی اللہ تعالیٰ عنہ و مزار مبارک درآں قصبہ است (یزار و یتبرک) فی الحال لقائے معنوی شد برزخ مبارک اشراق شد۔ آثار اجازت و رضا لائح شدن گرفت۔''

(علاوہ ازیں آپ نے ردولی قصبہ میں رہائش اختیار فرمائی۔ لوگ بیعت کے ارادہ سے آنے لگے۔آپ کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ قصبہ شیخ احمد عبدالحق کی ارادت میں ہے۔ حضرت کا مزار بھی اسی قصبہ میں ہے اور اس مزار کی لوگ زیارت کرتے ہیں اور برکت پاتے ہیں۔ اسی وقت آپ کی روحانی ملاقات و زیارت حضرت شیخ سے ہوئی، اجازت اور رضامندی کے آثار واضح ہو گئے۔)

چنانچہ شجرۂ چشتیہ صابریہ میں بھی آپ کے نام کے بعد بلا واسطہ حضرت احمد عبدالحق قدس سرہ کا نام پاک مرقوم ہے۔ اور کرامات رزاقیہ میں شجرۂ چشتیہ صابریہ جو

تسطیر ہے اس کے دوشعر یہ ہیں:۔

از طفیل عبد رزاق ولی بانسوی
بہر احمد عبد حق خضر صراط مستوی
حرمتِ خواجہ جلال الدین وشمس الدین ترک
اور علی احمد علاء الدین صابر کلیری

(حضرت شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کے طفیل اور صراط مستقیم پہ تونق افروز حضرت احمد عبد الحق کی خاطر، حضرت خواجہ جلال الدین، حضرت شمس الدین اور حضرت علاؤ الدین علی احمد صابر کلیری کا صدقہ)

مناقب رزاقیہ کی اس روایت سے جس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ طالبان حق کو بزرگان طریقت کے فیضان باطنی سے بطریق روحانیت افاضہ حاصل ہوتا ہے اسی طرح بکمال وضاحت یہ بھی معلوم ہوا کہ مستفیض بالواسطہ کو بجز اپنے مفیض کے دیگر پیران سلسلہ کے ذریعہ اور توسل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور نہ مستفیض کے شجرے میں دیگر پیران سلسلہ کا نام ہوتا ہے۔ ہر چند کہ فیض کنندہ کا زمانہ کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو۔ البتہ ماقبل مفیض جس قدر بزرگان سلسلہ ہوں گے ان کو امداد اور ذرائع کی حاجت رہتی ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ سید عبدالرزاق قدس سرہ کو جب مخدوم الملک حضرت احمد عبدالحق ردولوی قدس سرہ سے بطریق روحانیت سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں فیض اور اذن حاصل ہوا، تو باوجود یکہ حضرت مخدوم کا زمانہ آپ کے زمانہ سے دو سو برس پہلے تھا۔ اور درمیان میں چند پیران سلسلہ کا واسطہ حائل ہے۔ مگر ان کے وسیلہ کی ضرورت نہ ہوئی۔ اور کسی کا نام شجرہ میں نہیں لکھا گیا۔ ہوا یہ کہ جس طرح بغیر کسی توسل کے

استفاضہ ہوا، اسی طرح بلاواسطہ اپنے نام کے بعد اپنے مفیض حضرت مخدوم الملک کا نام شجرہ میں لکھوایا۔ لیکن حضرت مخدوم الملک کے قبل جو پیران سلسلہ تھے ان کے ذرائع کی احتیاج باقی رہی اوران کا نام نامی شجرہ میں بدستورقائم رہا۔

علیٰ ہذا حضرت خواجۂ بزرگ جن کے پانچ سو برس کے بعد حضرت سید عبدالرزاق صاحب پیدا ہوئے۔ مگر چونکہ حضرت ہندالولی سے آپ کو اجازت بلاواسطہ نصیب ہوئی۔ اس لئے درمیان کے پیران سلسلہ جن کی تعداد بھی زیادہ ہوگی ان کے ذریعہ اور توسل کی احتیاج نہ ہوئی اور بلاواسطہ اپنے نام کے بعد غریب نواز حضرت خواجہ اجمیری کا نام پاک تسطیر کرایا۔

لہٰذا غور کرنے سے ظاہر ہوگیا کہ ہمارے حضور نے اپنے غلاموں کی بیعت لینے کے وقت بکمال احتیاط وہ اہتمام بھی فرمایا جو حضرات صوفیہ کرام کی سنت تھی۔ اور یہ معمولی اور فروعی طریقہ کہ بیعت کے وقت شجرہ پڑھا جائے اس کو بھی نہیں چھوڑا۔ اور اپنے مسلک خاص کا شجرہ بھی پڑھ دیا۔ اوران واسطوں کا ذکر بہ تصریح کر دیا جو آپ کے شجرۂ طریقت میں تھے۔ کیونکہ جناب حضرت کا مسلک خاص عشق ہے جس کو متواتر آپ نے فرمایا ہے۔ اور طریق عشق میں بارگاہ مرتضویؑ سے بلاواسطہ آپ کو افاضہ حاصل ہوا ہے۔ اس لئے کہ سلسلۂ عشقیہ میں دیگر ہادیان طریقت کے ذریعہ اور توسل کی حاجت نہ رہی جس طرح حضرت شاہ سید عبدالرزاق علیہ الرحمتہ نے شجرہ چشتیہ میں اپنے نام کے بعد اپنے تفویض کنندہ حضرت خواجۂ بزرگ قدس سرہ کا نام اور شجرہ چشتیہ صابریہ میں اپنے نام کے بعد اپنے مفیض حضرت مخدوم ردولوی کا نام لکھوایا۔ اسی طرح ہمارے وارث عالم پناہ نے اس سلسلہ خاص یعنی طریق عشق کے شجرہ میں اپنے

نام کے بعد اس منبع فیض کا نام مبارک قائم کیا جو فیضان عشق کا تفویض کنندہ تھا۔ اور یہی شجرہ اپنے مریدین سے بیعت لینے کے وقت پڑھوایا کہ ''ہاتھ پکڑتا ہوں پیر کا پنجتن پاکؑ کا خدا اور رسولؐ کا'' کیونکہ آپ کے مسلک کا یہی شجرہ ہے۔

لیکن ایک خیال اور ہوسکتا ہے کہ اقرار اطاعت حضرات پنجتنؑ کے بعد مریدین سے اطاعت خدا اور رسولؐ کا عہد لیا ہے۔ تو آخر الذکر جملہ کے ظاہری مفہوم سے ہی شبہ ہو کہ جناب سرور عالم ﷺ تو پنجتنؑ میں شریک ہیں۔ اور مجملاً پہلے آپ کی اطاعت کا ذکر ہو چکا ہے پھر اطاعت خدا کے ساتھ آپ کی اطاعت کا مکرر اقرار کیوں لیا گیا۔

اس کی نسبت پہلے یہ عرض کروں گا کہ عموماً حضور کے ارشادات بہت سادہ الفاظ میں اور نہایت مختصر تھے۔ مگر حقیقت میں ہر جملہ جامع اور کثیر المعانی اور طول و طویل عبارت کا خلاصہ ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ تکرار اطاعت جو بظاہر مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے متعلق جناب والا نے جس قدر نکات خاص طور پر ارشاد فرمائے ہیں ان سے اہل حیثیت واستعداد غلامان وارثی واقف ہیں۔ لیکن چونکہ عام طریقہ سے یہ لطائف معنوی نہیں فرمائے ہیں۔ اس لئے بے پردہ مضامین میں ان کا اظہار مناسب نہیں۔ مگر ارشاد مذکور کے ظاہری مفہوم کو بھی غور کیجئے تو یہ تکرار اطاعت اصول بیعت کے خلاف نہیں۔ بلکہ اس تکرار میں خاص حسن ہے۔ اور یہ تکرار مریدین کے اقرار اطاعت کو از روئے عقائد بھی اور زیادہ مضبوط و مستحکم کرتی ہے۔

کیونکہ جناب سرور عالم ﷺ کو جس طرح درجۂ رسالت میں کمال اتم تھا کہ پیشوائے مرسلین ہوئے۔ اسی طرح مقام ولایت میں بھی آپ افضل الاولیاء الاولین و

الآخرین تھے لیکن خلق میں تبلیغ رسالت بنفس نفیس فرمائی۔ اور شان ولایت کا اظہار حضرات پنجتنؑ کے ذریعہ سے ہوا۔ جو حقیقت میں عین رسول تھے (جس عینیت کی تشریح شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں کما حقہ کی ہے) پس آپ کی شان رسالت کا اقرار جب کریں گے تو اسلام کی تصدیق ہوگی۔ اور جب آپ کے فیضان ولایت سے مستفیض ہوں گے تو ہمارے ایمان کی تکمیل ہوگی۔ یعنی اسلام کی تصدیق اس وقت ہوگی جب آپ کو رسول اللہ کہیں گے۔ اور ایمان کامل جب ہوگا جب دل سے آپ کو ولی اللہ سمجھیں گے۔ لہٰذا حضرت وارث پاک کے دست حق پرست نے جب اپنے حلقہ بگوش کا ہاتھ پکڑا، تو اس سے اطاعت پنجتنؑ کا اقرار لیا۔ جس میں رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم بدرجۂ اولیٰ بحیثیت ولایت شریک ہیں۔ پھر جب خدا کی اطاعت کا اقرار لیا تو موجب آیہ وانی ہدایہ "اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول" (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی۔ سورۃ النساء:۵۹) خدا کے رسول کی بھی اطاعت کا اقرار لیا۔ اور یہ اقرار بلحاظ آپ کی رسالت کے لیا جس کو دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فیضان وارثی نے ہم کو بیک وقت ایمان اور اسلام سے مستفیض فرمایا۔ اس واسطے داخل بیعت فرمانے کے وقت عام طور پر اپنے غلاموں سے اس کا اقرار لیا کہ "ہاتھ پکڑتا ہو پیر کا پنجتن پاکؑ کا خدا اور رسولؐ کا۔"

الغرض بیعت کے قواعد مروجہ کا ایسا جامع اور مکمل خلاصہ فرمایا جس کی جہت سے ہم گنہگاروں کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ آپ کے حلقۂ غلامی میں داخل ہوگئے۔ ورنہ حضور کا دائمی جوش اور مستقل استغراق ہرگز اس کا مقتضی نہ تھا کہ ہر روز متعدد

مریدین کی قواعد مروجہ کے مطابق آپ بیعت لیتے۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ جملہ غلامان وارثی کا اقرار اطاعت باللفظ اور بالمعنی ایک صورت سے ہوا تو اب دیکھنا یہ چاہئے کہ بعد فراغ بیعت اپنے غلاموں کو حضور نے کیا کیا ہدایتیں فرمائیں۔

اگر حضور کے ہدایت کا فرداً فرداً ذکر کیا جائے تو ان کا حصار و احاطہ بھی دشوار ہے کیونکہ جو جس کے مناسب حال تھا وہی اس کو حکم دیا۔ کسی کو ادائے فرائض کے ساتھ اوراد وظائف میں مشغول کیا بعض آپ کے حکم سے دائم الصوم ہوئے۔ بعض سے متواتر حج بیت اللہ کرائے۔ کسی کو ذکر جلی، کسی کو ذکر خفی تعلیم فرمایا۔ کسی کو دیگر ریاضت و مجاہدات کی ہدایت فرمائی۔ کسی کو گوشہ نشیں کیا، کسی کو سیر و سیاحت میں مصروف رکھا۔ کوئی تارک الدنیا اور فقیر ہوا۔ کسی کو تجرید کا حکم دیا۔ لیکن مجھ کو مقصود یہ ہے کہ انہیں ہدایات کا ذکر ہو جن کا بغیر کسی خصوصیت کے جملہ مریدین سے یکساں تعلق ہے۔

لہٰذا پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ حضور نے توحید حضرت احدیت جل جلالہ کی نسبت اپنے غلاموں کو کیا ہدایت فرمائی ہے۔ چنانچہ جس قدر ہنود حلقہ بگوش ہیں ان سے بتاکید یہ فرمایا ہے کہ ''برہم پہچانو۔ اور پتھر کو نہ پوجو۔ اور جھٹکے کا گوشت نہ کھاؤ۔'' سبحان اللہ یہی تین لفظ مشرک کو موحد بنانے کے واسطے کافی ہیں۔ جھٹکے کے گوشت کا استعمال بموجب آیہ کریمہ ''وما اھل بہ لغیر اللّٰہ'' (اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو حرام ہے۔ سورۃ البقرۃ:۱۷۳) منع فرمایا۔ پتھر کی پرستش سے پرہیز خاص توحید کا سبق ہے۔ برہم پہچانو ''من عرف نفسہ فقد عرف

ربہ‘‘ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا پس اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ الحدیث) کی شرح کا خلاصہ ہے۔ یہ مختصر ہدایت کس قدر جامع ہے کہ یہی تین لفظ ادنیٰ کو اعلیٰ، ناقص کو کامل، اور گمراہ کو خداشناس بناتے ہیں۔

عیسائی اور یہودی مریدین سے یہ فرمایا کہ ’’عیسیٰ روح اللہ، موسیٰ کلیم اللہ اور محمد رسول اللہ کا اقرار ایک جانو۔ جو ’’لانفرق بین احد من رسلہ‘‘ (ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان بھی (ایمان لانے میں) فرق نہیں کرتے۔ سورۃ البقرۃ: ۲۸۵) کی پوری تفسیر ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ’’عیسیٰ اگر خدا کے بیٹے ہیں، تو خدا کا باپ بھی ضرور ہوگا۔ اور خدا اس سے پاک اور منزہ ہے۔‘‘ اس ارشاد کا ’’لم یلد. ولم یو لد O ولم یکن لہ کفوا احد O‘‘ (نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ ہی وہ پیدا کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے۔ سورۃ اخلاص: ۳۔۴) کی جانب اشارہ ہے۔ واقعی انہیں جملوں پر عمل کرنے سے عیسائیت اور اسلام میں کوئی فرق نہیں رہتا ہے۔

اور عام طور پر حضور نے توحید احدیت اور تصدیق الوہیت اور تطبیق ربوبیت کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ ’’خدا ہر جگہ موجود ہے‘‘ یہ فرمان وارثی ’’فاینما تو لوا فثم وجہ اللہ‘‘ (پس تم جدھر بھی رُخ کرو اُدھر ہی اللہ کی توجہ ہے۔ یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے۔ سورۃ البقرۃ: ۱۱۵) اور ’’و ھو معکم این ما کنتم‘‘ (وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔ سورۃ الحدید: ۴) اور ’’الا انہ بکل شیء محیط‘‘ (خبردار! وہی (اللہ اپنے علم وقدرت سے) ہر چیز کا احاطہ فرمانے والا ہے۔ سورۃ حم السجدہ: ۵۴) کا بامحاورہ ترجمہ ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ’’خدا

تمہارے دل کا حال جانتا ہے۔'' یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے خدا اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔'' جو آیہ کریمہ ''ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ'' (اور جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہی اسے کافی ہے۔ سورۃ الطلاق:٣) کا مفہوم ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''بغیر حکم خدا کچھ نہیں ہوسکتا۔'' یہ بھی فرمایا کہ ''خدا نے ہر کام کے واسطے ایک وقت مقرر کیا ہے۔'' اور بعدازاں یہ حدیث پڑھا کرتے تھے ''کل امر مرھون باوقاتھا'' (ہر کام وقت کا مرہون منت ہے۔) اور اکثر یہ بھی فرمایا ہے کہ ''انسان ہزار کوس سے جورو کی فکر کرتا ہے۔ اور محنت کر کے اس کو خرچ بھیجتا ہے۔ اور جو تمہاری شہ رگ سے قریب ہے کیا اس کو تمہاری طرف توجہ بھی نہ ہوگی جس قدر خاوند کو جورو کی طرف۔ حضور کا یہ فرمان اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس وعدہ کی تصدیق ہے جس کا ذکر آیہ'' ومامن دآبۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا'' (اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا جاندار نہیں ہے مگر یہ کہ اس کا رزق اللہ کے ذمۂ کرم پر ہے۔ سورۃ ھود:٦) میں ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''جو اپنے کام خدا کے سپرد کرتا ہے خدا اس کے کام بنا دیتا ہے۔ اور جب انسان اپنی عقل کو دخل دیتا ہے تو وہ بھی بڑے ہوشیار ہیں۔ فوراً علیحدہ ہو جاتے ہیں کہ دیکھیں ان کی تدبیر کیا کرتی ہے۔''

اکثر حضور نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''جو مسجد میں ہے وہی مندر میں۔ نام کا فرق ہے، ورنہ انتظام بگڑ جائے۔'' یہ توحید ذاتی کی تعلیم ہے جس کو حافظ شیراز نے یوں لکھا ہے۔

همه کس طالب یار رند چه هوشیار و چه مست
همه جا خانهٔ عشق است چه مسجد چه کنشت

(تمام لوگ دوست کے طالب ہیں خواہ وہ رند ہوں، ہشیار ہوں یا مست۔ ہر جگہ عشق کا ٹھکانہ ہے خواہ وہ مسجد ہو یا کلیسا۔)

یہ بھی فرمایا ہے کہ ''اگر دو بدھا نہ رہے تو مسجد اور مندر میں ایک دکھائی دے۔'' اس ارشاد میں توحید کامل کی تعریف ہے کہ موحدین خاص بعد انقطاع تعلقات جملہ موجودات میں حضرت واحدالوجود کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی مسئلہ کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ جناب مولانا علیہ الرحمتہ بھی ارقام فرماتے ہیں۔

گرد و چشم حق شناس آمد ترا — دوست پر بیں عرصۂ ہر دوسرا
گر ترا چشمیت بکشا در نگر — بعد لا آخر چہ می باید دگر
گر ہزار انند یک کس بیش نیست — چوں خیالات عدو اندیش نیست
اصل بیند دیدہ چوں اکمل بود — دو ہمیں بیند چو مردا حول بود
ایں دوئی اوصاف دیدا حول ست — ورنہ اول آخر، آخر اول است

(اگر حق کو پہچاننے والی آنکھ تجھے حاصل ہو تو دونوں جہانوں میں سوائے دوست کے اور کوئی نظر نہ آئے۔ اگر تیرے پاس آنکھ ہے تو تو اسے کھول اور دیکھ کہ لا کے بعد تجھے اور کیا نظر آتا ہے؟ آخر تجھے اور کیا چاہئے؟ اگر یہ ہزار تجھے نظر آتے ہیں تو وہ تو ایک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جب دشمن کے بارے میں سوچنے والے خیالات نہیں۔ جب نگاہ کامل ہوتی ہے تو وہ فقط اصل کو دیکھتی ہے۔ دو وہی آنکھ دیکھتی ہے جب آدمی بھینگا ہو جائے۔ یہ دو نظر آنا بھینگا پن کا کمال ہے۔ ورنہ وہی اوّل و آخر اور آخر و اوّل ہے۔)

یہ بھی حضور نے فرمایا ہے کہ ''توحید اب ٹکے سیر ہو گئی۔'' یہ بھی فرمایا ہے کہ

''توحید سے واقف ہونا دشوار ہے۔'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''رام اور رب ایک چیز ہے۔''

شک نہیں کہ یہ لغوی بحث اور اصطلاح ہے کہ ایک عربی زبان کا لفظ ہے دوسرا اسنسکرت کا۔ مگر مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ چنانچہ ہر لفظ کے واسطے ایسا ہی ہوتا ہے کہ دوسری زبان میں اس کی تعبیر دوسرے لفظ سے کرتے ہیں۔ مثلاً اسم ذات کی تعبیر عربی زبان میں کی جائے تو اللہ کہیں گے۔ اور عبرانی میں الوہیم۔ اور فارسی میں خدا، ترکی میں تکری، رومی میں تیپوس، قبطی میں لیصا اور سریانی میں قلندر۔

غرض انہیں چند ہدایات کو نظر غائر سے دیکھا جائے تو خداشناسی کے واسطے کافی ہیں، لیکن ہدایات مذکورہ کا تعلق عقائد سے ہے۔ اور عقائد کو صحیح اور مستحکم بنانے کیلئے عمل بھی درکار ہے۔ لہٰذا عنایت وارثی نے ہم کو اس نعمت سے بھی محروم نہیں رکھا بلکہ ایسا عمل تعلیم فرمایا جو جمیع اعمال کی اصل ہے کہ بغیر جس کے نہ عقائد درست ہوتے ہیں نہ اعمال۔

اور لطف یہ ہے کہ ایسا بے مثل عمل اور حضور نے اپنے ہر ایک دست گرفتہ سے خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی متواتر بلکہ روزمرہ اس کی ہدایت فرمائی جس سے کوئی غلام آپ کا مستثنیٰ نہیں۔ اور جس کی تعلیم ہم کو لازمی ہے۔ اور جس کو حضور کے مذاق و مسلک سے پورا تعلق ہے۔ اور ہر شخص کے مناسب حال بھی ہے یعنی بوڑھا، جوان، امیر، غریب، عالم، جاہل، دنیادار، فقیر، غرض کسی حیثیت و استعداد کا آدمی کیوں نہ ہو۔ مگر سب کے واسطے یہی ارشاد وارثی یکساں مفید اور کارآمد ہے۔ وہ کیا ہے۔ صرف دو لفظ ہیں۔ ایک بصورت امر۔ دوسری بشکل نہی۔ یعنی حضور نے فرمایا کہ

''محبت کرو'' اور ارشاد ہوا کہ ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ'' یہ چھوٹے چھوٹے دو جملے ایسے ہیں کہ جن کی تعمیل سے ہمارے دین و دنیا کے کام نہایت خوبی کے ساتھ بن سکتے ہیں۔

لیکن حضور کا یہ فرمان کہ ''محبت کرو'' بظاہر تو سات حروف کا ایک جملہ ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو نہایت جامع اور وسیع المعنی ہے۔ حالانکہ محبت کے لغوی معنی تو اسی قدر ہیں کہ محبوب کے ساتھ قلبی تعلق ہو۔ اور کثرت محبت کا یہ اثر ہے کہ محبّ دین و دنیا سے قطعی دست بردار ہو جائے۔ اور اس کو موجودات عالم سے سروکار نہ رہے۔ بقول ؎

من عاشق شوریدہ ام وز کفر وایماں بے خبر
دینم شدہ مہر کسی ایمان من روئے کسے

(میں وہ عاشق شوریدہ ہوں جو کفر وایمان سے بے خبر ہے۔ میرا دین کسی سے محبت کرنا ہے۔ اور کسی کے رُخ انور کو دیکھتے رہنا ہے۔)

لیکن محبت کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے۔ اس کا اظہار کرنا نہایت دشوار ہے۔ اور اس کی حقیقی تعریف محال اور حد اختیار سے باہر ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا فرماتے ہیں:- ؎

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیاں
چوں بعشق ایم خجل باشم ازاں
گرچہ تفسیر زباں روشن گراست
لیک عشق بے زباں روشن تراست

(میں نے جو کچھ عشق کے بارے میں اس کی وضاحت کی اور بیان کیا۔ جب عاشق ہو گئے تو ہم اپنے اس پہلے کہے پہ شرمسار ہیں۔ اگر چہ زبان کی تفسیر بہت واضح ہے لیکن بے زبان عشق کی تفسیر اس سے بھی زیادہ واضح تر ہے۔)

اس لئے کہ محبت محض موہبت ہے۔ اور جملہ اعمال عالیہ اسی عطیۂ (وہبی) پر مبنی ہیں اور محبت کوشش وکسب سے حاصل نہیں ہوتی چنانچہ تاج العارفین حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمۃ نے عوارف المعارف میں ارقام فرمایا ہے کہ ''سبل معروف عن المحبت فقال المحبت لیست من تعلیم الخلائق انماھی مواھب الحق و فضلہ '' (اچھائی کے راستے محبت کے متعلق ہیں۔ پس آپ نے فرمایا کہ محبت مخلوق کی تعلیم سے نہیں ہے بلکہ یہ محبت صرف اللہ کے عطیات اور اس کے فضل سے ہے۔) جس کا مفہوم حضرت حافظ شیراز نے اس شعر میں لکھا ہے:۔

مے خور کہ عاشقی نہ مکلبسب ست واختیار
ایں موہبت رسید ز ایوان قسمتم

(شراب پی کہ عاشقی کسبی اور اختیاری چیز نہیں ہے۔ یہ اللہ کے حضور سے قسمت میں عطا ہے۔)

اور محبت وارادت قلبی کا نام ہے جس کو مطالعہ جمال سے تعلق ہوتا ہے بلکہ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ محبت عام، اور محبت خاص۔ محبت عام کی یہ تعریف ہے کہ جمال صفات دیکھنے کا قلب میں میلان ہو۔ اور محبت خاص اس کو کہتے ہیں کہ روح کو مشاہدۂ جمال ذات کی خواہش ہو۔ محبت عام وہ ماہتاب ہے جو آسمان صفات جمالی پر دورہ کرتا ہے اور محبت خاص وہ آفتاب جو افق ذات سے برآمد ہوتا ہے۔ محبت عام وہ

نور ہے جو باعث آرائش ہو۔اور محبت خاص وہ نار ہے جو محبؒ کے وجودہستی کو نیست و نابود کرتی ہے۔محبت عام میں تمیز''خذ ما صفادع ما کدر ''(صاف چیز اختیار کر اور گندگی کو چھوڑ دے۔الحدیث) ہے۔اور محبت خاص کا کلیہ''لاتبقی ولا تذر'' (وہ (ایسی آگ ہے جو) نہ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے۔سورۃ المدثر:۲۸) ہے محبت عام میں ممازجت اغراض شامل ہیں۔اور محبت خاص علت اور مخالطت سے پاک اور منزہ ہے۔محبت عام وہ خمار ہے جس میں صفا و کدورت، لطافت و کثافت کا ہوش رہتا ہے۔اور محبت خاص وہ شراب ہے کہ محبؒ کے تمامی اجزاء جسم کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ روح کو شوق مشاہدہ اور قلب کو ذوق مذاکرہ ہوتا ہے۔اور نفس کو لذت معاملہ نصیب ہوتی ہے۔بلکہ یہ لذت تمام لذات طبعی پر غالب ہوتی ہے۔کیونکہ قلب محبؒ کو یہ شراب اپنے رنگ میں ایسا محو کرتی ہے کہ غایت صفا و لطافت سے صورت وحدت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ حضرت جنید علیہ الرحمۃ کا قول ہے''المحبت دخول صفاۃ المحبوب علی البدل من المحب'' (محبت کیا ہے؟ محبوب کی صفات کا عاشق کے دل میں داخل ہو جانا۔) اور'' تخلقوا باخلاق اللہ'' (اللہ کی عادات سے متصف ہو جاؤ۔الحدیث) کے بھی یہی معنی ہیں۔

بعض عارفین نے محبت کو پانچ نوع پر تقسیم فرمایا ہے۔اول الفت۔دوئم مودّت، سوئم انس، چہارم محبت، پنجم عشق جو اصل محبت ہے۔

بعض نے فرمایا ہے کہ محبت تین درجوں پر منقسم ہے۔الفت، محبت، اتحاد، بعدہٗ مرتبہ وحدت کا ہے جس کو اصلاح صوفیہ میں عشق کہتے ہیں۔

لیکن حضرت شیخ نصیر الدین محمود روشن چراغ دہلی قدس سرہ العزیز نے اپنے

مکتوبات میں اقسام محبت کی تفصیل نہایت وضاحت سے فرمائی ہے۔

چنانچہ منقول ہے کہ محبت کے دس مرتبے اور ہر مرتبے کے پانچ درجے ہیں اور مرتبہ اول کا نام الفت ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ ''وھی میلان القلب الی المالوف'' (محبوب کی طرف دل کا متوجہ ہونا الفت کی تعریف ہے۔) جس کا پہلا درجہ مطلوب حقیقی کے صنائع پر نظر کرنا ہے۔ اسی حالت کو ہمارے سرکار عالم پناہ نے یوں فرمایا ہے کہ ''عاشق ہر چیز میں معشوق ہی کا جلوہ دیکھتا ہے''۔ بقول

وفی کل شئی له آیته

تدل علٰے انه واحد

(ہر شے میں اللہ کی پہچان کی نشانی موجود ہے۔ ہر شے اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ذات واحد ہے۔)

اور دوسرا درجہ کتمان میلان اور تحمل شدت مشقت ہے۔ اور تیسرا درجہ تمنا ہے کہ الیف آرزوئے وصل یار میں ایثار جان کو بھی گوارا کرتا ہے۔ چنانچہ حضور نے فرمایا ہے کہ عاشق وہ ہے جو معشوق پر جان قربان کرے۔'' بقول

اگر فرہاد را حاصل نشد پیوند با شیریں

ہم آخر جان شیرینش بر آمد در تمنایش

(اگر فرہاد کو شیریں کے ساتھ تعلق نہ ہوتا تو اس کی تمنا میں اس کی جان شیریں نہ نکلتی۔)

چوتھا درجہ اخبار و استخبار ہے کہ محبّ اپنا حال اظہار کرتا ہے اور محبوب کے اظہار کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ پانچواں درجہ تضرع ہے۔ اس حالت کی نسبت حضور نے یہ فرمایا ہے کہ ''عاشق کا کام رونا ہے۔''

اور محبت کا مرتبہ دویم صداقت ہے۔ اس کی تعریف حضرات صوفیہ کرام نے یہ فرمائی ہے ''استواء القلب فی الوقاو الجفاء و المنع و العطاء '' (وفا اور جفا میں اور محبوب کے کچھ عطا کرنے یا نہ کرنے میں دل کا ایک جیسا رہنا۔ یہ محبت ہے۔) یہ بھی پانچ درجوں پر منقسم ہے۔ اور پہلے درجے کا نام صفا ہے جس کی علامت یہ ہے ''وعلامة بغض النفس والھوائی و مخالفة المراد و المنیٰ و ترک الشھواة بعین الرضاء والخروج بالکلیة من حب الدنیا '' (ہوائے نفس اور کدورت نفس سے بغض اور مقصد ومراد کی مخالفت اور رضامندی کے ساتھ ترک شہوات اور حب دنیا کا مکمل طور پہ ترک صفا کی علامات ہیں۔) شاید اسی مقام کی نسبت ہمارے حضور نے اکثر فرمایا ہے کہ ''عشق میں ترک ہی ترک ہے۔'' اور فرمایا ہے کہ ''عاشق وہ ہے جو رضا وتسلیم میں ثابت قدم رہے۔'' اور دوسرا درجہ اس کا غیرت ہے کہ محبّ کو گوارا نہیں ہوتا کہ اغیار نام یار بھی لیں۔ چنانچہ حضور کا ارشاد ہے کہ ''محبت میں رقابت ضرور ہوتی ہے۔'' تیسرا درجہ اشتیاق ہے کہ محبّ شوق دیدار میں بے قرار رہتا ہے۔ چوتھا درجہ ذکر محبوب ہے بمصداق ''من احب شیأً فقد اکثر ذکرہ '' (جو کسی شے سے محبت کرتا ہے وہ اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔) پانچواں درجہ تحیر ہے کہ محبّ وفور محبت کے باعث متحیر رہتا ہے۔ اس حالت کی نسبت ہمارے سرکار عالم پناہ نے یہ فرمایا ہے کہ ''محبت میں انسان اندھا اور بے خود ہو جاتا ہے۔'' اور محبت کا مرتبہ سویم مودّت ہے۔ اور اس کے بھی پانچ درجے ہیں۔ پہلا درجہ نیاحت اور اضطرار ہے۔ بقول ؎

در فراق تو اے بت مہ روئے

می کند نوحہ برتنم ہر موئے

(اے چاند جیسے چہرے والے صنم تیری جدائی میں میرے جسم کا ہر بال نوحہ کناں ہے۔)

دوسرا درجہ بکا ہے۔ کیونکہ گریہ شرائط محبت میں سے ہے چنانچہ مالک حقیقی جل جلالہ نے ہمارے اوقات روزمرہ کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ ''فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً'' (پس انہیں چاہئے کہ وہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روئیں۔ سورۃ التوبہ:۸۲) علیٰ ہذا ''وکان علیہ السلام دائم الحزن و البکاء'' (اور آپ ہمیشہ غمگین اور افسردہ رہتے تھے۔) تیسرا درجہ حسرت ہے کہ صاحب وداد اپنے ضائع شدہ اوقات پر حسرت کرتا ہے اور جو ساعت بغیر یاد محبوب گزرتی ہے اس پر نادم ہوتا ہے۔ اس حالت کی نسبت ہمارے پیشوائے برحق نے یہ فرمایا ہے کہ ''عاشق وہ ہے جس کی کوئی سانس خالی نہ جائے۔'' بقول؎

عمرے کہ بے تو می رود از مرگ بدتر است
روزے کہ بے تو می گذرد روزِ محشر است

(وہ زندگی کہ جو تیرے بغیر گذرے وہ موت سے بھی بدتر ہے۔ ہر وہ دن کہ جو تیرے بغیر گزرے وہ میرے لئے روزِ محشر ہے۔)

چوتھا درجہ تفکر بہر محبوب ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے ''ان فی ذٰلک لآیات لقوم یتفکرون'' (بے شک اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں۔ سورۃ الجاثیۃ:۱۳) اور حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے ''تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ ستین سنۃ'' (ایک لمحہ کا تفکر ساٹھ سال

کی عبادت سے بہتر ہے۔) کیونکہ تفکر قرب محبوب کا باعث ہوتا ہے "لان التفکر فی المحبوب یو جب القرب الیه" (محبوب کے بارے میں سوچ اور فکر اس کے قرب کیلئے واجب ہوتی ہے۔) اور بعض عارفین نے فرمایا ہے "التفکر یصحب و المحب الی المحبوب" (محبوب کی فکر محبّ کو محبوب کا مصاحب بنا دیتی ہے۔) بقول۔

نخواہم جز تو یکساعت تفکر درد گر کردن
کہ در ہر دو جہاں جاناں ندارم جز تو دلداری

(میں ایک لمحہ بھی تیرے سوا کسی اور شے میں غور وفکر کرنا نہیں چاہتا کہ دونوں جہانوں میں تیرے سوائے محبوب! اور کسی کو میں دلدار نہیں سمجھتا۔)

پانچواں درجہ مراقبہ محبوب ہے۔ جس کی عظمت یہ ہے کہ "وھی اشد المقامات و افضلها" (اور یہ بہت سخت مقام ہے اور تمام مقامات سے افضل تر ہے۔) اور اس مراقبہ محبوب کا ذکر مجمل طور پر ابیات ذیل میں خوب کیا ہے۔

در دل ہمو در تن ہمو کفرم ہمو ایماں ہمو
در دم ہمو درماں ہمو پیدا ہمو پنہاں ہمو
راہ ہمو رہبر ہمو درخانہ ام مونس ہمو
چشمم ہمو گوشم ہمو جسم ہمو ہم جاں ہمو

(دل میں بھی وہی ہے اور جسم میں بھی وہی ہے۔ میرا کفر بھی وہی ہے اور میرا ایمان بھی وہی ہے۔ میرا درد بھی وہی ہے اور میرا علاج بھی وہی ہے۔ میرے لئے خلوت و جلوت میں ظاہر بھی وہی ہے اور پوشیدہ بھی وہی ہے۔ جس راہ سلوک کو طے کرنا ہے وہ

وہی ہے اور رہنما بھی وہی ہے۔ میرا باطنی مونس وغمخوار بھی وہی ہے۔ میری آنکھ بھی وہی ہے۔ میرا ایمان بھی وہی ہے۔ میرا جسم بھی وہی ہے۔ میری جان بھی وہی ہے۔)

اور محبت کا مرتبہ چہارم ہوا یعنی خواہش ہے۔ اور اس خواہش کی تعریف یہ ہے کہ "وھوان یھوائی قلبه الی المحبوب دائما" (دل کا محبوب کی طرف ہمیشہ چاہنے والا (طالب) بن جانا، یہ محبت ہے۔) اور اس کے بھی پانچ درجے ہیں۔ پہلا درجہ خضوع ہے، دوسرا درجہ بذل مہجت اطاعت دوست میں علی فوق الطاقۃ" بقول قیس عامری۔

بذلت مھجتی فی حب لیلیٰ
الا یا طاقتی لا تخذ عنی

(لیلیٰ کی محبت میں میں اپنی جان کو خرچ کرتا ہوں۔ خبردار اے میری طاقت مجھے دھوکا نہ دینا۔)

تیسرا درجہ صبر ہے۔ اور صبر کی یہ شان ہے کہ "الصبر مفتاح الوصل" (صبر وصل کی کنجی ہے۔) اور ہمارے حضور نے یہ فرمایا ہے کہ "معشوق کی جفا بھی عین وفا ہے۔" اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ "عاشق کو لازم ہے کہ سر کٹ جائے مگر شکایت نہ کرے۔ کیونکہ قاتل بھی غیر نہیں ہے۔" بقول سرمد علیہ الرحمۃ۔

سر جدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود
قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

(اس نے سر کو جسم سے شوخی میں جدا کر دیا کہ وہ ہمارا دوست تھا۔ بات کو ختم کر دیا ورنہ دردِ سر تو بہت تھا۔)

چوتھا درجہ تضرع۔ اور پانچواں درجہ رضا وتسلیم ہے۔ جس کی تعریف یہ ہے کہ ''لان الرضاء من اعلی المقامات '' (رضائے محبوب اعلیٰ مقامات سے ہے۔) اس مقام میں جب صادق عطائے محبوب کو بکمال رضا ورغبت تسلیم ومنظور کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سرکار عالم پناہ نے فرمایا ہے کہ'' عاشق کو چاہئے کہ معشوق کا ایسا فرمانبردار ہو جیسے آقا کا غلام ہوتا ہے۔'' اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ'' عاشق کا منصب یہ ہے کہ معشوق کے آگے سر تسلیم خم رہے۔ جیسے غسال کے ہاتھ میں مردہ بے اختیار رہتا ہے۔'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ'' رضا وتسلیم اہل بیت کے گھر کی چیز ہے ہر شخص کا حصہ نہیں ہے۔''

اور محبت کا مرتبہ پنجم شفقت ہے۔ اور اس کے بھی پانچ درجے ہیں پہلا درجہ مطاوعت اوامر محبوب ہے، دوسرا درجہ محافظت باطن ہے کہ محبّ کے دل میں ماسوائے محبوب کے غیر کا خیال بھی نہ آوے۔ چنانچہ حضور نے اس حالت کی نسبت یہ فرمایا ہے کہ'' عاشق ایک ساعت بھی اگر معشوق کی یاد سے غافل رہے گا تو وہ ساعت اس کے لئے بمنزلہٴ موت کے ہے'' بقول

یک دوست بکن کہ یا ربک دل داری
گر مذہب مرد مان عاقل داری

(اگر تو عقل مند لوگوں کا مذہب رکھتا ہے تو کسی ایک کو محبوب / دوست بنا۔)

تیسرا درجہ معادات اعدائے دوست ہے۔ اور چوتھا درجہ محبت با محبان محبوب ہے۔ پانچواں درجہ اکفائے احوال ہے۔ جو محبّ اور محبوب کے درمیان واقع ہوں۔ چنانچہ حضرت شبلی علیہ الرحمتہ کا قول ہے کہ'' المحبت کتمان الاحوال '' (محبت

اپنے حالات کا چھپانا اور راز رکھنا ہے۔) اور اسی مسئلہ کو ہمارے سرکار عالم پناہ نے یوں فرمایا ہے کہ معشوق کی عطا ہو یا جفاء عاشق کے لئے راز ہے۔'' بقول

میاں عاشق و معشوق رمزیست

کراماً کاتبین راہم خبر نیست

(عاشق اور معشوق کے درمیان ایسے ایسے راز ہوتے ہیں کہ کراماً کاتبین کو بھی ان کی خبر نہیں ہوتی۔)

اور محبت کا مرتبہ ششم خلت ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ'' والخلة ماخوذ من التخلية القلب عما سواى المحبوب ''(اور خلت یہ ہے کہ محبوب کے سوا ہر شے سے دل کا خالی ہو جانا) اور صاحب عوارف المعارف کا قول ہے کہ'' كاس لها وهج اذا استقر فی الحواس و سكن فی النفوس تلاشت۔'' کہ اس جام میں ایسی گرمی ہے کہ اگر حواس ونفس میں اس کا اثر ہو جائے تو ہستی کو مٹائے اپنے رنگ دیتی ہے۔ اور اس کے بھی پانچ درجے ہیں۔ پہلا درجہ معاندت ہے کہ محبّ صادق اظہار حال سے اندیشہ کرتا ہے۔ دوسرا درجہ صدق ہے۔ اس صدق کی تعریف بعض عاشقین نے یہ فرمائی ہے'' مرأة الصدق فی السر و العلانية يوجب المحبته ''(صدق کا آئینہ ظاہر اور پوشیدہ محبت کیلئے واجب ہے۔) اور بعض نے فرمایا ہے کہ'' المحبت صدق و الصادق حبيب الله ''(محبت سچائی ہے اور سچا اللہ کا دوست ہوتا ہے۔) اور ہمارے حضور نے فرمایا ہے کہ'' بام حقیقت کی کمند محبت صادق ہے۔'' تیسرا درجہ اشتہار و شہرت ہے کہ محبّ حالت بےخودی میں خمول و شہرت کا فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ اور آفات و صدمات میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس حالت کی نسبت

ہمارے سرکار عالم پناہ نے یہ فرمایا ہے کہ ''منصور کی بے تابی نے منصور کو دار پر چڑھایا۔'' چوتھا درجہ شکوہ ہے۔اس مقام کے متعلق حضور نے فرمایا ہے کہ ''کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عاشق شکایتیں کرتا ہے اور معشوق سنتا ہے۔'' پانچواں درجہ حزن ہے لیکن عاشق غمگین اس حزن واندوہ میں بھی شاداں وفرحاں رہتا ہے۔اور معشوق سے مخاطب ہوکر کہتا ہے ۔

جز عشق تو عیشہا فراموشم باد

حزن تو بجائے جاں در آغوشم باد

(تیرے عشق کے سوا میں عیش کو ہمیشہ کیلئے بھول جاؤں۔تیرا غم بجائے جان کے میری آغوش میں ہمیشہ ہو۔)

اور مرتبہ ہفتم کا نام محبت ہے جس کی نسبت ہمارے سرکار عالم پناہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''محبت بھی اک راز ہے خدا کا۔'' یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ''فرشتوں کو محبت جزوی ملی ہے اور انسان کو محبت کامل دی گئی ہے۔'' یہ بھی فرمایا ہے کہ ''محبت کی حقیقت تحریر اور تقریر میں نہیں آسکتی۔'' یہ بھی ارشاد ہوا ہے ''جن کو محبت صادق ہے وہ خاموش رہتے ہیں۔'' بقول ''من عرف اللّٰہ احبہ و من عرفه کل لسانه'' (جو اللہ کو پہچانتا ہے وہی اللہ سے محبت کرتا ہے۔اور جو اللہ کو پہچان لیتا ہے اس کی زبان گونگی ہو جاتی ہے۔) اور یہ بھی پانچ درجوں پر منقسم ہے۔ پہلا درجہ اس کا حسن اخلاق ہے۔اس حالت میں محبّ کے حرکات وسکنات نہایت محمود اور مستحسن ہوتے ہیں۔لیکن ماسوائے محبوب موجودات عالم سے متوحش اور متنفر رہتا ہے۔ بقول ۔

بروئیش تا نظر کردم دل از کونین بر کندم

بریدم از ہمہ عالم چو شد با دوست پیوندم

(جب سے میں نے محبت سے اس کے چہرے کو دیکھا ہے تو میں نے دل دونوں جہانوں سے ہٹا لیا ہے۔ جب سے دوست سے میرا وصل ہوا میں نے تمام جہانوں سے قطع تعلق کر لیا ہے۔)

دوسرا درجہ ملامت بہ اظہار سکر و حیرت ہے کہ محبّ زلال محبت سے مدہوش ہوتا ہے۔ ملامت کا خطرہ نہ رسوائی کا اندیشہ۔ دیوانہ وار سر در خرابات رہتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

عشق تو مرا یار خراباتی کرد
ور نہ من بے چارہ بہ ساماں بودم

(اے میرے دوست تیرے عشق نے مجھے شرابی بنا دیا ہے۔ ورنہ میں بے چارہ ساز و سامان والا امیر کبیر تھا۔)

لیکن خیال محبوب سے مسرور اور تابع حکم مطلوب ضرور رہتا ہے۔ کیونکہ جب صعوبات ملامت اور صدمات فرقت برداشت کرتا ہے، تب جوار دلدار کی سیر نصیب ہوتی ہے۔ بقول۔

اے دل بہ ہوس بر سر کارے نرسی
تا غم نخوری بہ غم گسارے نرسی
چوں شانہ بز یراره تا تن نہ نہی
ہرگز بسر زلف نگارے نرسی

(اے دل فقط خواہش کے ساتھ تو کسی کام کے انجام تک نہیں پہنچ پائے گا۔ جب تک تو

غم نہیں پائے گا تجھے غم گسار نہیں ملے گا۔ کنگھی کی طرح جب آری کے نیچے جب تک تو اپنا جسم نہیں رکھے گا تو محبوب کی زلف تک نہیں پہنچے گا۔)

اس حالت کی نسبت ہمارے حضور نے یہ فرمایا ہے ''عاشق نہ تعریف سے خوش ہوتا ہے نہ ملامت سے رنجیدہ۔'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''یار کا تصور عاشق کی زندگی ہے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''ایک زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ عاشق نہ ہجر کی شکایت کرتا ہے نہ وصل کی حکایت۔'' بقول ۔

در وصل جمالش گل خندان منست

در ہجر خیالش دل و ایمان منست

(محبوب کے حسن کے وصل میں میرا من پھول کی طرح کھلا جاتا ہے۔ میرا دل اور ایمان اس کے ہجر کے خیال کے ساتھ وابستہ ہے۔)

تیسرا درجہ مشاہدات غیب ہے کہ محبّ صادق کو دولت مکاشفہ نصیب ہوتی ہے اور دل اسرار معرفت سے بہرہ ور اور انوار محبت سے منور ہوتا ہے۔ چوتھا درجہ آرزوئے ملاقات ہے۔ پانچواں درجہ استیناس ہے کہ محبّ طلب انس کا اظہار اور التماس لقا کی تکرار کرتا ہے۔ اور استیناس کی تعریف یہ ہے ''ومن علامة الموانست بالحبیب والتوحش من غیرہ ''(دوست کے ساتھ موانست اختیار کرنا عشق کی علامت ہے اور اس کے علاوہ سب کچھ وحشت ہے۔) اور بعض حضرات نے فرمایا ''علامة الا ستیناس مراقبة المحبوب فی کل حال '' (ہر حال میں محبوب کی طرف دلی توجہ ہونا اس کے ساتھ انس کی علامت ہے۔) بقول

مرا تو مونس جانی وجاناں

ندیدم روئے تو دیوانہ گشتم

(تو ہی میرے دل و جان کا مونس ہے۔ اگر میں تیرے چہرے کا نہ دیکھوں تو میں مجنون و دیوانہ بن جاؤں۔)

مرتبہ ہشتم عشق ہے ''والعشق عبارة من افراط المحبة و شدتها۔'' (عشق محبت کی کثرت اور شدت سے عبارت ہے۔) بقول۔

کتاب حسن تو روزے قضا میخواند در گوشم
شدم از خویش بیگانہ تر عقلم ماند نے ہوشم

(اے میرے محبوب تیرے حسن کی بات میرے کانوں میں موت کا پیغام ہے۔ میں اپنے آپ سے بے گانہ ہو جاتا ہوں۔ نہ میری عقل باقی رہتی ہے نہ مجھے کچھ ہوش باقی رہتا ہے۔)

اور ہمارے حضور نے یہ فرمایا ہے کہ ''عشق میں کوئی غیر بھی نہیں اور بجز یار کسی سے سروکار بھی نہیں رہتا۔'' یہ بھی فرمایا کہ ''عاشق کا ایمان رضائے یار ہے'' یہ بھی فرمایا ہے کہ ''عشق میں انتظام نہیں۔'' یہ بھی فرمایا ہے کہ ''عاشق دین و دنیا سے بے کار ہو جاتا ہے۔'' بقول مولانا علیہ الرحمۃ۔

تا بدانی ہر کہ رایزداں بخواند   از ہمہ کار جہاں بے کار ماند
ہر کہ رابا شد زیزداں کاروبار   بار آنجا یافت بیروں شد زکار

(تو جان لے کہ جو شخص ہر کسی کو خدا کہتا ہے تو وہ دنیا کے ہر کام سے بے کار ہو جاتا ہے۔ اور جو اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیتا ہے تو وہ باقی سب کچھ بوجھ محسوس کرتا ہے اور ہر کام سے فارغ ہو جاتا ہے۔)

اور حضرات صوفیہ کرام نے بالاتفاق یہ بھی فرمایا ہے کہ عشق عنایت رب العزت اور عین موہبت ہے۔اور اس مرتبہ کے بھی پانچ درجے ہیں۔ پہلا درجہ فقدان دل ہے جس کا کلیہ یہ ہے''ومن لیس مفقود القلب لیس بعاشق۔'' (جو مفقود القلب نہیں وہ عاشق نہیں۔) چنانچہ حضور کا ارشاد ہے''جس کو اپنے دل کی خبر ہے وہ عشق سے بے خبر ہے۔'' اور اس کو یوں بھی فرمایا ہے کہ عاشق یار سے خبردار اور موجودات سے بے خبر رہتا ہے۔''بقول۔

ہر کہ گفت من خبرے دارم از حقیقت عشق
دروغ گفت گر از خویشتن خبر دارد

(جو شخص یہ بات کہتا ہے کہ میں عشق کی حقیقت سے واقف ہوں تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کی خبر رکھتا ہے تو اس نے جھوٹ کہا۔)

عاشقان صادق جب کوچۂ عشق میں قدم دھرتے اور طلب محبوب کا دم بھرتے ہیں، تو پہلے بہزار عجز و نیاز رونمائی میں نقد دل نذر کرتے ہیں اور خودی سے بیخود اور موجودات سے دست بردار ہو کر زبان حال سے عرض کرتے ہیں۔

زدلم نشاں چہ خواہی کہ زدل خبر ندارم
تو بگو کہ دل چہ باشد من از و اثر ندارم

(تو میرے دل کے متعلق کیا نشان چاہتا ہے کہ دل کے بارے میں مجھے کوئی خبر نہیں ہے۔تو خود ہی بتا کہ وہ دل کیا ہوگا کہ جس کے بارے میں تو کوئی نشان نہیں پاتا۔)

بلکہ منقول ہے کہ حضرت ذوالنون مصری علیہ الرحمتہ سے کسی نے سوال کیا ''عن العاشق الصادق فقال اذا رایت رجلا معصفر الوجہ مفقود القلب

مغلوب العقل شدید البکاء طالب الموت والفناء ومع ذالک مراعی الادب متفقد الاوقات فھو العاشق۔'' (سچا عاشق کون ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا جب تو کسی ایسے آدمی کو دیکھے جس کا چہرہ زرد ہو، جس نے دل کو قربان کر دیا ہو، جس کی عقل مغلوب ہو، جو سخت آہ و بقا کرنے والا ہو، جو موت اور فنا کا طالب ہو اور اس سب کچھ کے باوجود آداب کو ملحوظ خاطر رکھنے والا ہو اور وقت کو یادِ محبوب میں لگانے والا ہو، وہ عاشق ہے۔) بقول

چہ می پرسی زمن حال دل غمدیدہ ات چوں شد
دلم خوں گشت خوں شد آب، آب از چشم بیروں شد

(تو کیا پوچھتا ہے میرے دلِ غمگین کے بارے میں کہ وہ کیا ہے؟ میرا دل خون ہو گیا ہے، خون پانی بن گیا ہے اور پانی آنکھوں سے آنسو بن کر رواں دواں ہے۔)

دوسرا درجہ تأسف ہے کہ عاشق غمگین فراق معشوق میں اپنی زندگی پر افسوس کرتا ہے، تیسرا درجہ وجد ہے۔ یہ حالت واردات قلبی میں سے ہے۔ اس رفیع المرتبہ کیفیت کی تصریح نہ تحریر میں آسکتی ہے نہ تقریر سے ادا ہو سکتی ہے۔ بجز اس کے ''ذوق ایں می نہ شناسی بخدا تانہ چشی۔'' (عشق کا سواد تو نہیں پہچانے گا جب تک تو یہ خود نہیں چکھے گا۔) چوتھا درجہ بے صبری ہے اس مقام میں عاشق دل فگار کے قلب میں اضطرار ہوتا ہے۔ اور اشتیاق دیدار میں عیش و آرام سے دست بردار ہو کر جستجوئے یار میں پروانہ وار جاں نثار کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور جوش و خروش میں اپنی حالت زار کا اظہار کرتا ہے۔ بقول

تابود مرا طاقت بودم بشکیبائی

چوں کار بجاں آمد اکنوں من و رسوائی

سر پنجۂ صبرم راہ پیچید و بروں شد دل

اے صبر ہمیں بودت بازوئے توانائی

(جب تک مجھے طاقت رہی تو میں صبر کرتا رہا۔ جب معاملہ جان تک پہنچا تو اب میں ذلیل و رسوا ہوں۔ میرے پائے صبر و استقلال نے راستہ طے کیا۔ میں دل ہار بیٹھا۔ اب اے صبر میری توانائی تیرے ہی بازوؤں سے ہے۔)

پانچواں درجہ صبابت یعنی وفور شورش عشق سے بے خودی ہے۔ اس حالت میں عاشق فرط اشتیاق سے مدہوش رہتا ہے۔ غلبۂ عشق اور جوش بے خودی میں علی الدوام نالاں و مجنوں وار کوہ و بیاباں میں بے سروساماں پریشاں پھرتا ہے۔ بجز ذکر محبوب و نام مطلوب موجودات سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ بقول ؎

زانہا کہ خواندہ ام ہمہ از یاد ما برفت

الا حدیث دوست کہ تکرار می کنم

(میں نے جو کچھ پڑھا ہے وہ تمام میری یاد سے مٹ گیا ہے۔ مگر دوست کی بات ہی باقی رہ گئی ہے کہ جو میں بار بار بیان کرتا ہوں۔)

مرتبہ نہم تیئم یعنی رقبت ہے۔ اس مقام میں عاشق جاں باز پر اطاعت و بندگی میں عجز و نیاز اور مجبوری و بے چارگی کی حالت طاری ہوتی ہے۔ اور اس مرتبہ کے بھی پانچ درجے ہیں۔ پہلا درجہ تفرد ہے کہ عاشق خودی سے بے خود اور اغیار سے بیزار اور موجودات عالم سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ اور اس کو مرتبہ اتحاد کا حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے حضور نے فرمایا ہے کہ ”عاشق جب سب کو چھوڑتا ہے تو یار سے ملتا

ہے۔'' دوسرا درجہ استتار کا ہے کہ عاشق کتمان و اخفا کی جانب مائل ہوتا ہے۔ تیسرا درجہ بذل روح یعنی ایثار جان ہے۔ چنانچہ سرکار عالم پناہ کا ارشاد ہے کہ ''عاشق سر دیتا ہے تب مہم سر ہوتی ہے۔'' بقول

از من گماں مبر کہ دل از دوست برکنم
تا جاں دریں تن است دم از عشق میزنم
گر بشنوی کہ قافلۂ مرد ز غمت
اوّل کسے کہ جان دہد از بہر تو منم

(میرے بارے میں یہ گمان نہ کر میں دل اپنے دوست کی یاد سے کبھی جدا کروں گا۔ جب تک اس جسم میں جان ہے تو میں عشق میں ہی سانس لیتا رہوں گا۔ اگر تو سنے کہ قافلۂ عشاق تیرے غم کی وجہ سے فوت ہوگیا ہے تو سب سے پہلا جان نثار کرنے والا میں ہی ہوں گا۔)

چوتھا و پانچواں درجہ خوف و رجا ہے کہ عاشق کبھی خوف ہجر سے لرزاں اور کبھی امید وصل میں شاداں رہتا ہے۔ اور زبان حال سے کہتا ہے۔ بقول

ز جاں دادن نمی ترسم من ای جاں
ازاں ترسم کہ از تو دور مانم

(اے میرے محبوب! میں جان دینے سے نہیں ڈرتا ہوں۔ بلکہ تجھ سے دوری کے ڈر سے ترساں و لرزاں ہوں۔ کہ جان تیرے قدموں میں نہیں دے پا رہا۔)

مرتبہ دہم والہی یعنی سرگشتگی و حیرانی و بے خودی کی حالت میں غایت شیفتگی ہے۔ اس مقام میں عشاق کو خطرۂ عظیم درپیش رہتا ہے۔ کبھی دید جمال محبوب کے

خواہاں کبھی جلال مطلوب سے لرزاں کبھی خوف فردانیت سے دہشت کبھی رعب احدیت سے حیرت میں رہتے ہیں۔اوراس مرتبہ کے پانچ درجے ہیں۔ پہلا درجہ سوال ہے کہ عاشق طلب محبوب کے لئے محبوب ہی سے سوال کرتا ہے۔ یہ بھی چند نوع پر منقسم ہے۔بعض عشاق ظاہری الفاظ وعبارت میں معشوق سے طلب معشوق کے لئے سوال کرتے ہیں۔بعض کی برجوع قلب زبان مستور سے عرضداشت ہوتی ہے بعض خواہش محبوب کوتسلیم کرتے اور عطائے مطلوب پر راضی رہتے ہیں۔بعض معشوق کواپنے واسطے چاہتے ہیں۔اوربعض کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہم معشوق کے ہو جائیں۔لیکن عاشق کا سوال کسی نوع سے کیوں نہ ہو۔مگر مفہوم اس کا سوائے طلب محبوب اور کچھ نہیں ہوتا۔کیونکہ عاشق کا معشوق سے بھی سوائے طلب معشوق سوال کرنا مسلک عشق کے منافی ہے۔جیسا کہ حضور نے فرمایا ہے کہ ''خدا سے بھی نہ مانگو'' دوسرا درجہ لشرب شراب سلسبیل عشق ہے۔اس واردات قلبی کے اثر سے عشاق کے طریق و مقاصد، مدارج ومراتب مختلف ہوتے ہیں بعض عشاق یہ شراب جام اشتیاق میں پیتے ہیں۔بعض ساغرحزن واندوہ میں نوش فرماتے ہیں۔بعض یہ شراب قلق واضطراب کے پیالہ میں استعمال کرتے ہیں۔بعض جام خوف میں بعض ساغر رجا میں بعض کاسۂ درد میں اس شراب کو پیتے ہیں۔ بقول ؎

شراب دردمی نوشم زہجرت
نباشد ہیچ خوشتر زیں شرابے

(تیرے فراق میں میں ہرلحہ شرابِ درد پیتاہوں۔مگرایسی شراب کہ جس سے کوئی خوشی کم ترنہیں ہے۔)

تیسرا درجہ سکر ہے۔ اس مقام میں عشاق مدہوش و متحیر ہوتے ہیں۔ چوتھا درجہ اضطراب ہے کہ عشاق آلام ہجر سے بے چین رہتے ہیں۔ کیونکہ علیل عشق کی شفاء لقائے خلیل ہے چنانچہ عارفین کا مقولہ ہے کہ ''طبیبی ذکر حبیبی۔'' (میری خوشی، میرا علاج میرے محبوب کے ذکر میں ہے۔) پانچواں درجہ تلف یعنی ایثار ہستی خود ہے۔ ہر چند اکثر حضرات کا خیال ہے کہ بعد مرگ عشاق کو راحت نصیب ہوتی ہے لیکن نہیں۔ معتبر قول یہ ہے کہ بعد مردن بھی عشق کا ناسور مندمل نہیں ہوتا بلکہ کسی حالت میں عشاق کے درد و اندوہ میں افاقہ نہیں۔ خصوصاً مرگ ظاہری کے بعد قلق و اضطراب میں ترقی ہوتی ہے۔ کیونکہ محل عشق دل ہے اور مسکن غم بھی دل ہے۔ اور دل کو موت نہیں۔ وہ باقی بہ لقاء اللہ ہے۔ پس جب مرغ روح قفس تن سے آزاد ہو کر فضائے طلب محبوب میں پرواز کرتا ہے۔ اس وقت عشق بالائے عشق اور شوق بالائے شوق ہوتا ہے۔ اور بعض نے فرمایا ہے کہ یہ صورت بھی عام عاشقین کے واسطے ہے۔ عاشقان صادق کے لئے یہ تغیر بھی تنقیص میں داخل ہے۔ چنانچہ ہمارے سرکار عالم پناہ نے فرمایا ہے کہ ''جن کا عشق کامل ہے ان کا شوق و جوش، حیات و ممات، وصال و فراق میں یکساں رہتا ہے۔'' نہ اس کے لئے ترقی ہے نہ تنزل، بلکہ وہ از دیاد و نقصان سے منزہ ہوتا ہے۔'' جیسا کہ سیدنا و مولانا اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ ''لو کشف الغطاء ما ازدوت یقینا۔'' (اگر پردہ اُٹھ بھی جائے تو میرے یقین میں اضافہ نہ ہوگا۔) واقعی عشاق کامل کا ذوق و شوق مقام مشاہدہ میں بھی قصور و فتور سے مبرا رہتا ہے۔ نہ وصل سے مسرور نہ ہجر سے رنجور ہوتے ہیں۔ بلکہ قرب و دوری کے فرق و امتیاز سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ بقول ؎

عاشق یارم مرا با کفر و با ایماں چہ کار
تشنۂ دردم مرا با وصل و با ہجراں چہ کار

(میں اپنے یار کا عاشق ہوں۔ مجھے کفر و ایمان سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں درد کا پیاسا ہوں مجھے وصل وفراق سے کیا کام۔)

اسی مقام میں عاشق کو درجہ فنا کا حاصل ہوتا ہے۔ اور پھر مرتبۂ فنا فی الفنا سے فائز ہو کر بقاء اندی وحیات سرمدی نصیب ہوتی ہے۔ بقول ؎

تا مرد ز خود فانی مطلق نشود — اثبات نفی او محقق نشود
از خویش بروں آئی کہ تا او تو شوی — ورنہ بگزاف آدمی حق نشود

(جب تک آدمی اپنے آپ سے فنا نہیں ہوتا تب تک نفی کا اثبات ثابت نہیں ہوتا۔ اپنے آپ سے باہر آجا تاکہ وہ تو ہو جائے۔ علاوہ ازیں انسان فقط لاف زنی کرنے والا ہے۔)

الغرض احاطۂ تحریر و تقریر میں حکایت عشق و محبت کی گنجائش نہیں۔ اس کی تشریح و تصریح میں ہمارا فہم وادراک قاصر و مجبور ہے۔ بقول ؎

قلم بشکن ورق سوز و سیاہی ریز ودم درکش
حمیدؔ ایں قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ دے، کاغذ جلا دے، سیاہی گرا دے اور سانس بند کر لے۔ اے حمیدؔ! یہ عشق کا قصہ ہے جو کسی کتاب یا دفتر میں نہیں سما سکتا۔)

لہٰذا حضرات صوفیہ کرام نے محبت کے اقسام بقدر یافت اور بلحاظ استعداد تحریر فرمائے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محبت کے مدارج و مراتب محدود و محصور نہیں

کیونکہ مقام محبت تقریب الی اللہ میں جملہ مقامات سے افضل و برتر ہے۔ چنانچہ حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰت والتسلیم نے فرمایا ہے"من احب لقاء اللّٰہ احب اللّٰہ لقائہ ۔"(جوشخص اللہ کی ملاقات کی چاہت رکھتا ہے اللہ بھی اس سے ملاقات پسند کرتا ہے۔)اورامام العارفین حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا قول ہے"من عرف اللّٰہ احبہ و العارف لا یحب الا اللّٰہ ۔"(جواللہ کی پہچان رکھتا ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے۔اور عارف اللہ کے سوااور کسی سے محبت نہیں کرتا۔)

بلکہ تمامی مقامات سلوک سے وابستہ اور جزئیات محبت میں داخل ہیں۔جیسا کہ حضرت نصیرالدین محمود روشن چراغ دہلی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:۔"دریں باب نصوص واخبار وآثار محصور نیست، چہ مقام محبت عالی ترین وفاضل ترین منازل سلوک و ہر مقامے کہ پیش از دست مقدمات اوست۔ وہر چہ بعد اوست لواحق ومتمات او۔" (اس باب میں نصوص، اخبار اور آثار کا شمار نہیں ہوسکتا۔کیونکہ محبت کا مقام بہت بلند ہے۔اور سلوک کی منازل میں بہت زیادہ فضیلت رکھنے والا ہے۔اور ہر مقام جو اس کے بعد پیش آئے گا اسی کے مقدمات سے ہے۔اور جو عشق کے اختیار کرنے کے بعد اس کے مقدمات کے لواحق ہیں اور وہ اس کو مکمل کرنے والے ہیں۔) لیکن محبت کی ماہیت اور حقیقت کا اظہار ناممکن اور دشوار ہے۔ بقول

المحبۃ امرھا عجب

تلقی علیک وما لھا سبب

(محبت ایک ایسی عجیب شے ہے کہ جس کا کوئی سبب نہیں۔)

جملہ حضرات صوفیہ کرام نے اس مقام پر سکوت فرمایا ہے۔اور حقیقت محبت

کے لئے قطعی تصفیہ نہیں کیا۔ بعض کا قول ہے کہ عشق صفات حق میں سے ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ عشق اسرار الٰہی ہے۔ بعض نے عشق کو عین ذات فرمایا ہے۔ اس لئے حقیقت عشق ومحبت کی شرح امکان بشری سے باہر ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا روم علیہ الرحمتہ جن کو مذہب عشق کا امام یا مجتہد کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے بھی حقیقت عشق کی شرح میں عجز کا اعتراف کیا۔ اور علم وعقل کو قاصر کہا ہے۔ اور فرمایا ہے

چوں قلم اندر نوشتن می شتافت چوں بعشق آمد قلم برخود شگافت
چوں سخن در وصف ایں حالت رسید ہم قلم بشکست وہم کاغذ درید
عقل در شرحش چو خر در گل بخفت شرح عشق و عاشقی ہم عشق گفت

(قلم لکھنے میں تیزی کرتا ہے۔ لیکن جب عشق کی کوئی بات آتی ہے تو قلم خود بخود پھٹ جاتا ہے۔ جب بات اس حالت کے وصف پہ پہنچتی ہے تو قلم ٹوٹ جاتا ہے اور کاغذ بھی پھٹ جاتا ہے۔ عقل عشق کی شرح یوں کرتی ہے جیسے گدھا پھول کے ساتھ خفا رہتا ہے۔ عشق اور عاشقی کی شرح عشق بذاتِ خود بیان کرتا ہے۔)

حضرت مولانا کے اس ارشاد سے ثابت ہوگیا کہ حقیقت عشق ومحبت کا اظہار قطعی ناممکن اور دشوار ہے۔ کیونکہ تذکرۂ عشق و عاشقی ایسا پراسرار ہے جہاں عقل بے سود اور علم بے کار ہوتا ہے۔ بلکہ عقل انسان کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ''چو خر در گل بخفت۔'' (جیسے گدھا پھول سے خفا رہتا ہے۔)

پس جس طرح حقیقت روح سے ہم ناواقف ہیں۔ اسی طرح ماہیت عشق و محبت کی شرح میں مجبور ہیں۔ ان دونوں کی اصل وحقیقت حجاب اسرار میں چشم خلائق سے مخفی وپوشیدہ ہے۔ جیسا کہ حضرت مولانا فرماتے ہیں۔ مصرع

عشق و جان ہر دو نہا نند دستیر

(عشق اور جان دونوں آپس میں جنگ کرتے ہیں۔)

غرض عشق و محبت کے اسباب حقیقی او اسرار باطنی کی شرح تو یقینی محال اور حدا مکان سے باہر ہے۔لیکن علامات عشق و آثار محبت کی تصریح اس وجہ سے ممکن ہے کہ عاشقان صادق محبان واثق نے اپنے اپنے مراتب و مدارج کے لحاظ سے عشق و محبت کی ظاہری نشانیاں مجملاً بیان فرمائی ہیں۔مگر اس میں بھی کافی اختلاف ہے۔لیکن تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف علامات محبت کی افراط و بہتات کی دلیل ہے۔اس لئے کہ جب تسلیم ہو چکا کہ محبت انعام وہبی ہے۔اور اس کا تعلق قلب سے ہے۔اور واردات قلبی محبّ کی حیثیت و اہلیت کی مناسبت سے مختلف اور جدا گانہ شان رکھتے ہیں۔اسی وجہ سے عاشقان صادق اور کشتگان محبت نے اپنی یافت اور حالت کے اعتبار سے آثار و محبت بیان کئے ہیں۔ پس جملہ محبان ذی اختصاص کی تحقیق بجائے خود صحیح اور درست ہے۔اہل محبت کے ظاہری آثار اور نشانات مجمل طور پر تو اکثر حضرات نے بیان فرمائے ہیں۔مثلاً حافظ شیراز علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

روئے زردست و آہ درد آلود

عاشقان را گواہ رنجوری

(زرد چہرہ اور درد آلود آہ، یہ عاشقوں کے دکھ کے گواہ ہیں۔)

اور عارف باللہ حضرت شرف الدین بو علی شاہ قلندر نے فرمایا۔

عاشقاں راشش نشانست اے پسر

آہ سرد و رنگ زرد و چشم تر

گر ترا پرسند سہ دیگر کدام
کم خور و کم گفتن و خفتن حرام

(اے لڑکے عاشقوں کے چھ نشان ہیں۔ان کی دردآلود آہ سرد ہوتی ہے،ان کا رنگ زرد ہوتا ہے اوران کی آنکھیں تر ہوتی ہیں۔اگر تم سے کوئی پوچھے کہ دیگر تین نشانیاں کون سی ہیں تو بتانا کہ تھوڑا کھانا،کم بات کرنا اور نیند کا ختم ہو جانا۔)

اور بعض عارفین نے آثارات محبت کا ذکر وضاحت کے ساتھ بھی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمتہ نے اپنے رسالہ عوارف میں لکھا ہے کہ محبّ صادق کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کا قلب دنیاوآخرت کی لوث محبت سے پاک ہو۔جیسا حضرت داؤد علیہ السلام سے جناب باری عزاسمہ نے فرمایا تھا کہ ''یا داؤد انی حرمت علے القلوب ان یدخلھا حبی و حب غیری ''۔ (اے داؤد! میں نے دلوں پر حرام کر دیا ہے کہ ان میں میری محبت بھی داخل ہو اور میرے علاوہ کسی اور کی محبت بھی داخل ہو۔یعنی دونوں اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔) بقول ؎

عشق تو اے حیات جان مذہب وملت منست
قبلۂ ماست کوئے تو کعبہ ماست روئے تو

(اے میری جانِ زیست! تیرا عشق ہی میرے مذہب وملت ہیں۔میرا قبلہ تیری گلی ہے اور میرا کعبہ تیرا رُخ انور ہے۔)

محبّ کی یہ بھی ایک علامت ہے کہ بجز نظارۂ حسن حبیب کسی دیگر حسین کے جمال پر نظر التفات نہ کرے۔اور زبان حال سے کہے ؎

گر چشم بروئے دگرے باز کنم

حق نمک حسن تو کورم سازد

(اگر میں اپنی آنکھ کو کسی دوسرے کی طرف کھولوں یعنی محبوب کے علاوہ کسی اور کے چہرے کو دیکھوں تو تیرے حسن کے نمک کا حق مجھے اندھا کر دے۔)

چنانچہ مولانا علیہ الرحمتہ نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک شخص زن حسینہ کے پیچھے چلا۔ عورت نے پوچھا کہ میرے پیچھے آنے کا سبب کیا ہے؟۔ اس نے کہا کہ میں تیرا عاشق ہوں۔ عورت نے امتحاناً کہا کہ میرے پیچھے میری بہن آتی ہے۔ اور وہ مجھ سے بھی زیادہ حسین ہے۔ وہ ہوسناک اس کے دیکھنے کے واسطے دوسری جانب مخاطب ہوا تو ازراہ توبیخ زن حسینہ نے کہا۔

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی   در بیان و دعوے خود صادقی

پس چرا، برغیر افگندی نظر   ایں بود دعوائے عشق اے بے ہنر

(اے بے وقوف اگر تو واقعتاً عاشق ہے اور تو اپنے دعویٰ و بیان میں سچا ہے تو تو نے غیر کی جانب نظر کیوں کی۔ اے بے ہنر یہ دعویٰ عشق غلط ہے۔)

محبت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ محبّ صدمات فراق سے دل برداشتہ اور بہت جفا و جور طلب محبوب سے بے واسطہ نہیں ہوتا، بلکہ طلب اس کی بدستور قائم رہتی ہے۔ بقول۔

آں کہ پامال جفا کردہ چو خاک راہم

خاک می بوسم و عذر کرمش می خواہم

من نہ آنم کہ بجور تو بنالم حاشا

چاکر معتقد و بندۂ دولت خواہم

(اے محبوب! میں نے اس راہِ عشق میں اپنے آپ کو پامال کیا ہے۔ میں اس مٹی کو بوسہ دیتا ہوں۔ اور کرم کا خواستگار ہوں۔ میں ایسا نہیں ہوں کہ تیرے جور و جفا سے روؤں۔ میں تو معتقد نوکر ہوں اور تیری دولتِ حسن کا چاہنے والا ہوں۔)

یہ بھی علامت محبت مستند طریقہ سے منقول ہے کہ وصول محبوب کا جو واسطہ اور ذریعہ ہو محبّ صادق اس کو بھی دوست رکھتا ہے اور اس کی بھی اطاعت کرتا ہے۔ اور اس اطاعت کو عین اطاعت محبوب شمار کرتا ہے۔ بمصداق آیہ وانی ہدایہ ''قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونى يحببكم الله'' (اے حبیب! آپ فرمادیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں اپنا محبوب بنالے گا۔ سورۃ ال عمران:۳۱) اور ''من يطع الرسول فقد اطاع الله'' (جس نے رسول ﷺ کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ ہی کا حکم مانا۔ سورۃ النساء:۸۰) بھی اسی کی دلیل ہے۔

محبت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ راہ وصول محبوب میں اگر زن و فرزند مانع وحارج ہوں تو ان سے پرہیز کرے، اور محبت محبوب میں ثابت قدم رہے۔

ایک علامت یہ ہے کہ محبّ ذکر محبوب میں مشغول و مشغوف رہے۔ جیسا منقول ہے ''من احب شيأً اكثر ذكره'' اور کثرت ذکر محبوب سے خستہ اور ملول نہ ہو۔ بلکہ سماعت ذکر محبوب سے قلب میں بشاشت اور آثار طرب و شگفتگی ظاہر ہوں۔ بقول ؎

فحبك راحتى فى كل حين
و ذكرك مونسى فى كل حال

(پس آپ کی محبت ہر وقت میرے لئے آرام و راحت ہے اور آپ کا ذکر ہر حال میں

میرا ساتھی ہے۔)

محبت کی یہ بھی علامت ہے کہ احکام محبوب کی متالعت میں مخالفت کا قصد بھی نہ کرے۔ چنانچہ حضرت سہل عبداللہ علیہ الرحمتہ کا قول ہے کہ ''المحبة معانقة الطاعة و مبانية الفاقة''(محبت اطاعت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور اس کی بنیاد فاقہ یعنی بھوک یا روزہ ہے۔) اور حضرت رویم قدس سرہ سے کسی پوچھا کہ محبت کس کو کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ''الموافقة فی الجمیع الاحوال''۔(تمام احوال میں محبوب کے مطابق ہونا۔)

یہ بھی ایک علامت ہے کہ محبّ کی اطاعت و ریاضت بخیال رضائے محبوب ہو۔ اور دوسری غرض مقصود نہ ہو۔ جیسا حضرت ابوبکر کتانی کا فرمودہ ہے ''المحبة ایثار المحبوب''(محبت محبوب پر قربان ہوجانے کا نام ہے۔) اور حضرت شبلی علیہ الرحمتہ کا قول ہے ''المحبة ایثار مایحب المحبوب و ان کرهت و کراهة مایکره المحبوب و ان احببت۔''(محبت کیا ہے؟ محبوب جس سے پیار کرتا ہے اس پر قربان ہوجانا۔ اور تو اس چیز کو ناپسند کرے جسے محبوب ناپسند کرتا ہے۔ اگرچہ وہ شے تجھے کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو۔)

صاحب عوارف المعارف نے لکھا ہے کہ آثار محبت میں یہ بھی ہے کہ وصال محبوب اور مشاہدۂ مطلوب سے محبّ کے شوق میں قلت اور اشتیاق میں خفت نہ ہو۔ بلکہ مشاہدہ و مواصلت سے شوق داعی ہل من مزید ہو۔ اور جس قدر تقریب محبوب حاصل ہو اسی قدر شوق و خلق میں ترقی ہو۔ اور محبّ طلب وصول محبوب کا خواستگار رہے۔ کیونکہ جس طرح جمال محبوب کی حد و نہایت نہیں۔ اسی طرح شوق محبّ کی انتہا

اورغایت نہیں۔ بقول

سیر نگشت چشم من از نظر جمال تو

ہست درون جان من ہر نفس خیال تو

(میری آنکھ تیرے جمال کے دیکھنے سے سیر نہیں ہوتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہرلحہ جبکہ میں سانس بھی لوں تو تیرا ہی خیال ہو۔)

اور بعض محققین رموز محبت نے جس طرح آثار وعلامات کی تصریح فرمائی ہے اسی طرح خصوصیات محبت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ محبّ صادق کی خصوصیات میں ایک خاصہ یہ ہے کہ حالت فراق میں محبّ کی قوت متخیلہ صورت محبوب کو قائم کرتی ہے۔ اور یہ نسبت ایسی قوی ہوتی ہے کہ محبّ صورت محبوب سے باتیں کرتا ہے۔ چنانچہ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ۔

جذب صورت آردت در گفتگو　　صورت پیدا کند برباد او

آں چناں کہ یار گوید پیش یار　　راز گوئی پیش صورت صد ہزار

(جب محبوب کا ذکر آتا ہے تو محبوب کی صورت سامنے آجاتی ہے۔ اور جو صورت اس حالتِ ذکر میں سامنے آتی ہے وہی محبّ گفتگو میں بیان کرتا ہے۔ اس صورتِ متخیلہ میں محبوب محبّ سے ہزاروں باتیں راز کی کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک دوست دوسرے دوست سے گفتگو کرتا ہے۔)

اور محبّ کے یہ تخیلات وہمی نہیں بلکہ حقیقی ہوتے ہیں جس کو مولانا فرماتے ہیں کہ جب محبّ کا یہ جذب کامل اور مستقل ہوجاتا ہے تو صورت محبوب بھی اپنے محبّ کی دلجوئی کرتی ہے اور کہتی ہے ۔

پردہارااین زماں برداشتیم

حسن رابےواسطہافراشتیم

(اس وقت یعنی بوقتِ تصور میں پردوں کا اُٹھا دیتا ہوں اور محبوب کے حسن کا بغیر کسی واسطے کے دیدار کرتا ہوں۔)

ایک خاصہ محبِ کامل کا یہ ہے کہ''المحبة عدم النوم و العز لة من القوم ''(محبت نیند کا اُڑ جانا ہےاوردوسرے لوگوں سے علیحدہ ہوجانا ہے۔)یعنی اہل محبت گوشہ گیراورعزلت نشین ہوجاتے ہیں اورخواب کی راحت بھی ان کونصیب نہیں ہوتی۔شب وروز خیال یار میں مضطرو بےقراراورخواب وخور سے بیزاررہتے ہیں۔ تعلقات یگانگت منقطع کر کےزبان حال سے کہتے ہیں ؎

خواب زچشم من بشد چشم توبست خواب من

تاب نماند درتنم زلف تو برد تاب من

(تیری نگاہ نے میری نیند باندھ دی کہ میری نیند میری آنکھوں سے روٹھ گئی۔میرے جسم میں طاقت نہیں رہی کہ تیری زلف نے میری طاقت چھین لی۔)

اورخواجہ سری سقطی قدس سرہ العزیز نے اس بارے میں فرمایا ہے۔

مافی النهار ولافی الیل فرح

فما ابالی اطال اللیل ام قصر

(نہ دن میں اورنہ ہی رات میں مجھےکوئی فرحت حاصل ہے۔اب مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے کہ راتیں لمبی ہوں یا چھوٹی۔)

محبت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ عاشقان الٰہی گناہ کے ضرر سے محفوظ

رہتے ہیں۔ چنانچہ منقول ہے" اذا احب اللّٰہ عبد الم یضرہ ذنبہ "(جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو کوئی گناہ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔یعنی اللہ اپنے بندے کو گناہوں سے بچا لیتا ہے۔) اللہ تبارک وتعالیٰ کی دوستی بندے کو نقصان معصیت سے بچاتی ہے۔

ایک خاصہ محبت کا یہ ہے کہ محبّ صادق کا شیطان بھی دشمن نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے سرکار عالم پناہ نے اکثر فرمایا ہے کہ" جس کو سب شیطان کہتے ہیں اس راہ میں دوست بن جاتا ہے۔" اور اکثر یہ فرمایا ہے کہ" محبت میں شیطان بھی غیر نہیں۔" اور یہ ارشاد ہوا ہے کہ" عاشقوں کے نزدیک شیطان نہیں آتا۔" اور قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر ہے کہ اللہ کے مخصوص بندے شرور شیطانیہ سے محفوظ رہتے ہیں"۔ ان عبادی لیس لک علیھم سلطٰن ۔"(بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا تسلط نہیں ہو سکے گا۔سورۃ بنی اسرآءیل:۶۵)

محبت کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ محبّ ثروت وعسرت کے فرق و امتیاز سے مستغنی اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ سنگ خارا اور لعل بے بہا کو یکساں سمجھتا ہے۔

از شہان گدائے کویت بخدا غنی فزون ست

کہ شمار کردیکساں چہ گہر چہ زر چہ آہن

(تیری گلی کے گداگر اللہ سے تعلق کی وجہ سے بادشاہوں سے بھی فزوں تر ہیں۔لوہا اور موتی اور سونا ان کی نظر میں یکساں ہوتے ہیں۔)

چنانچہ حضرت یحیٰی بن معاذ راضی علیہ الرحمۃ سے کسی نے پوچھا کہ محبت کامل کا خلاصہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا" الفقر عملا و الحزن رطبا۔"(فقر اطاعت

محبوب اور محبوب کے غم میں خوشی کا نام ہے۔) اور حضرت مولانا نے تو عاشق مجازی میں یہ صفت دکھائی ہے۔ اور مجنون کے قصہ میں لکھا ہے ۔

عاشق آں لیلےٰ کو رو کبود ملک و عالم پیش او یک ترہ بود
نزد او یکساں شدہ بر خاک و زر زر چہ باشد کہ نہ بد جاں را خطر

(مجنوں کہ جو لیلیٰ کا عاشق ہے کہ جس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا، بادشاہی اور ملک اس کے سامنے ایک جیسے ہیں۔ اس کی نظر میں مٹی اور سونا یکساں ہیں۔ سونا کیا شے ہے اس کو تو اپنی جان کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔)

محبت کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ محبّ کے رگ و پے میں سمیت عشق کا اثر اس طرح سرایت کرتا ہے کہ کہ اس کا گوشت تلخ اور پرضرر ہو جاتا ہے۔ جس سے درندے بھی حذر کرتے ہیں۔ بقول ۔

کیں شدہ از خوئے حیواں پاک پاک بدز عشق لحم و شحمش زہر ناک
در خورد خود فی المثل دام و دوش زہر گرد و لحم عاشق بکشدش

(یہ جانوروں کی چیر پھاڑ کی عادت سے بھی بچ جاتا ہے۔ عشق کی وجہ سے اس کا گوشت اور چربی زہریلی ہو جاتی ہے۔ جال میں پھنسا ہوا اور مرا ہوا ایک برابر ہیں کہ عاشق کا گوشت اور زہر ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔)

یہ بھی محبت کی خصوصیت میں ہے کہ عشاق گفت و شنید سے پرہیز کرتے ہیں۔ خیال یار میں محو اور خاموش بلکہ ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔ بقول حافظ علیہ الرحمتہ ۔

در حریم عشق نتواں زدم از گفت و شنید
زاں کہ آں جا جملہ اعضا چشم باید بود و گوش

(حریم عشق میں گفت وشنید پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس مقام پر اس کے تمام اعضاء آنکھ اور کان بن جاتے ہیں۔)

یہ بھی خصوصیت محبت میں ہے کہ محبّ کامل وفور استغراق اور جوش محویت کے لحاظ سے قیود ملت اور آداب ظاہری کی پابندی کا مکلف نہیں رہتا۔ جیسا کہ چرواہے کے قصہ میں موسیٰ علیہ السلام سے جناب باری عزاسمہ نے خطاب فرمایا ؎

موسیا آداب دانا دیگر اند — سوختہ جاں رواناں دیگر اند
عاشقاں را ہر نفس سو زید نیست — بردہ ویراں خراج و عشر نیست
گر خطا گوید درا خاطی مگو — درشود پرخوں شہید آں رامشو
ملت عشق از ہمہ دینہا جداست — عاشقاں را مذہب وملت خداست

(اے موسیٰ! دانا عقل مند آدمی کے آداب کچھ اور ہیں اور عاشقوں کے آداب کچھ اور ہیں۔ عاشقوں کیلئے ہر لحہ جلنا ہوتا ہے۔ جس گاؤں میں ویرانی ہو اس پر نہ خراج ہوتا ہے نہ عشر۔ اگر عاشق غلط بات کرتا ہے تو اس کو غلطی کرنے والا نہ کہہ۔ اگر وہ خون سے لتھڑا ہوا شہید ہے تو اسے مت دھو۔ ملت عشق کا دین تمام ادیان سے علیحدہ ہے۔ عاشقوں کیلئے مذہب اور دین خدا ہے۔)

محبت کامل کے خواص میں ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس کو تربیت ظاہری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چونکہ محبت انعام وہبی ہے اس لئے محبّ کامل کی تعلیم استاد موہبت کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ بقول ؎

لعل را گر مہر نبود باک نیست
عشق را دریائے غم غمناک نیست

(لعل میں اگر چمک نہ ہوتو بھی کوئی پرواہ نہیں۔عشق میں غم کا دریا بھی پریشان کن نہیں۔)

محبت کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ محبِّ صادق کا قبلہ حقیقی جمال محبوب ہوتا ہے چنانچہ حضور نے بارہا فرمایا ہے کہ ''عشق میں کفر اسلام ہوجاتا ہے۔'' اور حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندر قدس سرہ نے اپنے رسالۂ روح وعشق میں لکھا ہے کہ تا عاشق صادق را در عالم صورت و در عالم معنی قبلہ بود بجز جمال معشوق در عشق صادق نبود۔ بلکہ باختیار خود روئے بقبلہ آرد مشرک بود۔'' (اس ظاہری جہان میں اور اُس آخری جہان میں عاشق کیلئے معشوق کے حسن کے سوا سچے عشق کے لحاظ سے کوئی شے قبلہ نہیں ہے۔اگر اپنے اختیار سے اپنا رخ قبلہ کی طرف کرے تو مشرک ہو جائے گا۔) اور حضرت شیخ ابوالخیر ابوسعید علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے۔شعر

موضع شادیست ایں یا معدن جود وکرم
قبلۂ ماروئے تست و قبلۂ ہر کس حرم

(یہ خوشی کی جگہ ہے یا جود وکرم کی کان ہے۔ ہمارا قبلہ تیرا رُخ انور ہے۔جبکہ ہرآدمی کا قبلہ حرم ہے۔)

ایک خاصہ عشاق کا یہ بھی ہے کہ اپنی محبوب ترین چیز کو مطلوب پر قربان کرتے ہیں۔ چنانچہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین بدایونی علیہ الرحمتہ کا قول ہے کہ''المحبة ایثار ماتحب لمن تحب ''(محبوب کیلئے اپنی پسند کوقربان کر دینا محبت ہے۔) اور اللہ جل جلالہ کا بھی قرآن پاک میں یہی حکم ہے کہ''لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا مما تحبون ''(سورۃ آل عمران:۹۲) یعنی جب تک اپنی خاص

محبوب چیز کو نہ صرف کرو گے بھلائی کو نہ پہنچو گے۔ حضرات مفسرین نے مماتحبون کی تفسیر میں اختلاف فرمایا ہے بعض کا قول ہے کہ اولاد محبوب ترین چیز ہے بعض نے انسان کی غایت پسندیدگی مال کے ساتھ فرمائی ہے۔ بعض کے نزدیک جان بہت عزیز ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سرکار عالم پناہ کے سامنے اس آیہ پاک کا تذکرہ آیا۔ تو میں نے عرض کیا کہ حضور "مماتحبون" سے کیا مراد ہے؟ فرمایا کہ "جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہو" عرض کیا کہ جان بہت عزیز رہتی ہے۔ ارشاد ہوا کہ "بعض اوقات انسان جان دینا بھی آسانی سے گوارا کر لیتا ہے۔ اس لئے مماتحبون سے انسان کی عافیت مراد ہے جو دائمی ہے اور کسی وقت ناپسند نہیں ہوتی"۔

لہٰذا نظر غائر سے دیکھا جائے تو یہ معنی کس قدر جامع اور مناسب حال ہیں۔ کیونکہ مماتحبون کا اشارہ عاشقان الٰہی کی جانب ہے۔ اور یہ خصوصیت عاشقان صادق کی فراق کے صدمات مہمات اختیار کرتے ہیں۔ اور بکمال صبر و استقلال طلب مطلوب حقیقی میں اپنی راحت و عافیت نثار کرتے ہیں۔ جو ایثار جان سے بہت زیادہ اہم و دشوار ہے۔ کیونکہ روزانہ کی تکلیف نا قابل برداشت ہوتی ہے۔ جیسا کہ مولانا علیہ الرحمتہ نے لکھا ہے کہ حضرت ایازی مجاہد قدس سرہ نے فرمایا کہ میں ستر مرتبہ بہ امید شہادت جہاد میں شریک ہوا لیکن ؎

چوں شہادت روزی جانم نبود — رفتم اندر خلوت و در چلہ زود
در جہاد اکبر افگندم بدن — در ریاضت کردن و لاغر بدن

(جب میری جان کیلئے شہادت کا دن نہ ہوتو میں تنہائی میں اور چلہ میں جلد ہی چلا جاتا ہوں۔ اور پھر میں اپنے بدن کو جہاد اکبر میں مصروف کر لیتا ہوں۔ اس ریاضت کی وجہ

سے میرا جسم لاغر ہو گیا ہے۔)

ناگاہ طبل رزمی کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ جیش غازیاں بجہت غزا روانہ ہوتا ہے۔اس وقت میرے بطون سے نفس نے کہا کہ اے ایازی ہنگام غزا آ گیا ہے۔تم بھی جہاد میں شریک ہو۔

گفتم اے نفس خبیث بے وفا — از کجا میل غزا تو از کجا
نفس بانگ آورد آنگہ از درون — درفصاحت بے دہاں اندر فسون
کہ مرا ہر روز ایں جامی کشی — جان من چوں جان گیراں می کشی
ہیچ کس رانیست از عالم خبر — کہ مرا تو می کشی بے خواب وخور
در غزا بجہم بیک زخم از بدن — خلق بیند مردی و ایثار من
گفت اے سگ چوں منافق زیستی — ہم منافق میری تو چیستی
آں جہاد اصغر است این اکبر است — ہر دو کار رستم ست و حیدرؓ ست

(اے میرے خبیث، بے وفا نفس! جہاد کی خواہش کرنا تیرے لئے کہاں جائز ہے۔ اس وقت میرا نفس اندر سے آواز دیتا ہے۔فصاحت بغیر منہ کے فضول ہے۔کہ مجھ کو تو ہر روز اس جانب متوجہ کرتا ہے۔اے میری جان! جان لینے والوں کی طرح کیوں کھینچتا ہے۔ہر کسی کو جہان کے متعلق کوئی خبر نہیں کہ تو بظاہر کھانے کے اور نیند کے بغیر مجھے کھینچ رہا ہے۔جہاد میں شامل ہوتا ہوں کہ بدن پر ایک زخم بھی ہو جائے تو مخلوق میری مردانگی اور قربانی کو دیکھے گی۔اے کتے تو منافق کی طرح زندگی گزار رہا ہے۔تو منافق کی طرح مرتا ہے۔تو کیا شے ہے۔وہ چھوٹا جہاد ہے اور یہ بڑا جہاد ہے۔یہ دونوں کام یعنی جہاد اصغر رستم اور جہاد اکبر حیدرِ کرارؓ کے ہیں۔)

اس حکایت سے معلوم ہوا کہ تکلیف روزانہ کی برداشت نہایت سخت ودشوار ہےاوراس کے مقابلہ میں جان دینا آسان ہے۔جیسا حضور نے ایثار جان سے ایثار عافیت کومشکل اورافضل فرمایا۔اوردوسرا فائدہ اس حکایت سے یہ نکلتا ہے کہ مولانا علیہ الرحمتہ نے ایثار جان کو جہاد اصغراور کاررستم،اورایثار عافیت کو جہاد اکبراور کار حیدر فرمایا جس سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ ایثار جان سے ایثار عافیت نہایت فائق اور بہتر ہے۔

لیکن حضرات عارفین نے علاوہ دیگر خصوصیات کے محبت کی حیرت انگیز ایک خصوصیت یہ بھی ارقام فرمائی ہے کہ اثر محبت متضاد ہوتا ہے۔اور عالم تعینات میں بلحاظ تعین اثر مختلف شان سے نظر آتا ہے جو کسی کو غمگین وگریاں رکھتا ہےاور کسی کو شاد و فرحان کسی میں نیازمندی کا اظہار ہوتا ہے کسی کو مستغنی اور بے نیاز کر دیتا ہے۔چنانچہ ہمارے حضور نے بھی اسی مفہوم کو یوں فرمایا ہے کہ''محبت کسی کو ہنساتی ہے کسی کو رلاتی ہے۔''اور حضرت مولانا بھی مثنوی کے دفتر سوئم میں اسی مضمون کوارقام فرماتے ہیں۔

لیک میل عاشقاں لاغر کند　　میل معشوقاں خوش و بافر کند
عشق معشوقاں دوزخ افروختہ　　عشق عاشق جان اور اسوختہ
کہر با عاشق بہ شکل بے نیاز　　کاہ می کوشددرآں راہ دراز

(عاشقوں کی رغبت ان کو کمزور کر دیتی ہےاور معشوقوں کی رغبت انہیں خوش اور فربہ بناتی ہے۔معشوقوں کا عشق دوزخ کو روشن کرتا ہےاور عاشق کا عشق اس کی جان کو جلاتا ہے۔معشوق کہربا کے سامنے تنکے کی مانند بے نیازی کے ساتھ عاشق کو اپنی جانب راغب کرتا ہے۔عشق کی طویل راہ میں عاشق عاجز تنکے کی مانند رواں دواں اور کوشاں رہتا ہے۔)

مولانا علیہ الرحمۃ جب عشق کی نیرنگی متقابلہ کا ذکر کر چکے کہ اثر عشق عاشق کو لاغر اور ناتواں معشوق کو خوش و خنداں کرتا ہے۔ اور کہربا میں شان بے نیازی دکھاتا ہے اور گھاس میں نیازمندی کے آثار ہویدا ہوئے ہیں کہ سر تسلیم خم کئے چلی آتی ہے تو پھر محبت کی دوسری عجیب و غریب خاصیت کو بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک ہی حسین کا حسن دیکھنے والوں کے دل میں متضاد اثر پیدا کرتا ہے۔ کوئی نظارۂ جمال سے اس کا شیفتہ اور گرویدہ ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے کسی ناظر کو اسی حسین کے نظارہ حسن سے منظور کے ساتھ قلبی عداوت ہو جاتی ہے۔ اور اپنے اس دعوے کے لئے قطعی دلیل یہ لائے ہیں کہ حسن یوسف علیہ السلام نے متضاد اثر دکھایا کہ حضرت یعقوب علی نبینا علیہ الصلوۃ والسلام تو فریفتہ ہوئے اور برادران یوسف دشمن ہو گئے۔ چنانچہ آپ اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

صورت یوسف چو جامے کرد خوب　　زاں پدر می خورد صد بادہ طروب
بازاخواں رازاں زہر اب بود　　کندر ایشاں زہر کینہ می فزود

(حضرت یوسفؑ جب اچھا لباس پہن کر بن سنور کر سامنے آتے تھے تو ان کے باپ حضرت یعقوبؑ خوشی کی شراب کے سینکڑوں جام پیتے تھے جبکہ ان کے بھائیوں کیلئے وہی حسن زہر تھا۔ ان کے دلوں میں جناب یوسفؑ کی دشمنی کا زہر اور زیادہ بڑھتا تھا۔)

اس کے بعد مولانا محبت کے متضاد اثر کی اور تصریح کرتے ہیں کہ ایک ہی حسین کے اگر چند عشاق ہوں تو اس کے شعلۂ حسن کا متضاد اثر یہ کرشمہ دکھاتا ہے کہ ان کی حالت اور کیفیت میں اختلاف اور مذاق میں تفرقہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حسن یوسف

ہی کی تمثیل دی ہے اور اشعار مذکورہ کے تحت میں فرمایا ہے ۔

باز از وے مر زلیخا را سکر　　　　می کشید از عشق افیون دگر

غیر انچہ بودم یعقوبؑ را　　　　بود از یوسفؑ غذا آں خوب را

(حسن یوسفؑ کو دیکھ کے زلیخا کی مستی اور بڑھتی تھی ۔ اور آپ کے عشق میں زلیخا کا نشہ دوبالا ہو جاتا تھا ۔ لیکن حضرت یعقوبؑ کیلئے حسن یوسف ایک عمدہ غذا تھی ۔)

یعنی یوسف علیہ السلام پر زلیخا بھی شیفتہ تھی اور یعقوب علیہ السلام بھی عاشق تھے مگر حسن کے متضاد اثر سے دونوں کے خیال مختلف اور خواہش جداگانہ تھی کہ زلیخا کے عشق صادق میں خواہش نفسانی کا بھی شائبہ تھا ۔ اور یعقوب علیہ السلام کی محض حقیقت پر نظر تھی چنانچہ مولانا بحرالعلوم اس کی شرح میں لکھتے ہیں : ۔ ''حسن یوسف باز لیخا بوجہے مشہود بود غیر وجہے کہ بہ آں یعقوب رامشہود بود ۔ کہ زلیخا ایں حسین رامتعین می دید لہٰذا از وتلذذ نفسانی می خواست ۔ ویعقوب علیہ السلام رادریں متعین حسن ذات ظاہر با جمیع اسماء وصفات مشہود وعلیہ السلام از وعلوم معارف کہ غذائے روحیست می یافت ۔''

(حسن یوسفؑ زلیخا کیلئے ایک ظاہری وجہ تھی اور حضرت یعقوبؑ کیلئے وجہ اور تھی کہ زلیخا اس حسن کو متعین سمجھتی تھی اور اس سے نفسانی لذات حاصل کرنا چاہتی تھی ۔ اور جناب یعقوبؑ کیلئے اس میں حسن ذاتِ الٰہ مع تمام اسماء وصفات ظاہر تھی ۔ اور وہ اس سے معرفت کے علوم کی روحی غذا حاصل کرتے تھے ۔)

علیٰ ہذا حضرات صوفیہ کرام نے آثارات وخصوصیت محبت کے ساتھ مفاد اور فیوضات محبت بھی بکثرت بیان فرمائے ہیں ۔ اور ہم کو سمجھایا ہے کہ تمامی معاملات اخروی محبت پر منحصر ہیں ۔ کیونکہ محبت ہی ایسی چیز ہے کہ جس کو عقائد سے بھی تعلق

ہے۔اورمحبت ہی عبادت بلکہ ہرعبادت کی روح بھی ہے۔اورمحبت عالم جاودانی کے لئے سرمایۂ ناز بھی ہے۔اورمحبت سے تکمیل ایمان بھی ہوتی ہے۔مختصر یہ کہ محبت بندہ کو خدا سے ملاتی ہے۔

میرے اس بیان کے واسطے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔وہ یہ کہ شریعت اسلام میں پہلا سبق توحید ہے۔اور بزرگان اہل طریقت کا توحید ہی پردارومدار ہے۔ اسی وجہ سے حضرات صوفیہ کرام نے توحید جناب احدیت جل وعلا کی تصدیق کو طالب صادق کے واسطے مقدم فرمایا ہے اور اس کی تحصیل وتکمیل کے لئے تصفیۂ نفس اور تزکیۂ روح کے قواعد نہایت شرح وبسط کے ساتھ ارقام فرمائے ہیں جو بجائے خود بالکل صحیح اور بہت مفید ہیں۔لیکن کامیابی محبت ہی پر موقوف ہے۔اگر محبت الٰہی نہیں تو جملہ کوششیں بے کار ہیں۔اور اگر آتش شوق اور سوز محبت سے سینہ معمور ہے تو شان الوہیت کی تصدیق بھی ضروری ہے۔چنانچہ حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی علیہ الرحمتہ کا قول ہے کہ ’’ہواوہوس کے زائل ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ ہر سانس میں اللہ تعالیٰ کے لقا کی محبت ہو‘‘۔غرض توحید الٰہی کی تصدیق یہی ہے کہ حضرت احدیت عزاسمہ کو ایک جانے انما الھکم اللہ واحد۔(تمہارا معبود،معبودِ یکتا ہی ہے۔سورۃ الکھف :۱۱۰)اورمحبت کا آخری نتیجہ بھی یہی ہے کہ بجز ذات شاہد حقیقی دوسرے کا وجود مفقود ہوجاتا ہے چنانچہ حب کے معنی یہی ہیں کہ محبوب کے ساتھ ایسا قلبی تعلق ہو کہ موجودات عالم سے سروکار نہ رہے۔’’العشق نار یحرق ماسوی المحبوب‘‘۔بقول حضرت مولانا؂

عشق آں شعلہ ست کو چوں برفروخت

ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق ایک ایسا شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو معشوق کے علاوہ باقی تمام اشیاء کوجلا دیتا ہے۔)

نامِ یار وردِ زبان، خیال دلدار تقویت جاں ہو جمیع تعلقات سے فارغ اور بے واسطہ ہو جائے۔ ہستی شاہد حقیقی کے سامنے اپنی ہستی کو مٹائے۔ چنانچہ شیخ اکبر حضرت محی الدین عربی علیہ الرحمتہ نے فرمایا ہے کہ ''محبت انسان کواندھا کر دیتی ہے۔ اور موجودات عالم میں سوائے محبوب کے اس کو کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ اور حقیقت حب تمام اجزائے جسم اور روح میں اس طرح سرایت کرتی ہے کہ محبّ کے گوشت و پوست وعروق میں اس کو اختیار کامل ہو جاتا ہے۔ وہ محبوب ہی کی آواز سنتا ہے۔ اور ہر صورت میں محبوب ہی کو دیکھتا ہے۔ جب محبت اس مرتبہ پر پہنچتی ہے تو اسی کو عشق کہتے ہیں۔ جیسا کہ حسین بن منصور حلاج کے تذکرہ میں ہے کہ جب ان کے ہاتھ اور پاؤں قطع کئے گئے تو ان کے خون سے زمین پر اللہ اللہ لکھ گیا تھا۔'' علی ہذا موحد کامل کی بھی یہی تعریف ہے کہ ۔

چیست توحید خدا آموختن
خویشتن را پیش واحد سوختن
گر ہمیں خواہی کہ بفروزی چو روز
ہستیٔ ہم چوں شب خود را بسوز
ہستیت در ہست ہستی نواز
ہم چو مس در کیمیا اندر گداز

(اللہ کی توحید کیا ہے؟ یہ بات سیکھنا یعنی اللہ کے سامنے اپنے آپ کو جلا دینا ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ تو دن کی طرح روشن ہو جائے تو اپنی ہستی کو جو رات کی طرح سیاہ ہے اسے جلا دے۔ اپنی ہستی کو ہستی دینے والے میں ضم کر دے۔ یعنی اپنی نفی کر دے۔ جیسے تانبا کیمیا گری میں نرم ہو جاتا ہے تا کہ تمہاری ذاتی پہچان ختم ہو جائے۔)

علیٰ ہذا محقق شیخ عبد الحق محدث دہلوی علیہ الرحمتہ بھی کتاب المکاتیب و الرسائل الی ارباب الکمال والفضائل کے تکملہ میں توحید و محبت کی یگانگی کی نسبت ارقام فرماتے ہیں۔ وہو ہذا۔

یحبهم و یحبو نہ چہ گفتار است

بہ زیر پردہ مگر خویش را خریدار است

(وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں یہ کیسی بات ہے۔ پردہ کے پیچھے خود ہی اپنے آپ کا خریدار ہے۔)

از یں جا روشن گشت کہ حاصل توحید غلبۂ محبت و ظہور یگانگی ست کہ در منظر شہود جز محبوب را وجود نماند''۔ (اسی وجہ سے اس جگہ یہ بات واضح ہوئی کہ توحید کا حاصل محبت اور یگانگت کا اظہار ہے کہ سوائے محبوب کے اور کچھ باقی نہ رہے۔)

لہٰذا ہمارے سرکار عالم پناہ نے اپنے غلاموں کو وہ کلیہ ہدایت فرمایا کہ جس کے بغیر تصدیق توحید ناممکن اور محال ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ توحید کے واسطے محبت لازم ہے اور محبت کے واسطے توحید ملزوم ہے۔ جو تکمیل توحید ہے کہ غیر کا وجود مفقود ہو وہی ماسوائے مطلوب سب کو نیست اور نابود کرتا ہے۔ غرض جمیع عقائد کی اصل اور ان کو مضبوط اور مستحکم بنانے والی اگر ہے تو محبت ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں۔

از محبت تلخہا شیریں شود — از محبت مسہا زریں شود

از محبت دُرد ہا صافی شود — وز محبت درد ہا شافی شود

ازمحبت دار تختے می شود — وز محبت بار بختے می شود

از محبت سجن گلشن می شود — وز محبت روضہ گلخن می شود

ازمحبت نار نوری می شود — وز محبت دیو حور می شود

از محبت سنگ روغن می شود — وز محبت موم آہن می شود

از محبت حزن شادی می شود — وز محبت غول ہادی می شود

از محبت سقم صحت می شود — وز محبت قہر رحمت می شود

از محبت مردہ زندہ می شود — وز محبت شاہ بندہ می شود

(محبت سے کڑوی چیزیں میٹھی ہو جاتی ہیں اور تانبا سونا بن جاتا ہے۔ محبت سے میل بھی صاف ہو جاتی ہے اور محبت کی وجہ سے درد بھی شفایاب ہو جاتے ہیں۔ محبت کی وجہ سے سولی بھی تخت بن جاتی ہے اور محبت کی وجہ سے بوجھ بھی خوش قسمتی بن جاتا ہے۔ محبت سے قید خانہ بھی باغ بن جاتا ہے اور محبت سے باغ بھی انگیٹھی بن جاتا ہے۔ محبت سے آگ نور بن جاتی ہے اور محبت میں چڑیل بھی حور بن جاتی ہے۔ محبت سے پتھر روغن بن جاتا ہے اور محبت کی وجہ سے موم لوہا بن جاتا ہے۔ محبت کی وجہ سے غمی خوشی میں بدل جاتی ہے اور محبت میں شیطان بھی راہ دکھانے والا بن جاتا ہے۔ محبت میں بیماری بھی صحت بن جاتی ہے اور محبت سے ظلم اور قہر بھی رحمت بن جاتا ہے۔ محبت سے مردہ زندہ ہو جاتا ہے اور محبت کی وجہ سے بادشاہ غلام بن جاتا ہے۔)

اور اگر محبت کو بہ نظر عبادت دیکھا جائے تو پیشوایان طریقت نے محبت الٰہی کو

عین عبادت بھی فرمایا ہے۔ کیونکہ عبادت یادالٰہی کو کہتے ہیں۔ اور یادمحبوب محبّ کی زندگی ہے"من احب شیأ فقد اکثر ذکرہ ۔"(انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔) پس اگر محبت ہے تو یاد کبریا اور ذکر خدا لازمی ہے ورنہ اسی کا عکس ہوگا اور بظاہر بھی کوئی عبادت ایسی نہیں معلوم ہوتی ہے کہ جس میں محبت کو دخل نہ ہو کسی عبادت میں تکلیف برداشت کرنا ہوتی ہے۔ اگر محبت نہیں تو خوشی سے تکلیف گوارا کرنا محال ہے۔ کسی عبادت میں روپے کا صرف، سفر کی زحمت، اہل و عیال کی مفارقت ہوتی ہے۔ اگر محبت نہیں تو اس کا تحمل دشوار ہے کسی عبادت میں خضوع وخشوع کی شرط ہے۔ مگر بغیر محبت خضوع وخشوع تو ناممکنات سے ہے۔ ہاں محبت ہے تو کوئی ریاضت شاقہ اور کیسا ہی دشوار مجاہدہ کیوں نہ ہو مگر اس کی تعمیل بہ آسانی ہوجاتی ہے۔ بقول

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

آخر یہی کہنا پڑتا ہے کہ لاریب محبت ہر عبادت کی اصل اور عین عبادت ہے چنانچہ حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی علیہ الرحمتہ کا قول ہے کہ جب کہ تم خدا کے بندے ہو اور تمہارے پاس نہ علم ہے نہ عمل تو تمہیں کچھ پرواہ نہیں۔ علم سے وحدانیت کا علم اور عمل سے خدا کی محبت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کافی ہے (طبقات الکبریٰ)

بلکہ محبت ایسی عبادت ہے اور اس عبادت میں وہ خصوصیت ہے جو دوسری عبادت میں نہیں۔ یعنی اور عبادتیں تو ہمیشہ بندہ کرتا ہے اور اللہ جل جلالہ اس کا اجر دیتا

ہے لیکن یہ عبادت ایسی ہے کہ ہم خدا سے محبت کرتے ہیں تو خدا بھی ہم سے محبت کرتا ہے **یحبھم و یحبو نه** علاوہ اس کے غور کیا جائے تو خدا کی محبت مقدم معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ محبت بندہ کی تعریف یہ ہے کہ ذات حضرت احدیت کے ساتھ قلب کو اشغال ہو۔ اور ذات اقدس قلب اور اشتغال قلب سے منزہ ہے۔ لہٰذا اس کی محبت کی تعریف یہ ہے کہ بندہ کو جذب الٰہی اپنی جنابؑ میں کھینچے اور غیر کی جانب متوجہ ہونے سے باز رکھے پس درحقیقت بندہ کی محبت فرع ہے محبت خدا کی۔ کیونکہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی جانب رجوع کرتا ہے تب بندہ کو خدا سے محبت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے سرکار عالم پناہ نے یہ فرمایا ہے کہ ''عشق وہبی ہے۔'' یعنی خدا کی جانب سے ہے۔

علیٰ ہذا ایمان جس کا تعلق قلب سے ہے۔ اور روحانی مدارج میں یہ بہت بڑا مرتبہ ہے مگر یہی محبت اس کو بھی اعلی اور مکمل کرتی ہے۔ اور نقص محبت سے ایمان بھی ناقص رہتا ہے۔ جس کو حضرات اہل طریقت نے ہماری ہدایت کے واسطے بکمال صراحت و وضاحت بیان فرمایا ہے۔ تصوف کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں اس کا ذکر نہ ہو۔ لہٰذا بہ خوف طوالت اقوال صوفیہ کرام کا اعادہ نہیں کرتا ہوں۔ کیونکہ اس بارے میں یہی ایک مستند حدیث کافی ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کے لئے محبت کا بھی ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم نے کہ ''الا لا ایمان لمن لامحبة''۔ یعنی جو میری محبت نہیں رکھتا اس کا ایمان نہیں۔''

اس حدیث سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ ایمان کے واسطے محبت کا ہونا لازمی ہے

لیکن محبت ایمان کو ایمان کامل بناتی ہے۔اس کی بھی تصریح ہو جائے تا کہ پھر کوئی شبہ باقی نہ رہے۔اس لئے ایک اور صحیح حدیث نقل کرتا ہوں جس میں ذکر ایسے مقتدر اور ممتاز شخص کا ہے جس کے ایمان کی خدا نے شہادت دی۔مگر اس محبت نے اس صاحب ایقان کے ایمان کو ایمان کامل بنا دیا۔اور اس حدیث میں غم خوار امت نے جس محبت کی ہدایت فرمائی اس محبت کے اصطلاحی معنی بھی سمجھا دیئے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں انس بن مالک سے منقول ہے کہ ''**قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لایومن احد کم حتیٰ اکون احب الیه من نفسه وماله و ولده والده و الناس اجمعین**''۔یعنی فرمایا رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم نے کہ وہ کامل ایمان میں نہیں ہے جو اپنی جان و مال و اولاد اور والدین اور تمام عالم سے زیادہ مجھ کو محبوب نہیں رکھتا۔

جب حضرت رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے ایمان کامل کے واسطے بایں شرائط محبت کو لازمی فرمایا تو دلدادۂ جمال رسالت یعنی حضرت عمر خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ سچائی بھی یادگار رہے گی کہ فوراً اس طالب صادق نے عرض کیا کہ'' **انت احب الی یارسول الله من کل شیئی الا نفی التی بین جنبی**۔یعنی یارسول اللہ آپ کو بجز اپنی جان کے میں سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں'' **فقال له علیهم الصلوۃ والسلام لاتکون مومنا حتی الکون احب الیک من نفسک**''۔یعنی جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر تمہارا ایمان کامل نہ ہوگا جب تک اپنی جان سے بھی زیادہ مجھ کو محبوب نہ رکھو گے۔

بحیثیت شان رسالت ہدایت تو کر دی مگر شفقت محمدی کو اپنے جاں نثار کا یہ

نقص بھی گوارانہ ہوا۔ فیضان باطنی سے قلب عمر خطاب کاایسا تصفیہ فرمایااوروہ استعداد مرحمت ہوئی کہ آن واحد میں صاحب ایمان کامل بنادیا ''**فقال عمرؓ والذی انزل علیک الکتاب لانت احب الی من نفسی التی بین جنبی** ''یعنی حضرت عمر خطاب نے قسم کھا کرعرض کیا کہ یارسول اللہ میں اب اپنی جان سے زیادہ آپ کو محبوب رکھتا ہوں ''**فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الان یا عمر تم ایمانک** ''پس فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ اے عمر اب تمہاراایمان کامل ہوگیا۔

حضرت خاتم الانبیاء والمرسلین محبوب العالمین سیدنا مولانا ابوالقاسم احمد مجتبےٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے بغیر کسی تعبیر وتاویل کے صاف ظاہر ہوگیا کہ محبت صادق ایمان کوایمان کامل بناتی ہے۔اورایمان بھی معمولی شخص کاایمان نہیں بلکہ ایسے صاحب عظمت وشان کے ایمان کوایمان کامل بنایا جس کے ایمان کے واسطے رسول اللہؐ نے تمنا کے ساتھ دعا کی تھی جس کے ثبات ایمان سے خداراضی ہوا۔ جس کی رائے کے مطابق وحی نازل ہوئی۔انتہا یہ کہ جورسول اللہ کا جانشین ہوااورامیر المومنین کا خطاب پایا۔اس پیشوائے امت محمدی کے اوج ایمان کومحبت نے دوبالا کر دیا۔

اس حدیث سے مراتب ایمان اور مدارج محبت بھی مفصل طور پر معلوم ہوگئے۔اوراس کی بھی تعلیم ہوگئی کہ مرشد کامل کے سامنے اپنے عیب ونقص کا اظہار اس قدر مفید ہے کہ پیشوائے برحق کے فیضان باطنی سے قلب طالب بجائے نقصان کے نورایمان سے معمور ہوجاتا ہے۔

اس حدیث نے اس کی بھی ہدایت کر دی کہ طالب صادق کو تعلقات عالم سے فراغ وانقطاع لازمی ہے۔

یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شاہد حقیقی کو جان سے زیادہ عزیز رکھنا ضروری ہے یعنی طالب صادق کو چاہئے کہ راہ مطلوب میں اپنی ہستی کو مٹا دے۔

یہ بھی ثابت ہوا کہ جس طرح ایمان کو تصدیق قلب سے تعلق ہے اسی طرح محبت بھی واردات قلبی اور روحانی کیفیت ہے۔

غرض اس حدیث کا مضمون رہروان کوئے محبت اور سرگردان بادیہ الفت کے واسطے پورا دستور العمل ہے۔ اور اسی دستور العمل کا خلاصہ ہمارے وارث عالم پناہ نے ہم کو یہ تعلیم فرمایا کہ ''محبت کرو'' جو بظاہر چھوٹا سی لفظ ہے۔ مگر درحقیقت بڑے بڑے مطالب اور فوائد سے مملو ہے۔ اور جس طرح عام طور پر اس کی ہدایت فرمائی اسی طرح ہر شخص کی حالت واستعداد کے لحاظ سے یہ مفید عام بھی ہے۔

اب اس کی صراحت کہ محبت بندہ کو خدا سے ملاتی ہے شاید ضرورت نہیں ہے کیونکہ تصوف کی جملہ کتابوں میں بہ وضاحت اس کا ذکر ہے۔ چنانچہ جامی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔ مصرع..... جامؔی رہ ہدیٰ بخدا غیر عشق نیست

(اے جامؔی! ہدایت کا راستہ جو اللہ کی طرف جاتا ہے وہ بخدا عشق کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔)

کتب احادیث میں اس کی بشارتیں موجود ہیں۔ چنانچہ منقول ہے کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا کہ تم نے قیامت کے واسطے کیا سامان مہیا کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ کچھ نہیں۔

مگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں تب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ" آدمی اسی کے ساتھ رہے گا جس سے اس کو محبت ہوگی۔" چنانچہ بخاری اور مسلم میں حضرت ابن مسعودؓ سے یہ حدیث منقول ہے کہ"المرء مع من احب " جو جس سے محبت رکھتا ہے وہ اسی کے ساتھ ہوگا۔ اس فرمان مصطفویؐ نے مطمئن کردیا۔ اور بڑی امید ہوگئی کہ جس سے ہم محبت کریں گے اسی کے ساتھ ہوں گے لیکن کسی کو یہ شبہ ہو کہ بداعمال اگر صاحب اعمال حسنہ سے محبت کرے گا تو گنہگار شخص اس برگزیدۂ خدا کی معیت میں کیونکر ہوسکتا ہے۔ تو اس غم خوار اُمت نے ہم کو اس کی بھی خوش خبری دی ہے چنانچہ سنن ابی داؤد میں منقول ہے"عن ابی ذر انہ قال یا رسول اللّٰہ الرجل یحب القوم و لا یستطیع ان یعمل کعملھم قال انت یا اباذر مع من احببت قال فانی احب اللّٰہ و رسولہ قال ذالک مع من احببت قال فاعادھا ابو ذر فاعادھا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم "ابوذر نے عرض کیا یارسول اللہ ایک شخص ایک قوم سے محبت رکھتا ہے مگر ان کے مثل عمل نہیں کرسکتا۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابوذر تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔ ابوذر نے عرض کیا کہ میں تو خدا اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ نے وہی فرمایا فانک مع من احببت پھر ابوذر نے وہی کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا۔

اس حدیث سے وہ خدشہ بھی جاتا رہا۔ اور معلوم ہوگیا کہ محبت سے ادنیٰ شخص کو صاحب مراتب علیا کی معیت نصیب ہوسکتی ہے۔ اور اس قوی نسبت کی بدولت فرق و امتیاز نہیں رہتا۔

لہٰذا اگر محبت صادق ہے تو وہ مدارج علیا مل سکتے ہیں جن کے سمجھنے میں ہمارا فہم وادراک قاصر ہے۔ اور بالآخر محبوب اور محبّ میں وہ عینیت ہے کہ دوئی کی گنجائش نہیں رہتی۔ چنانچہ مولانا علیہ الرحمتہ نے مثنوی میں اسی مضمون کو لکھا ہے کہ رگ مجنون سے خون لینے کے لئے فصاد نے نشتر نکالا، تو مجنون نے شور مچایا۔ فصاد نے کہا کہ اے مجنون تجھ کو شیروں سے نہیں خوف آیا، نشتر سے کیوں ڈرتا ہے۔

گفت مجنوں من نمی ترسم زنیش   صبر من از سنگ خارا ہست بیش
لیک از لیلیٰ وجود من پراست   ایں صدف پراز صفات آن دُراست
ترسم اے فصاد اگر فصدم کنی   نیش را ناگاہ بر لیلیٰ زنی
داندآں عقلے کہ او دل روشنیست   درمیان لیلیٰ و من فرق نیست

(مجنون نے کہا کہ میں نشتر سے نہیں ڈرتا۔ میرا صبر سخت پتھر سے بھی بڑا ہے۔ لیکن لیلیٰ سے میرا وجود بھرا ہوا ہے۔ یہ سیپ اُس موتی کی صفات سے بھرا ہے۔ اے فصد لگانے والے اگر تم نے میرا فصد کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ تو اچانک نشتر کو لیلیٰ پر مارے گا۔ عاقل روشن دل جانتے ہیں کہ لیلیٰ اور میرے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔)

غرض نہایت فخر ومباہات کا مقام ہے کہ ہم گنہگاروں کو حضور نے وہ ہدایت فرمائی جو ہم کو ادنیٰ سے اعلیٰ بنا سکتی ہے۔ اور اس ہدایت میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہماری حیثیت کے لحاظ سے یہ حکم فرمایا کہ ''محبت کرو'' یہ نہیں ارشاد ہوا کہ عشق کرو۔ حالانکہ عشق کا مرتبہ بڑا ہے کہ افراط محبت کو عشق کہتے ہیں۔ مگر آپ نے محبت ہی کی ہدایت فرمائی۔

اس ارشاد کو اگر اصولی نظر سے دیکھیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاید عشق کا

ذکر اس لئے نہیں کیا کہ فرقان حمید میں اللہ عزاسمہ نے لفظ محبت ہی کا استعمال فرمایا ہے اور محبت ہی کی ترغیب دی ہے اور محبت ہی کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ لہٰذا آداب حضرت احدیت اور اتباع سنت الوہیت کا یہی تقاضا تھا کہ اپنے غلاموں کو محبت ہی کی ہدایت فرمائی۔

یا اس وجہ سے عشق کا ذکر نہیں فرمایا کہ عشق افراط محبت کا نام ہے اور مدارج علیا میں خاص اور بہت بڑا مرتبہ ہے جو خصوصیت کے ساتھ عشاق کو تفویض ہوتا ہے۔ ماوشما کا کام نہیں کہ عشق کا دعویٰ کریں۔ اس لئے جناب والا نے اپنے غلاموں کو آداب عشق و عشاق سے آگاہ کیا اور سمجھا دیا کہ تمہارے مناسب حال یہی ہے کہ محبّ بنو اور محبت کرو"۔

یا اس خیال سے عشق کا تذکرہ اس ہدایت میں نہیں فرمایا کہ عشق وہبی ہے جو کسب سے نہیں حاصل ہوتا۔ پس یہ شان رہبری ہے کہ اپنے غلاموں کو ایسی کوشش سے بچایا کہ عموماً جس کی اہلیت یا استعداد نہیں ہے۔ ارشاد ہوا کہ "محبت کرو۔"

الغرض ہمارے سرکار عالم پناہ نے اپنے غلاموں کو محبت کی عام ہدایت فرمائی ہے اور متواتر ارشاد ہوا ہے کہ "محبت کرو۔" اور اس چھوٹے سے جملہ میں وہ مفاد ہیں کہ جن کی خوبیوں کو سمجھنا ہمارے فہم وادراک سے باہر ہے۔ چنانچہ حضرات صوفیہ کرام کے اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کے شرف واختصاص کا باعث صرف خدا اور اس کے رسول کی محبت ہے۔ اور حصول محبت خدا اور رسول مرشد کامل کی محبت پر موقوف ہے۔ کیونکہ طالب صادق کی عالم شہود سے ترقی اسی پر منحصر ہے کہ مرشد ناطق کی محبت و اثق ہو تو اسی صورت میں انوار محمدیہ کا ظہور ہوگا۔ اور پھر عینیت کا جب یقین ہوگا تو اسی

صورت میں حضرت واجب الوجود کا جلوہ آئے گا۔ اور وہی ایک صورت تمام صورتوں کا آئینہ ہوگی اور وہی ایک ذات وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا تماشا دکھاتی ہے۔ اور یہی تصدیق عینیت طالب کو موحد بناتی ہے۔ اس لئے ہادیان طریقت نے محبت پیر کو عین محبت خدا فرمایا ہے۔

چنانچہ حضور نے متواتر ارشاد کیا ہے کہ "پیر کی صورت میں خدا ملتا ہے۔" یعنی جناب والا نے ہم کو بتادیا کہ پیر کامل کی صورت انوار حضرت احدیت کا آئینہ ہے اور مشاہدۂ تجلیات الٰہی کا ذریعہ ہے۔

اور حضرت مولانا علیہ الرحمتہ نے بھی اس عینیت پیر کا اظہار اس تذکرہ میں کیا ہے کہ جب بایزید بسطامی قدس سرہ العزیز نے حج بیت اللہ کے لئے سفر کیا، اور راہ میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ اور اس خدارسیدہ نے بعد دریافت حال فرمایا۔ "گفت طوف کن بگردم ہفت بر۔" (اس نے کہا طواف کر، میرے اردگرد، سات بار) اور آداب پیر طریقت بیان فرما کر حقیقت بیان فرما کر حقیقت پیر ارشاد کی نسبت یہ کہا ؎

چوں مرا دیدی خدارا دیدۂ
گرد کعبہ صدق بر گردیدۂ
خدمت من طاعت و حمد خداست
تانہ پنداری کہ حق ازمن جداست

(جب تو مجھے دیکھے گا تو گویا اللہ کو دیکھ لے گا۔ گویا کعبہ کے اردگرد تو نے سچائی کے ساتھ چکر لگایا۔ میری خدمت خدا کی اطاعت اور حمد وثنا ہے۔ تاکہ تو یہ گمان نہ کرے کہ میں جدا ہوں اور خدا جدا ہے۔)

چنانچہ جناب مولانا بحر العلوم نے اشعار مذکور کی شرح میں لکھا ہے کہ" خلقت انسان کامل جامعیت مراتب ذات واسماء واکوان دارد۔ پس ایں صورت انسانیہ خانہ سرحق است وایں ظاہراست ۔ وایں جاشارحان حدیث قدسی نقل می کنند کہ"الانسان سری و انا سرہ" "انسان سرمن است یعنی من ظاہرم وباطن ومن انسان ام کہ انسان ظاہراست ومن باطن او۔ وعارف راایں ہر دومشاہدہ میسراست ۔ گاہ حق راباطن یابدوخودراظاہر۔ وگاہ خودراباطن می یابدوحق راظاہر"۔ (کامل انسان کی پیدائش اللہ کی ذات اوراسماء اورسب جہانوں کی جامعیت رکھتی ہے۔ پس یہ انسانی صورت میں حق کا راز ہے اور یہ واضح ہے۔ اوراس حدیث قدسی کی شرح کرنے والے نے لکھا ہے کہ انسان میراراز ہے اور میں اس کا راز ہوں۔ میں ظاہر ہوں اور میں ہی باطن ہوں اور میں انسان ہوں۔ انسان ظاہر ہوں اور میں ہی اس کا باطن ہوں۔ اور عارف کو یہ دونوں مشاہدات میسر ہوتے ہیں۔ کبھی وہ حق کو باطن پاتا ہے اوراپنے آپ کوظاہر پاتا ہے۔ اورکبھی اپنے آپ کو باطن پاتا ہے اورحق کوظاہر پاتا ہے۔)

اور یہ تو قریب قریب روزمرہ کا معمول تھا کہ جب آپ رموز تصوف اور لطائف معنوی بیان فرماتے تھے۔ اوراس مسئلہ کا ذکرآجاتا تھاتو مولاناعلیہ الرحمۃ کا یہ شعرتبسم کے ساتھ ضرور پڑھتے تھے۔

من نجویم زیں سپس راہ اثیر
پیر جویم، پیر جویم، پیر پیر

(میں مزید کسی بلندی کا راستہ تلاش نہیں کرتا ہوں۔ میں فقط پیرکو ہی تلاش کرتا

ہوں۔ میں پیر کو ہی تلاش کرتا ہوں۔ میں پیر کو ہی تلاش کرتا ہوں۔)

اور اس کے بعد خاص نظر عنایت سے مریدین کی جانب مخاطب ہو کر آپ فرماتے تھے کہ "آخر مولانا نے صاف کہہ دیا"۔ کیونکہ مولانا علیہ الرحمتہ نے اس شعر کے اول و آخر کے اشعار میں فیضان پیر کامل بیان فرما کر صاف لفظوں میں بظاہر کر دیا کہ طالب کو حصول مقصود اصلی کے لئے توسل پیر لازمی ہے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے۔

غیر پیر استاد و سر لشکر مباد　　پیر گردوں نے و لے پیر رشاد
شرط تسلیم است نے کار دراز　　سود ندہد در ضلالت ترک تاز
من نجویم زیں سپس راہ اثیر　　پیر جویم پیر جویم پیر پیر
پیر باشد نرد باں آسماں　　تیر پر آں از کہ گردد از کماں

(پیر استاد کے علاوہ لشکر کا راز حاصل نہیں ہوتا۔ پیر ہی رہنمائی کرنے والا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اپنے آپ کو پیر کے حوالے کر دے۔ گمراہی میں تگ و دو کرنا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ پیر آسمان کی سیڑھی ہے۔ تیر کمان سے ہی پُر یعنی مکمل ہوتا ہے۔)

اور اکثر یہ ہوا ہے کہ شعر مذکور پڑھنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا تھا کہ "مولوی حسین علی نے اور صاف کر دیا" (مولوی حسین علی قدیم حلقہ بگوش تھے) اور یہ اشعار پڑھتے تھے۔

من ہمیں گویم کہ پیر من خداست　　پیش منکر ایں سخن گفتن رواست
یک سوالے می کنم اے مرد ماں　　پس جواب او را دہید اے مومناں
ہیزم اندر نار چوں شد سوختہ　　رشتہ اندر جامہ چوں شد دوختہ
پس درا ہیزم بگوئید یا کہ نار　　رشتہ را جامہ بگوئید یا کہ تار

چونکہ پیر من فنا فی اللہ شد　　رفت بشریت ہمہ اللہ شد

(میں یہی کہتا ہوں کہ میرا پیر خدا ہے۔ مخالف کے سامنے یہ بات کہنا جائز ہے؟ اے لوگو میں یہ سوال کرتا ہوں۔ پس اے مومنو اس کو یہ جواب دو۔ میں آگ کے اندر لکڑی تھا پس وہ جل گئی۔ میں کپڑے کے اندر دھاگہ تھا جب وہ سیا گیا۔ پس اس کو لکڑی کہیں یا آگ، دھاگے کو دھاگہ کہیں یا کپڑا۔ چونکہ میرا پیر فنا فی اللہ ہو گیا۔ اس کی بشریت چلی گئی اور وہ تمام خدا ہو گیا۔)

بلکہ ایک مرتبہ آپ کے فقیر اوگھٹ شاہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرات مشائخین نے فنا کے تین درجے بیان کئے ہیں لہٰذا فنا فی الشیخ ہونا تو ممکن معلوم ہوتا ہے کہ پیر کو دیکھتا ہے لیکن فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کا طریقہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ارشاد ہوا کہ "پیر ہی کی ذات میں فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کا مرتبہ بھی مل جاتا ہے۔" اور اس کے بعد حضرت مولانا کا یہ شعر پڑھا۔

چونکہ ذات پیر را کردی قبول
ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسولؐ

(جب تو نے پیر کی ذات کو قبول کر لیا تو پیر کی ذات میں اللہ بھی آ گیا اور رسولؐ بھی آ گیا۔)

اسی مسئلہ کو متقدمین حضرات صوفیہ کرام نے نہایت وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ شیخ العارفین علی فرزند سید محمد وفا علیہ الرحمتہ نے بکمال شرح و بسط اس میں تقریر کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "مرشد ناطق کی صورت مرید صادق کے سر کا آئینہ ہے جب بصیرت کی نظر سے دیکھے گا۔ اور مرشد کے خط و خال سے اس کا باطن

آراستہ ہوگا تو اپنے مرشد کو آدم زماں اور موجودات کا مالک عناں مشاہدہ کرے گا۔ اور جب صورت آدمیہ کا حجاب اٹھ جائے گا تو مخصوص روح محمدیہ کا جمال جلوہ گر ہوگا۔ اس وقت انوار روحانیہ اس کے سدرہ پر چھا جائیں گے اور مرشد کو اس حقیقت میں دیکھے گا جو ہر جلوہ گاہ میں جلوہ گر ہے تب وجود کے سامنے عدم اور حضرت شہود میں محو ہو جائے گا۔ پس مرید کا اول توفیق ہے اور اوسط تصدیق اور آخر تحقیق اور یہی انتہا ہے۔'' (طبقاۃ الکبریٰ)

اور انہیں کا قول ہے کہ ''اگر تم کو پیر محقق مل گیا تو تم کو اپنی حقیقت مل گئی اور جب تم کو اپنی حقیقت مل گئی تو تم کو اللہ تبارک وتعالیٰ مل گیا۔ اس لئے کل مراد صرف پیر کے ملنے میں ہے۔'' چنانچہ حضرت بہلول دانا فرماتے ہیں ۔

ہم نبیؑ و ہم علیؑ و ہم ولی
دو مبیں تا تو نہ باشی احولی

(نبی، علی اور ولی کو ایک ہی ذات میں دیکھ۔ ان کو الگ الگ نہ جان۔ اگر ان کو الگ الگ جانا تو گویا تو بھینگا ہے کہ ایک کو دو سمجھتا ہے۔)

اور شیخ امام احمد ابوالعباس مرسی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ ''میرے پیر و مرشد حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی علیہ الرحمتہ نے فرمایا کہ اے ابوالعباس میں نے تم کو اپنی صحبت میں اس لئے رکھا ہے کہ تم میں ہو جاؤ، اور میں تم ہو جاؤں۔'' (طبقاۃ الکبریٰ)

اور یہ بھی انہیں کا قول ہے کہ ''تو اے مرید شاخ ہے اور تیرے پیر کا نور آفتاب ہے جو تجھ کو زندہ رکھتا ہے اور ماہتاب ہے جو تیری پرورش کرتا ہے''۔ (طبقاۃ الکبریٰ)

اور حضرت مولانا علیہ الرحمتہ نے حقیقت پیر کی تصریح میں یہ فرمایا ہے کہ طالب راہ طریقت کو لازم ہے کہ پیر کامل کو ذات الٰہی سے متحد جانے۔ اور تصدیق عینیت ایسی قوی ہو کہ ایک دیکھے اور ایک سمجھے اور ایک کہے۔ اور خدمت پیر برحق کو خدمت رب مطلق تصور کرے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں ۔

خدمت اُو خدمت حق کرد نست
روز دیدن دیدن ایں روز نست
دو مبین و دو مدان و دو مخواں
خواجہ را در خواجۂ خود محو داں
چوں جدا بنی زحق ایں خواجہ را
گم کنی ہم متن وہم دیباچہ را
چشم دل راہیں گذارہ کن زطین
آں یکے قبلہ ست دوقبلہ مبیں
چوں دو دیدن ماندی از ہر دو طرف
آتشے درخف فتاد وسوخت خف

(پیر کی خدمت حق کی خدمت کرنا ہے۔ اسے دیکھنا حق کا ہی دیکھنا ہے۔ دو نہ دیکھ اور دو نہ جان۔ خواجہ کو خواجہ میں محو وفنا سمجھ۔ جب تو حق سے خواجہ کو جدا سمجھے گا تو تو متن اور دیباچہ کو گم کردے گا۔ دل کی آنکھ سے دیکھ مٹی کے اس گھروندے کو۔ یہ ایک ہی قبلہ ہے ان کو دوقبلہ مت سمجھ۔ جب تو دو دیکھے گا تو ہر طرف دو ہی نظر آئیں گے۔ اگر تو نے موزے میں آگ ڈالی تو موزہ جل جائے گا۔)

بعض ہادیان راہ طریقت نے اس مسئلہ کواحادیث صحیحہ سے ثابت کیا ہے اور مدلل طور پر بیان فرمایا ہے کہ طالب صادق کی ترقیات کا ذریعہ مرشد کامل کی ذات ہے چنانچہ سید محمد وفا علیہ الرحمۃ نے اس حدیث قدسی ''انا عند ظن عبدی بی و انا معه اذا ذکرنی '' (میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں۔ جووہ میرے متعلق گمان کرتا ہے۔ جب وہ میری یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔) کی شرح میں فرمایا ہے کہ ''صورتوں میں جس صورت سے مجھے تصور کرے گا میں اسی صورت کے ساتھ اس کا مدد کرنے والا اسی صورت کے افق سے اسی صورت کے حکم کے ساتھ ہوں''۔ (طبقاۃ الکبریٰ)

علیٰ ہذا حضرت امام بخاری علیہ الرحمتہ نے کتاب الایمان کے باب حلاوۃ ایمان میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ ''عن انس عن النبی صلی اللّٰه علیه و آله وسلم قال ثلث من کن فیه وجد حلاوة الایمان ''یعنی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حلاوت ایمان کے واسطے تین خصلتیں ہیں جن میں پہلی خصلت یہ ارشاد ہوئی کہ ''ان یکون اللّٰـه ورسوله احب الیه مما سراهما '' کہ خدااوراس کے رسول کو ماسواخدااوررسولؐ سے زیادہ محبوب رکھےاوردوسری خصلت یہ بیان فرمائی کہ ''وان یحب المرا لا یحبه الا اللّٰه ''یعنی محض خدااوررضائے خدا کے واسطے کسی کو دوست رکھے۔

اس دوسری خصلت میں محبت مرشد کامل کی صاف ہدایت ہے کیونکہ دنیا میں مرشد ہی کی اطاعت اور محبت ایسی ہے جو طلب حق اور رضائے حق کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام شارح صحیح بخاری نے بھی اس خصلت ثانی کی شرح میں یہ لکھا

ہے ”منعم بالذات و مفیض علی الاطلاق جز خدا نیست و ہر چہ ماسوائے اوست آں وسائط فیض اوست در حد ذات خود اصرار و ابقاع ندارند۔ و وسائط پیغمبر است کہ شفیق و ہادی بصراط مستقیم و منجی از عذاب الیم و ساعی برائے وے بصلاح دارین است۔ وسائط دیگر بمشابہ جداول من شعبہ ازیں نہر اند کہ ازاں جا اکتساب فیض نمودہ بدیگراں می رسانند۔“ (حقیقی طور پر انعام دینے والی ذات اللہ کی ہے اور ہر لحاظ سے فیض دینے والی ذات اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اور جو کچھ اس کے سوا ہے یہ اسی کا عطا کردہ فیض ہے۔ اپنی ذات کے لحاظ سے خود انسان نہ کچھ حکم دینے والا ہے نہ پیدا کرنے والا۔ اور واسطہ پیغمبر ہے۔ جو سیدھے راستے کی رہنمائی کرنے والا، شفقت کرنے والا اور عذاب الیم سے نجات دلانے والا ہے۔ اور اس انسان کیلئے کوشش کرنے والا۔ دونوں جہانوں کی اصلاح کرنے والا ہے۔ دیگر واسطے اس نہر کا ایک شعبہ ہیں کہ وہاں سے فیض حاصل کر کے دوسروں کو پہنچاتے ہیں۔)

اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوارف المعارف میں، اور حضرت امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس کی اور وضاحت فرمادی۔ اور صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ پیر اپنے مریدوں میں مثل نبی کے ہوتا ہے کہ دعوت خلق کرتا ہے۔ چنانچہ جہاں حقیقت پیر کا تذکرہ کیا ہے اس کے استدلال میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے ” الشیخ فی قومہ کا لنبی فی امتہ “ (اپنی قوم میں شیخ اسی طرح ہوتا ہے جیسے امت میں نبی۔) جس کی شرح مولانا علیہ الرحمۃ نے یہ کی ہے۔

گفت پیغمبر کہ شیخ وقت خویش — چوں نبی باشد میان قوم خویش

قول آن من امتہ را یاد گیر — تابہ الا و خلا فیہا نذیر

(پیغمبرؐ نے فرمایا کہ شیخ اپنے وقت میں اپنی قوم میں نبی کی طرح ہوتا ہے۔ نبیؐ کا یہ قول ''میں اس امت کا نبی ہوں'' یادرہے۔ ہرامت میں ڈرانے والا ہوتا ہے۔ اللہ نے کسی قوم کو نبی سے خالی نہیں رکھا۔)

غرض مستند اقوال سے معلوم ہوگیا کہ طالب خدا کو حضرت احدیت جل جلالہ کا تعرف پیشوائے کامل کی ذات سے نصیب ہوتا ہے۔ اور محبت مرشد سرمایۂ اعزاز آخرت ہے۔ چنانچہ ہمارے حضور نے بارہا یہ فرمایا کہ ''جو شخص جس سے محبت رکھتا ہے اسی کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔'' جناب والا کا یہ ارشاد پورا ترجمہ ہے حدیث صحیح ''المرءُ مع من احب'' کا جو حضرت ابن مسعود سے مروی ہے۔ اور یہ بھی حضور نے اپنے غلاموں سے مخاطب ہو کر متواتر فرمایا ہے کہ ''جو صورت یہاں تمہارے ساتھ رہے گی وہی قبر میں وہی حشر میں ساتھ ہوگی۔'' چنانچہ کاشف اسرار حقیقت حضرت فریدالدین عطار علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔

پیر رہ کبریت احمر آمدست
سینۂ او بحر اخضر آمدست

(راستے کی رہنمائی کرنے والا پیر سرخ گندھک کی مانند ہے۔ اس کا سینہ سبز دریا کی طرح ہے۔)

اور حضرت ملک محمد مثنوی پدماوت میں فرماتے ہیں ؎

جبہ کو جبہ پرست سینہود
سوتاہ ملے نہ کچھ سند یہو

غرض تعریف الٰہی کے لئے محبت پیر ارشاد لازمی ہے۔ لہٰذا ہم غلامان وارثی

کا فرض ہے کہ اپنے پیشوائے برحق کے شوق و خیال میں مصروف رہیں۔اور سوزِ محبت سے دلوں کو معمور کریں۔اور اگر عنایت ایزدی سے یہ توفیق بھی نصیب ہو کہ اس مظہر انوارالٰہی کے جمال جہاں آرائی کو جان سے زیادہ عزیز رکھیں تو عین سعادت اور خوش قسمتی ہے۔جیسا کہ بزرگان طریقت کا فرمودہ ہے کہ ''جس نے اپنے مرشد کو جان سے زیادہ محبوب رکھا،اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے لئے خطیرہ قدس کو کھول دیا۔اور جو اپنے مرشد کی بارگاہ کو نقائص سے منزہ سمجھا اس کو اللہ جل وعلا نے خصائص عطا فرمائے۔''(طبقاۃ الکبریٰ)

لہٰذا بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے بہت چھوٹی سی ہدایت فرمائی کہ ''محبت کرو''۔مگر تھوڑا غور کرنے سے ظاہر ہوگیا کہ اس ارشاد کے پردہ میں وہ انعامات تفویض فرمائے ہیں کہ جن کے لائق ہرگز ہم نہ تھے۔

اگر یہ خیال ہو کہ محبت وہبی ہے نہ اکتسابی۔تو پھر حضور نے یہ کیوں فرمایا کہ ''محبت کرو'' جس میں ہمارے اختیار واکتساب کو دخل ہے لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور کا یہ ارشاد موافق اصول طریقت ہے۔کیونکہ جس طرح جملہ حضرات عارفین کے اقوال سے ثابت ہے کہ محبت وہبی ہے اسی طرح یہ بھی مسلمہ ہے کہ سب نے اس کی تاکید فرمائی کہ محبت کرو۔اگر حصول محبت کے لئے سعی بے سود محض ہوتی تو بزرگان طریقت کبھی اس کوشش کی ہدایت نہ فرماتے۔

چنانچہ سنت جاریہ اسی طور سے ہے کہ باوجود وہبی ہونے کے حضرات صوفیہ نے فیضان محبت سے مستفیض ہونے کے لئے طالبان الٰہی کو ہمیشہ تاکید فرمائی ہے۔اور اس بیان کی تصحیح کے واسطے بہ نظر اختصار یہی ایک مثال کافی ہے کہ حضرت احدیت

جل جلالہ نے محبت کو وہبی فرمایا ہے کہ "یحبھم و یحبونہ" (جن سے وہ (اللہ خود) محبت فرماتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔ سورۃ المائدہ:۵۴) اس سے صاف ظاہر ہے کہ محبت خدا کی جانب ہے یعنی وہبی ہے پھر اپنے بندوں کو محبت میں سعی کرنے کا حکم بھی دیا کہ "فا سعوا الی ذکر اللّٰہ" (پس فوراً اللہ کے ذکر کی جانب تیزی سے چل پڑو۔ سورۃ الجمعہ:۹) یعنی اللہ کے ذکر کی کوشش کرو۔ اور ذکر نتیجہ محبت کا ہے "من احب شیأ اکثر ذکرہ۔"

اور احادیث صحیحہ سے تو صاف اور بغیر تاویل کے ثابت ہے کہ حبیب رب العالمین ﷺ نے بتاکید فرمایا ہے کہ مجھ سے محبت کرو۔ جیسا اوپر نقل ہو چکا ہے کہ حضرت عمر خطابؓ سے ارشاد ہوا کہ اپنی جان سے زیادہ مجھ کو دوست نہ رکھو گے تو ایمان کامل نہ ہوگا۔ پس محبت کے لئے اگر سعی بے سود ہوتی تو نہ اللہ تبارک وتعالیٰ "فا سعوا الی ذکر اللّٰہ" فرماتا۔ اور نہ حضرت رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم اپنے جاں نثار عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے یہ فرماتے کہ اپنی جان، مال، اولاد، والدین، بلکہ تمامی خلائق سے زیادہ مجھ کو دوست رکھو۔ جس میں صریح اکتساب کو دخل ہے۔ لہٰذا قدیم دستور ہے کہ محبت کو وہبی بھی کہا ہے۔ اور اس کے حصول کی تاکید بھی فرمائی ہے چنانچہ اسی عمل درآمد کے مطابق ہمارے حضور نے بھی اکثر فرمایا کہ "عشق وہبی ہے" اور اس کی بھی عام تاکید ہوئی "محبت کرو۔"

بعض حضرات صوفیہ نے اس کی تصریح یہ فرمائی ہے کہ محبت کی دو قسمیں ہیں۔ ذاتی وصفاتی محبت ذات محض وہبی ہے جس کے لئے سعی اور کوشش بے سود ہے۔ اور محبت صفات میں اکتساب ذات محض وہبی ہے جس کے لئے سعی اور کوشش بے سود

ہے۔اور محبت صفات میں اکتساب کو بھی دخل ہے جو محبت ذات کا وسیلہ بھی ہو جاتی ہے کہ طالب صادق جب محبت صفات میں کوشش کرتا ہے اور قلب کو سوز و شوق حاصل ہوتا ہے تو اس وقت عنایت ایزدی پر منحصر ہے۔ اگر کشش وہبی ہوئی تو طالب محبت ذات سے بھی مستفیض ہوتا ہے چنانچہ محبوب الٰہی سلطان نظام الدین بدایونی علیہ الرحمتہ نے اپنے ایک خط میں مولانا فخر الدین مروزی کو اقسام محبت کے تذکرہ میں ارقام فرمایا کہ محبت ذات موہبت ہے۔اور محبت صفات کسب کو بھی فی الجملہ دخل ہے۔ شاید اسی لحاظ سے ہمارے وارث عالم پناہ نے ہم کو یہ ہدایت فرمائی کہ ''محبت کرو'' جس سے محبت صفات مقصود ہو۔ کیونکہ محبت ذات بہت بڑا مرتبہ ہے اور عشق کا مترادف ہے جس کی نسبت اکثر آپ نے یہ فرمایا کہ ''عشق وہبی ہے جو کسب سے نہیں حاصل ہوتا۔''

بلکہ صاحب سیر الاولیا نے لکھا ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نے تو عشق کی نسبت بھی یہ فرمایا ہے کہ گو مسلمہ ہے کہ عشق وہبی ہے اور کسب سے حاصل نہیں ہوتا۔ مگر طالب کو لازم ہے کہ کوشش کرے اور دروازہ کھٹ کھٹائے۔ ممکن ہے کہ اسی خیال سے ہمارے حضور نے یہ فرمایا کہ ''محبت کرو'' اور مطلوب حقیقی کی طلب کو طلب صادق بناؤ۔ اگر عنایت رب العزت ہوئی تو جستجو بے کار نہ جائے گی۔ بمصداق ''من طلب وجد'' (جس نے تلاش کیا اس نے پالیا۔) چنانچہ حضرت مولانا بھی یہی فرماتے ہیں۔

سایہ حق بر سر بندہ بود　　عاقبت جویندہ یابندہ بود
گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے　　عاقبت از در بروں آید سرے
چوں نشینی بردر کوے کسے　　عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

چوں ز چاہے می کنی ہر روز خاک عاقبت اندر رسی در آب پاک

(حق کا سایہ بندہ کے سر پر ہوتا ہے۔آخر کار تلاش کرنے والا حاصل کرنے والا ہوتا ہے۔حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ جب تو کسی دروازے پہ دستک دے گا تو آخر کار کوئی سر باہر آئے گا۔ جب تو کسی گلی کے دروازے پہ بیٹھے گا تو آخر کار تو کسی کے روئے انور کو دیکھ ہی لے گا۔ جب تو کنوئیں سے ہر روز مٹی نکالے گا تو آخر کار تو پاک پانی تک پہنچ ہی جائے گا۔)

علاوہ اس کے مادۂ محبت اللہ جل جلالہ نے بنی آدم کو عالم ارواح میں مرحمت فرمایا ہے۔ بقول امام غزالیؒ ؎

خاک دل آں روز کہ می بیختند

شبنم عشق برو ریختند

(عالمِ ارواح میں روزِ ازل ہی دل کی سرزمین پہ محبت کا بیج بو دیا گیا تھا۔اور عشق کی شبنم اس پہ ڈال دی گئی تھی۔)

اور یہی خیال حضرت حافظ شیراز کا ہے کہ روز ازل میں انسان کا خمیر زلال محبت سے ہوا۔ ہو ہذا

منع از مے مکن اے صوفی صافی کہ حکیم

درازل طینت ما رازِ مئے صاف سرشت

(اے صوفی صافی حکیم مجھے شراب پینے سے منع کر کہ ازل میں ہی ہماری مٹی شراب طہور میں گوندی گئی۔)

اور اپنے دوسرے شعر میں حافظ صاحب بہت صاف الفاظ میں مادہ محبت کو

ازلی فرماتے ہیں۔ وہو ہذا

ازدم صبح ازل تا آخر شام ابد
دوستی و مہر بریک عہد و یک یثاق بود

(ازل کی صبح سے لے کر ابد کی شام تک دوستی اور محبت ایک ہی عہد اور ایک ہی یثاق رکھتے ہیں۔)

اور چونکہ یہ استعداد ازلی اور فطری ہے۔اس وجہ سے یہ ایسی قوی ہوتی ہے کہ دیگر اخلاط وانحطاط پذیر بھی ہوتے ہیں لیکن استعداد محبت جس کا تعلق روح سے ہے زائل نہیں ہوتی۔۔ بقول جامیؒ ؎

من کہ مہر عارضیت میورزم از صبح ازل
نگسلم از زلف تو پیوند تا شام اجل

(میں کہ جو تیری محبت مجھے عطا ہوئی ہے اور میں ازل کی صبح سے اسے اختیار کئے ہوئے ہوں، تیری زلف سے جڑا ہوا یہ تعلق میں موت کی شام تک نہیں توڑوں گا۔)

بلکہ اللہ عزاسمہ نے بھی اس کا ذکر سورۂ احزاب میں فرمایا ہے کہ ''انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض و الجبال فابین ان یحملنها و اشفقن منها ''(بے شک ہم نے (اطاعت کی) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس (بوجھ) کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔سورۃ الاحزاب:۷۲)یعنی زمین اور آسمان اور پہاڑ ہمارے بار امانت کے متحمل نہ ہوئے۔اور اس سے ڈر گئے''وحملها الانسان. انه کان ظلوماً جهولاً ''(اور انسان نے اسے اٹھالیا، بے شک وہ (اپنی جان پر) بڑی زیادتی

کرنے والا (ادائیگیِ امانت میں کوتاہی کے انجام سے) بڑا بے خبر و نادان ہے۔)
سورۃ الاحزاب:۷۲)اور اٹھالیا اس کو انسان نے یہ بڑا بے ترس اور نادان ہے۔

مفسرین حضرات صوفیہ نے عرضنا الامانۃ کی تفسیر میں بالاتفاق فرمایا ہے کہ یہ امانت بارِ محبت ہے جس کو انسان نے بروز ازل اٹھایا۔اور محض عنایت ایزدی سے یہ امانت تفویض ہوئی۔ اس لئے محبت وہبی ہے۔ اور ہر فرد انسان میں بقدر حیثیت محبت کی استعداد موجود ہے۔جس کا عالم شہود میں، گو کسی پیرائے میں کیوں نہ ہو مگر اظہار کافی ہوتا ہے۔اور انسان اثر محبت سے ضرور موثر نظر آتا ہے۔

چنانچہ حضرت شیخ روز جہاں شیرازی علیہ الرحمتہ جو حضرت امام رازی علیہ الرحمتہ کے ہم عصر تھے اپنی تفسیر عرائس البیان میں بہ تحت آیہ مذکورہ ارقام فرماتے ہیں'' **لمالم یکن للکون استعداد حمل امانۃ الر بوبیۃ بنعت الانفراد و الغناء والسکر فی العش** '' کہ کونین میں کسی کو اس بار امانت ربوبیت کے تحمل کی استعداد نہ تھی کیونکہ اس امانت کو وہی اٹھا سکتا ہے جو فردانیت اور فناء اور سکر فی العشق سے متصف ہو۔

لیکن عالم اجسام میں تعلقات موجودات کے حجابات لاحق ہوتے ہیں اور عوارضات نفسانی کی وجہ سے روحانی قوتیں مضمحل ہوکر خواہشات نفسانی کی تابع ہو جاتی ہیں چنانچہ مادۂ محبت جو بروز میثاق انسان کو تفویض ہو چکا ہے۔عالم شہود میں آکر اکثر خیالات باطلہ اور مرادات بشری کی معیت میں مبتلائے اشکال حوادث ہوتا ہے۔ اور حجاب تعینات صورت مقصد اصلی کو چھپا دیتے ہیں۔اور شوق وصال مطلوب حقیقی سہو ہو جاتا ہے جس کے لئے سعی اور کوشش کی ضرورت ہے کہ تو ہمات ناقصہ اور

خیالات باطلہ سے انسان روگردانی کرے اور مقصود اعلیٰ اور مطلوب حقیقی کی جانب رجوع ہو۔اس واسطے ہادیان راہ طریقت نے جدوجہد کی ہدایت فرمائی۔اور ہمارے حضور نے بھی عام مریدین سے یہ خطاب فرمایا کہ ''محبت کرو'' کیونکہ استعداد محبت ہر فرد انسان میں موجود ہے۔

یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی صفت ''جھولا''فرمائی ہے۔یعنی جب انسان بار محبت کا متحمل ہوا تو نادان سمجھا گیا۔اور اثر محبت نے اس کی عقل کو زائل کر دیا۔چنانچہ ہمارے حضور نے''ظلوما جھولا'' کا مفہوم ہمارے ادراک کے لحاظ سے با محاورہ الفاظ میں یہ ارشاد فرمایا کہ'' جہاں حضرت عشق آئے وہاں علم وعقل کا دخل نہیں''بقول مولانا علیہ الرحمتہ ؎

عشق آمد عقل او آوارہ شد

صبح آمد شمع او بے چارہ شد

(عشق جب آیا تو اس آدمی کی عقل آوارہ ہوگئی۔صبح ہوئی تو رات کو جلنے والی شمع بے بس ہوگئی۔)

کیونکہ ظلوماً سے اپنی ہستی کو مٹانا،اور جھولا سے ماسوائے یار موجودات سے قطعی انقطاع اور اس کو بھول جانا مراد ہے۔اور یہی عشق کا خاصہ اور عین اثر ہے جیسا کہ سرکار احدیت جل جلالہ نے فرمایا کہ انسان نے بار امانت (یعنی محبت کا بوجھ) اٹھایا پس''کان ظلوما جھولا''یعنی اس نے اپنی ہستی مٹائی اور اس کی عقل زائل ہوگئی۔اور سب بھول گیا۔چنانچہ شیخ اکبر حضرت محی الدین عربی علیہ الرحمتہ نے فصوص الحکم میں حکمة الھیه فی کلمة آدمیة کی بحث میں اسی آیہ کریمہ سے استدلال

کیا ہے۔اور''ظلوما جھولا'' کی تفسیر میں ارقام فرمایا ہے ''ظلوما علے نفسه ممیتا ایاها مفنیا ذاقه جھولا بغیره ناسیا لما سواه نا فیا لماعداه بقول لااله الا اللّٰه.'' (اپنی جان پر بہت ظلم کرنے والا۔نفس کو مٹانے والا۔اپنی ذات کی نفی کرنے والا۔ بہت جاہل۔ اللہ کے سوا ہر شے کو بھولنے والا۔اللہ کے سوا ہر شے کی نفی کرنے والا،اس کلمہ کے ساتھ کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں۔)

غرض یہ مسلمہ ہے کہ محبت فطری ہے اور مادۂ محبت انسان کو بروز میثاق تفویض ہوا ہے۔اور حضور کا یہ ارشاد کہ محبت کرو، اصول طریقت کے مطابق اور سنت جاریہ کے موافق ہے۔اور اسی طرح آپ کا یہ دوسرا احسان ہے کہ جس طریق سے حضور نے ایک مختصر جملہ میں عقائد ظاہری اور اعمال باطنی کا ہم کو سبق دیا۔اسی طرح ہمارے معاملات اور عادات درست کرنے کے لئے بھی ہدایت فرمائی جیسا کہ مہربان طبیب کا دستور ہے کہ جب مریض کے استعمال کے لئے دوا بناتا ہے تو اسی کے ساتھ پرہیز کی بھی تاکید کرتا ہے اور مضر اشیاء کی تصریح کر دیتا ہے۔اسی طرح ہمارے طبیب باطنی نے بکمال شفقت امراض روحانی کی اصلاح کے لئے جب ہم کو محبت کا مفید اور مجرب نسخہ بتا دیا تو اسی کے ساتھ عنایت وارثی نے ہم کو پرہیز کی بھی تعلیم فرمائی۔اور متواتر ارشاد ہوا کہ ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔'' نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس ہدایت میں بھی متعدد مفاد پوشیدہ ہیں۔

(اول) ترک سوال حضرات صوفیہ کرام کی خاص سنت ہے۔ کیونکہ زیادہ متقدمین اہل طریقت نے سوال کرنے سے خود بھی بکمال اہتمام احتراز فرمایا، اور اپنے مریدین کو بھی اس کی ہدایت فرمائی۔ بلکہ صاحب مرآۃ الاسرار کا تو یہ قول ہے کہ بعض

حضرات صوفیہ کے پورے گروہ کا یہی طریقہ تھا کہ وہ سوال نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ ''خانوادہ عیاضیان یعنی حضرت فضیل بن عیاض کے جملہ مریدین، اور خانوادۂ ادہمیان یعنی حضرت ابراہیم ادہم کے نامی حلقہ بگوش اور خانوادۂ ہبیر یان یعنی حضرت ہبیر ہ بصری کے کل دست گرفتہ باہیچ کس سوال روانمی داشتند و ہر چہ ازغیب بے طلب می رسد خرچ می کنند۔'' (حضرت فضیل بن عیاض کا سارا خاندان اور ان کے تمام مریدین، وہ کسی سے مانگتے نہ تھے۔ اور جو کچھ غیب سے بن مانگے حاصل ہوتا تھا وہی خرچ کرتے تھے۔) اور شیخ احمد رفاعی علیہ الرحمتہ نے جو متقدمین حضرات صوفیہ میں سر برآوردہ درویش تھے اپنے مریدین کی تعلیم میں یہ فرمایا ہے کہ ''ہمارے طریقہ کی بنا تین چیزوں پر ہے۔ اول سوال نہ کرو، دوئم رد نہ کرو، سوم جمع نہ کرو'' اور حضرت بوعلی شاہ قلندر فرماتے ہیں۔

بہر آب و نان مگر دی در بدر — آبروئے خود نہ ریزی بہر زر
گر زفاقہ جاں بر آید از قفس — چوں مگس دستت مزن برنان کس
بر سر خوان قناعت دست زن — تانبا شد دست بر فرماں شکن
باش در کنج قناعت سرنگوں — پامنہ از گوشۂ عزلت بروں
پشت پازن تخت کیکاؤس را — سر بدہ از کف مدہ ناموس را
الحذر از حب دنیا الحذر — بہرنان و زر مخور خون جگر

(پانی اور روٹی کیلئے وہ ہر دروازے پر نہ جاتے تھے اور سونے کیلئے اپنی عزت نہ گنواتے تھے۔ اگر بھوک سے جان جسم سے باہر آجاتی تو مکھی کی طرح وہ کسی کی روٹی پر ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ (ان کا نظریہ یہ تھا کہ) قناعت کے دسترخوان پر ہاتھ لگا تاکہ حکم توڑنے

والا نہ بن جائے۔قناعت کے کونے میں سر جھکانے والا بن جا۔تنہائی کے کونے سے پاؤں باہر نہ رکھ۔کیکاؤس کے تخت کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر لگا۔اپنا سر دے دے مگر اپنے ہاتھ سے عزت کو نہ جانے دے۔بچ جا۔دنیا کی محبت سے بچ جا۔نان اور سونے کیلئے جگر کا خون نہ کھا۔)

غرض حضور کا یہ ارشاد کہ ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔'' گویا ہم کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ مقبولان الٰہی کی تقلید کرو۔

(دوم) یہ کہ سوال کرنا اصول طریقت کے بالکل خلاف ہے۔اس لئے کہ حصول مقصود اصلی اسی پر منحصر ہے کہ طالب ماسوی اللہ سے بے سروکار ہو۔اور موجودات عالم سے قطع تعلق کرے۔اور سوال کرنا جس کا حقیقی مفہوم اپنی حاجت روائی کے واسطے غیر خدا سے درخواست کرنا ہے۔جو یقینی مقصود اصلی کے منافی ہے۔اور طالب حق کی کامیابی کو مفقود اور باب حصول الی اللہ مسدود کرتا ہے۔اور علاوہ اس کے سوال کرنا موجودات عالم سے سروکار بڑھانا،اور بجائے انقطاع کے جدید جہت و تعلق پیدا کرنا ہے۔لہٰذا ہمارے خضر طریقت نے ہم کو اس مکروہ اور مذموم فعل سے باز رکھا جو طالب کی ترقی اور کامیابی میں سد راہ ہوتا ہے اور سمجھا دیا کہ دنیاوی تعلقات منقطع کرو اور غیر خدا کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔

(سوم) سوال کرنا فقر کی شان وعظمت کے منافی ہے۔کیونکہ سوال کرنا انسان کی تذلیل کا بہت بڑا سبب ہوتا ہے۔اور فقر وہ علوی مرتبت ہے کہ جس کی نسبت اشرف الخلق محبوب رب العالمین ﷺ نے ''الفقر فخری ''فرمایا پس کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے کہ فقر کا دست گرفتہ ایسی ذلت گوارا کرے کہ روزمرہ کی

ضرورت کے واسطے اہل دنیا کے آگے ہاتھ پھیلائے جو صریح آداب فقر ہے۔ اس لئے حضور نے متواتر ارشاد فرمایا کہ ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔''

(چہارم) سوال کرنا اس وجہ سے بھی نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ رکیک فعل یعنی غیر خدا کے آگے ہاتھ پھیلانا اعزاز فقراء کے پاک وشفاف دامن میں بدنما دھبہ لگانا ہے۔ کیونکہ یہ سلسلۂ فقر ہی ایسا پردہ پوش سلسلہ ہے کہ اپنے وابستہ کی تمام نسبتوں کو مٹا کر اپنے ساتھ منسوب کرتا ہے۔ اور بھلائی و برائی کا بار خود اٹھاتا ہے۔ ورنہ دنیا میں جس قدر علوم وفنون رائج ہیں ان کے ماہرین سے تلامذہ افاضہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کے شاگرد اور تعلیم کردہ مشہور بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کی نسبت آبائی محو نہیں ہوتی بلکہ ان کے نام کے ساتھ کہا یہی جاتا ہے کہ فلاں عالم فلاں کا بیٹا اور فلاں طبیب فلاں شخص کا پوتا ہے۔ گو استاد کی نسبت بھی بعض موقعہ پر قایم رہتی ہے مگر برائے نام اور نسبت آبائی سے بہت کم خصوصاً کوئی بات خاص اور اہمیت کے ساتھ جب ظاہر ہوتی ہے تو اس وقت استاد کی جانب منسوب نہیں کرتے۔ اور ایسی صورت میں خاص طور پر نسبت پدری ہی کا ذکر آتا ہے اور اجداد ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے سلسلۂ فقر ہے کہ اس کا حلقہ بگوش اسی کا ہو جاتا ہے۔ نسبت آبائی نیست اور نابود ہو جاتی ہے۔ بقول

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامؔی
کن دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

(اے جامؔی! عشق کا غلام بن جا اور اپنا حسب ونسب چھوڑ دے۔ اس راستے میں فلاں ابن فلاں کوئی چیز نہیں۔)

جب کوئی بھلائی یا برائی شہرت پذیر ہوتی ہے باپ اور دادا کا نام کوئی نہیں لیتا، تو کہا یہی جاتا ہے کہ فلاں فقیر کا یہ دست گرفتہ ہے۔لہٰذا ترک سوال کی اسی لئے تاکید ہے کہ ہمارے اس مکروہ اور ممنوع اور ذلیل فعل کا ذکر ان مقدس اور نا کردہ گناہ بزرگوں کے نام سے مشہور ہوتا ہے جن کے ساتھ ہم منسوب ہیں۔شاید اسی وجہ سے ہمارے سرکار عالم پناہ نے ہم کو یہ ہدایت فرمائی کہ ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔''

(پنجم) ترک سوال میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ حضرات عارفین نے ہمیشہ اس کی ہدایت فرمائی ہے کہ طالبان راہ خدا کو اس کا یقین کامل ہونا چاہئے کہ تقسیم جناب احدیت جل جلالہ غلط نہیں ہے۔چنانچہ حضور نے بھی اکثر فرمایا ہے کہ ''جو جس کی قسمت کا ہے وہ اس کو ضرور پہنچتا ہے۔'' اور سوال کرنا اس کی ضد ہے۔لہٰذا ہمارے رہنمائے کامل کی یہ عین بندہ پروری ہے کہ ہم غلاموں کو صبر کی ہدایت فرمائی۔اور صریح الفاظ میں ارشاد ہوا کہ غیر خدا کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔جو کچھ بارگاہ رزاق العباد سے تم کو پہنچے، اس کو تسلیم کرو۔جو خاص صبر کی تعریف ہے۔اور طریقت میں صبر کا بڑا مرتبہ ہے۔تو اس مختصر ہدایت وارثی کا حقیقی مفہوم یہ ہوا کہ انعام رب العزت صبر کے ساتھ قبول کرو۔جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ **ان اللّٰہ مع الصابرین** ۔(بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔سورۃ البقرۃ:۱۵۳)

(ششم) ترک سوال حیا کی عین نگہداشت ہے۔اور حیا ایمان کا جز و مقدم ہے کہ ''**الحیاء شعبة من الایمان**'' (حیا ایمان کا ایک جزو ہے۔) ارشاد حضرت نبویؐ ہے اور سوال کرنا اس کے برعکس ہے۔پس ہمارے ایمان کی حفاظت اور سلامتی منظور تھی، اس لئے اس ہادئ برحق نے یہ حکم دیا کہ ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔''

تا کہ تمہارے ایمان میں نقص نہ آوے، چنانچہ ایک روز برجستہ طور پر حضور نے یہ فرمایا کہ "اسلام اور چیز ہے اور ایمان اور چیز ہے۔"

حضور کے ایک خادم نے جو بے پڑھے اور دیہات کے باشندے تھے۔ عرض کیا کہ آخر ایمان کیا چیز ہے؟ آپ نے ان کی سمجھ کے لائق ایمان کی تعریف کا خلاصہ یہ ارشاد کیا کہ "کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔"

(ہفتم) علاوہ ان فوئد کے سوال نہ کرنا ایسی مہتم بالشان صفت ہے کہ جناب سرور عالم ﷺ نے بعض اصحاب مہاجرین سے ترک سوال کی بیعت لی ہے جس کا ذکر کتب احادیث میں ہے کہ وہ اصحاب رسول اللہ جو اس بیعت میں شریک تھے اور جن کو ترک سوال کی ہدایت ہوئی تھی، وہ اس قدر پابند تھے کہ حرف سوال ان کی زبان پر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اپنے رسالہ "قول الجمیل" میں یہ حدیث ترک سوال کی بحث میں نقل کی ہے "وروی ابن ماجة انه بایع ناسا من فقراء المهاجرین علی ان لایسئلوا الناس شیأ فکان احدهم یسقط سوطه فینزل عن فرسه فیا خذه ولا یسئل احدا" یعنی حضرت ابن ماجہ سے روایت ہے کہ وہ فقراء مہاجرین جن کو ہدایت ہوئی تھی کہ خلق سے کسی چیز کا سوال نہ کرنا، وہ گھوڑے پر اگر سوار ہوتے تھے اور ان کا کوڑا اگر جاتا تھا تو سوال کرنے سے اس قدر احتیاط تھی کہ ان کو یہ بھی گوارا نہیں ہوتا تھا کہ کسی سے کوڑا اٹھا دینے کا سوال کریں بلکہ گھوڑے سے اتر کے خود اپنا کوڑا اٹھا لیتے تھے۔

علیٰ ہذا شیخ عبدالحق محقق دہلوی شرح سفر السعادت میں لکھتے ہیں کہ "حکیم بن خزام کہ یکے از اقربائے ام المومنین خدیجہؓ بود چیزے از آنحضرت ﷺ بطلبید

فرمود یاحکیم من می دہم بتو آنرا ولیکن کراہتے باوے ہمراہ خواہد بود نصیحت کرد اورا کہ تا توانی سوال مکن از ہیچ کس گویند کہ بعدازاں حال حکیم درترک سوال بجائے رسیدہ بود کہ اگر تازیانہ از دست وے بیفتادی از کسے نہ طلبیدی ونہ گفتی کہ بردار و بدہ مرا۔''
(حکیم بن حزام جو کہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے قریبی رشتے داروں میں سے تھا اس نے نبی پاک ﷺ سے کوئی چیز مانگی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا اے حکیم میں وہ چیز تمہیں دے دیتا ہوں لیکن اس کے دینے کے ساتھ ناپسندیدگی اس چیز کے ساتھ رہے گی۔ اور آپ نے نصیحت فرمائی کہ جب تک تم سے ہو سکے کسی سے کوئی چیز نہ مانگ۔ اس کے بعد حکیم کا حال یہ تھا کہ سوال نہ کرنے کے معاملہ میں وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ اگر اس کے ہاتھ سے کوڑا بھی گر جاتا تو وہ کسی سے سوال نہ کرتا کہ اسے اٹھا دے۔)

لہٰذا کمالات محمدیہؐ کے مظہراتم نے اس سنت محمدیؐ کو کس خوبی کے ساتھ ادا کیا اور اپنے غلاموں کو عام ہدایت فرمائی کہ ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ'' اور اس پردے میں فیضان سنت صحابہؓ سے ہم کو مستفیض فرمایا۔

(ہشتم) اس مشہور حدیث نبویؐ سے بھی ضمناً ترک سوال کی تائید ہوتی ہے کہ ''عز من قنع و ذل من طمع ''یعنی قناعت باعث عزت اور طمع سبب ذلت ہے۔ جس کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت سرور عالم ﷺ نے قناعت کو محمود اور طمع کو مذموم فرمایا۔ قناعت کی تعریف یہی ہے کہ خدا پر بھروسہ کرے اور یہی ترک سوال کا ماحصل ہے۔ اور طمع کا مفہوم یہ ہے کہ تقسیم حضرت احدیت کو کافی نہ سمجھنا اور مخلوق سے استعانت چاہنا۔ جس کا خلاصہ ہاتھ پھیلانا ہے۔ اسی لئے

ہمارے پیشوائے برحق نے اپنے غلاموں کو فعل محمود یعنی قناعت کی ترغیب دی ہے۔ اور عادت مذموم یعنی طمع سے باز رکھنے کے لئے فرمایا کہ ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔''

(نہم) حدیث مذکورۂ بالا کی نسبت شاید کسی کو یہ عذر ہو کہ اس میں قناعت کا ماحصل ترک سوال اور طمع کا مفہوم ہاتھ پھیلانا اختیار کیا ہے۔ صریح الفاظ میں ترک سوال کی تاکید نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے واضح اور مستند دوسری حدیث اور نقل کرتا ہوں۔ جس میں بغیر کسی تاویل کے صاف لفظوں میں ترک سوال کی ترغیب موجود ہے۔ بلکہ ترغیب بھی اشارہ نہیں ہے واضح طور پر سوال نہ کرنے کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اور تاج المشائخین حضرت شیخ شہاب الدین عمر بن محمد السہر وردی علیہ الرحمتہ نے اپنی مستند کتاب عوارف المعارف کی فصل ہفتم آداب معیشت میں اس حدیث کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن اس مقام پر مصباح الہدایت ترجمہ عوارف المعارف مصنفہ شیخ محمود علی الکاشانی علیہ الرحمتہ سے اس حدیث کو نقل کرتا ہوں۔ وھوھذا ''اماترغیب چناں کہ آمدہ است بروایت ثوبان رضی اللہ عنہ کہ روزے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روے باصحاب کردو گفت ''من یضمن لی بواحدۃ اضمن لہ بالجنۃ'' من گفتم ''انا یا رسول اللہ'' رسول علیہ وآلہ السلام گفت ''لاتسئل الناس شیئا'' (حضور ﷺ نے اس طرح ترغیب دلائی ہے کہ حضرت ثوبانؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن حضور ﷺ نے اپنا رُخ انور صحابہ کرامؓ کی طرف کیا اور فرمایا جو مجھے ضمانت دے گا ایک کی میں اس کیلئے جنت کا ذمہ دار ہوں۔ میں نے کہا یا رسول اللہ میں ضمانت دیتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں سے کوئی شے نہ مانگ۔) یہ حدیث ترک سوال کی مطلقاً ترغیب ہے

کہ غم خوار امت نے پہلے یہ فرمایا کہ میری ایک بات جو قبول کرے تو میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہوتا ہوں۔ جب حضرت ثوبان نے عرض کیا کہ انا یارسول اللّٰہ اس وقت رسول کریمؐ نے اپنے حکم کی یہ تصریح فرمائی کہ مخلوق سے کسی چیز کا سوال نہ کرو۔ لہٰذا ترک سوال کے لئے اس سے زیادہ صراحت اور کیا ہوسکتی ہے کہ" لاتسئل الناس شیئاً "جس کا فصیح اور بامحاورہ ترجمہ یہی ہوگا کہ" کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔" جو حضرت وارث عالم نے اپنے غلاموں سے فرمایا۔

(دہم) اس حدیث سے ترک سوال کی فضیلت تو بخوبی ثابت ہوگئی۔ مگر یہ خیال ہوسکتا ہے نہ سوال کرنے کی مذمت اس میں نہیں ہے۔ لہٰذا اب میں ایک اور حدیث نقل کرتا ہوں جس میں سوال کرنے کی مذمت بھی صاف لفظوں میں موجود ہے۔ اور جس طرح شفقت محمدیؐ نے ترک سوال کی ترغیب میں ہم کو جنت کی بشارت دی ہے۔ اسی طرح سوال کرنے کی ترہیب میں دوزخ کے عذاب سے ہم کو ڈرایا ہے۔ اور سمجھا دیا ہے کہ مال جمع کرنے کے واسطے سوال کرنا آخرت میں تکلیف اور نقصان کا باعث ہوگا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ" ابو ھریرۃ من تسئل الناس اموالھم تکثرا فانماھی جمر الی آخرۃ "یعنی حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول محترم ﷺ نے کہ جو لوگوں سے مال جمع کرنے کے لئے سوال کرے گا تو وہ مال اس کے حق میں جہنم کی چنگاریاں ہیں۔" اس حدیث سے ظاہر ہوگیا کہ مال جمع کرنے کے لئے سوال من الناس قطعی ممنوع ہے۔ اسی واسطے ہمارے دست گیر نے یہ حکم عام نافذ فرمایا کہ" کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔"

(یازدہم) اگر یہ شبہ ہو کہ احادیث مذکورہ میں ترغیب و ترہیب اور اس کی

بشارت اور وعید کی وضاحت تو کافی طور پر ہے۔لیکن سوال یا ترک سوال کے جواز اور عدم جواز اور اس کی حلت اور حرمت کا ذکر ان میں نہیں ہے۔لہٰذا اس رفع شک کے واسطے اور ایک حدیث مستند نقل کرتا ہوں جس کو صاحب مشارق الانوار نے بھی لکھا ہے۔اور جس میں حکم قطعی ہے کہ سوال کرنا حرام ہے۔صرف تین مجبوریوں کے وقت سوال کرنا جائز فرمایا ہے لیکن ان مجبوریوں کی حالت میں بھی یہ حکم نہیں دیا ہے کہ سوال کرو۔محض ہماری آسانی کے واسطے بطور رخصت یہ فرمایا ہے کہ سوال کر سکتے ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ "یا قبیصة ان المسئلة لا محل الا لا حد ثلاثه " یعنی قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ اے قبیصہ سوال کرنا حلال نہیں ہے۔مگر ایک شخص کو ان تین قسم کے اشخاص میں سے پھر اشخاص مستثنیٰ کی آپؐ نے یہ تصریح فرمائی کہ ایک وہ مرد جس نے دوسرے کا بوجھ (قرضہ) اپنے اوپر لیا۔اس کو سوال کرنا حلال ہے۔اور جب اس قدر مال جمع ہو جائے تو پھر سوال نہ کرے۔دوسرا وہ مرد جس پر ایسی آفت پڑے کہ اس کا مال برباد ہو جائے تو اس کو سوال کرنا حلال ہے،اس قدر کہ اپنی زندگی کے لائق پیدا کرے۔اور تیسرا وہ مرد کہ جس کو فاقہ کی نوبت پہنچے اور اس کی قوم کے تین مرد عاقل گواہی دیں کہ اس کو فاقہ ہے تو سوال کرنا حلال ہے کہ گزارہ زندگی کے لائق حاصل کرے۔یا یوں فرمایا کہ زندگی کے سدرمق حاصل کرے۔اس کے بعد حکم عام اور قطعی یہ فرمایا کہ "فما سواهن من المسئلة قبيصة سحت يا كلها صاحبها صحتا "یعنی سوائے ان تین اشخاص کے سوال کرنا اے قبیصہ حرام ہے۔کھاتا ہے سوال کرنے والا حرام کو۔ اب یہ شبہ بھی جاتا رہا۔اور بخوبی ثابت ہوگیا کہ سوال کرنا حرام ہے۔اور

جن تین اشخاص کے واسطے سوال کرنا حلال بھی کیا ہےتو کیسی سخت مجبوری میں۔اور وہ بھی کیسے شرائط کے ساتھ کہ شخص اوّل کو رخصت محض اس لئے دی گئی کہ دوسرے کا بوجھ اٹھایا۔اپنی ذات کے واسطے سوال نہیں کرتا ہے۔اور دوسرے مصیبت زدہ کے لئے اجازت ہےتو اس قدر کہ گزارہ زندگی کے لائق یا زندگی کے سدرمق حاصل کرے تیسرے شخص کو فاقہ کی حالت میں اگر سوال کرنا حلال ہوا،تو وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ تین مرد عاقل اس کے فاقہ کی گواہی دیں۔غرض انتہائی مجبوری کے وقت اسی طرح سوال کرنا جائز کیا ہے جس طرح مضطر کے لئے مردار کھانا حلال ہے۔

(دوازدہم) حدیث مذکورۂ بالا سے یہ بخوبی ثابت ہوگیا کہ سوال کرنا حرام ہے۔لیکن ہماری آسانی کے لئے تین حاجت مندوں کو رخصت دی گئی ہے۔حالانکہ یہ رخصت عموماً حرمت سوال کو زائل نہیں کرتی ہے۔تاہم اور ایک حدیث نقل کرتا ہوں جس میں قطعی اور عام طور پر بغیر کسی استثنیٰ کے سوال کرنے کی ممانعت موجود ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں عبداللہ ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ فرمایا آنحضرت ﷺ نے کہ "ما تـزل المسئلة بالعبد حتى يلقى الله ومافى وجهه مضعة"یعنی سوال کرنے والا جب خدا کے حضور میں جائے گا تو اس کے چہرے پر گوشت کی بوٹی نہ ہوگی۔یعنی بروز قیامت وہ نہایت شرمندہ اور ذلیل وخوار ہوگا۔اس حدیث سے صاف ظاہر ہوگیا کہ سوال کرنا قطعی ممنوع ہے۔اسی واسطے ہمارے سرکار عالم پناہ نے اپنے غلاموں کو عام طور پر یہ ہدایت پر یہ ہدایت فرمائی کہ "کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔"

اس تصریح سے کما حقہ ثابت ہوگیا کہ ہاتھ پھیلانا یقینی اخلاق انسانیہ کے

خلاف اور طریقت کے منافی اور شریعت میں ممنوع بلکہ حرام ہے۔اور ترک سوال اسی کا عکس ہے کہ شریعت کی جانب سے انعامات کی بشارتیں بھی ہیں اور مقدسین ارباب طریقت کی خاص سنت بھی ہے۔ اسی واسطے ہمارے پیشوائے برحق نے یہ ہدایت فرمائی کہ ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ'' یعنی تمامی معاملات خالق برحق کے سپرد کرو۔اور حرص وطمع جو صفات ذمیمہ کی اصل ہیں،ان سے احتراز کرو۔ بلکہ اکثر حضور اپنے غلاموں سے مخاطب ہو کر بطور ہدایت یہ شعر پڑھتے تھے جس میں حرص وطمع کی قطعی ممانعت ہے۔

زہد وتقوے چیست اے مرد فقیر
لاطمع بودن ز سلطان و امیر

(اے مردِ فقیر! زہد وتقویٰ کیا شے ہے؟ امیر اور بادشاہ سے بے طمع ہوجانا۔)

درحقیقت حرص وطمع ایسی مذموم خصلت ہے جو علاوہ دنیاوی توہین اور تذلیل کے دینی ترقیات میں بھی حارج ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں ؎

دل چو آلودست از حرص و ہوا　کے شود مکشوف اسرار خدا
صد تمنا در دل اے بوالفضول　کے کند نور خدا در دل نزول
دین و دنیا ہر دو کے آید بدست　ایں فضولیہا مکن اے خود پرست
بر تو قسمت می رسدا ے بے خبر　پس چرا قانع نے برخشک و تر
حرص تو دلق قناعت پارہ کرد　نفس امارہ ترا آوارہ کرد
ایں سخن در گوش داری اے جواں　مولوی گفتہ ز روئے امتحاں

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں   ایں خیال ست ومحال ست وجنوں

(اگر دل حرص اور خواہش سے آلودہ ہے تو خدا کے اسرار اس کے سامنے کب کھل سکتے ہیں۔ اے فضول انسان تیرے دل میں سینکڑوں تمنائیں موجود ہیں تو ایسے دل میں اللہ کی معرفت کے نور کا کیسے نزول ہو۔ دین اور دنیا کب حاصل ہوتے ہیں۔ یہ فضول باتیں ہیں۔ اے خود پرستی کے شکار یہ گمان مت کر۔ تیری قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ تجھے مل جائے گا۔ پس تو خشک اور تر پر کیوں قناعت کرنے والا نہیں ہے۔ تیری حرص و ہوس نے قناعت کی گودڑی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اور نفس امارہ نے تجھے آوارہ کر دیا ہے۔ یہ بات اے جوان یاد رکھ۔ مولانا رومؒ نے بطور آزمائش یہ فرمایا ہے۔ اگر تو خدا چاہے گا اور ساتھ کمینی دنیا بھی چاہے گا تو یہ محض ایک خیال، محال اور جنون ہے۔)

اور اسی حرص وطمع کا ضمیمہ حسد ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ حسد بلحاظ معنی اور باعتبار حرص وطمع کا مرادف ہے۔ چنانچہ حضرت تاج المشائخ شیخ شہاب الدینؒ نے عوارف المعارف میں جو حسد کی تعریف تحریر فرمائی ہے اور جس کا ترجمہ محمود بن علی الکاشانی نے کیا وہ یہ ہے۔ ''از بہر تکاثر وتفاخر، یا بہر خوف فقر واحتیاج وچوں ایں صفت در نفس قوی گردو حسد از وتولد کند۔ زیرا کہ حسد بخیلی کردنست بمال دیگراں نخواہد کہ کسی چیزی بدیگرے رسد۔ واگر کسی را بنعمتے مخصوص بیند زوال آں طلبد۔ وچوں قوت زیادت گیرد حقد پدید آید، ہر کرا با خود در نعمتے مساہم یا مساوی یا بدیا بتفضیلے متمیز بیند یا سبب انتزاع نعمتی از خود پندارد یا موجب امتناع کرامتے شناسد زوال وہلاک او را پیوستہ خواہاں بود۔'' (اشیاء کو کثیر کرنے کیلئے اور فخر کیلئے یا فقر کے خوف سے یا ضرورت کے واسطے، جب یہ صفت انسان کے باطن میں مضبوط ہو جائے تو اس سے

حسد پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ حسد بخیلی کرتا ہے، دوسروں کے مال کی کہ کسی کو کوئی چیز ملے۔ اور اگر کسی کے پاس کوئی خاص نعمت دیکھتا ہے تو اس کے زوال پذیر ہونے کی خواہش کرتا ہے۔ اور جب یہ حسد بڑھتا ہے تو پھر اس کی جگہ حقد پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کسی کو وہ نعمت کے اندر اپنے برابر سمجھتا ہے یا زیادہ مال کی وجہ سے اپنے سے برتر سمجھتا ہے یا اپنی نعمت کے ضائع ہونے کا سبب خیال کرتا ہے یا کرامت کے نہ ہونے کا سبب سمجھتا ہے اور اس کے زوال اور ہلاکت کا ہمیشہ خواہش مند رہتا ہے۔)

پس حرص یا سوال جس طرح ممنوع و مذموم ہے اسی طرح حسد بھی عقلاً و نقلاً مخالف اخلاق اور مخرب ایمان ہے۔ اسی واسطے ہمارے حضور نے یہ بھی فرمایا کہ حسد سے احتراز کرو، چنانچہ ایک مرتبہ حضوری میں چند غلامان بارگاہ حاضر تھے۔ اور آپ حسب عادت متبسم لبوں سے مختلف مسائل تصوف کا ذکر مختلف پیرایہ میں فرمارہے تھے۔ جناب حضرت کی اس خاص توجہ اور شفقت سے بعض غلاموں کو یہ جرأت ہوئی کہ اس مشہور مقولہ کی تحقیق کے لئے عرض کیا کہ حضور تہتر فرقوں میں ناجی فرقہ کون ہے؟ آپ نے عجب شان سے مسکرا کے یہ فرمایا کہ ''جس میں حسد نہ ہو'' کیا خوب کسی شاعر نے اسی مضمون کو نظم کیا ہے۔ ؎

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

اور یہ بھی اکثر ارشاد فرمایا ہے کہ ''حسد میں سوائے نقصان کے فائدہ نہیں۔'' اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ''حاسد ہمیشہ ذلیل رہتا ہے۔'' اور یہ تو متواتر ارشاد ہوا ہے کہ ''حسد سے ایمان خراب ہوتا ہے۔'' واقعی حسد مخرب ایمان ضرور ہے۔ اس لئے

کہ جب حقیقت حسد یہ ہے۔ کہ اس کا تعلق نفس سے ہے۔ اور نفس جسد انسان میں روح کی ضد ہے۔ اور یہ کلیہ ہے کہ خواہشات نفسانیہ سے روح ضعیف اور ایمان خراب ہوتا ہے۔

لہٰذا حسد صفات ذمیمہ میں ایسی خراب اور مذموم صفت ہے جو دیگر صفات رذیلہ یعنی بعض کینہ، کبر، غرور، بخل وغیرہ کے اصل ہے۔ جس کو مولانا روم علیہ الرحمتہ نے مجملاً یہ فرمایا ہے۔

در حسد گیرد ترا در رہ گلو — در حسد ابلیس را باشد غلو
کوز آدم ننگ دارد در حسد — با سعادت جنگ دارد در حسد
عقبہ زیں صعب تر در راہ نیست — آں خنک آں کس حسد ہمراہ نیست
خانما نہا از حسد باشد خراب — باز شاہی از حسد گردد غراب

(تصوف کے راستے میں حسد تیرے گلے کو پکڑے گا۔ حسد ابلیس کیلئے گلے کا طوق ہے۔ کہ وہ آدمؑ سے حسد میں شرم کرتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہوئے حسد کی وجہ سے جنگ کیلئے نبرد آزما ہے۔ سلوک کے راستے میں اس سے بڑھ کر زیادہ عذاب اور کوئی نہیں ہے۔ وہ آدمی بڑا سعادت مند ہے کہ جس کے ساتھ حسد نہیں ہے۔ حسد کی وجہ سے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ بادشاہی حسد کی وجہ سے کوا بن جاتی ہے۔)

حقیقت میں حاسد "خسر الدنیا و الآخرۃ" کا مصداق ہوتا ہے کہ ابلیس ایسا نامی و معزز فرشتہ جو معلم الملوک کے لقب سے ممتاز تھا۔ مگر اسی حسد کی وجہ سے معتوب و مغضوب ہوا کہ آدم علیہ السلام کا فضل و کمال نہ دیکھ سکا، اور غرور و خودی کے جوش میں "خلقتنی من نار و خلقته من طین" (تو نے مجھے آگ سے پیدا

کیا ہے اوراس کوتو نے مٹی سے بنایا ہے۔سورۃ الاعراف:۱۲) کہنے لگا۔اور یہ عظمت آدم کہ''خلق اللّٰہ آدم علی صورته''اورحقیقت ابوالبشر کہ''ونفخت فیه من روحی''(اوراس پیکر(بشری کے باطن) میں اپنی (نورانی) روح پھونک دوں۔سورۃ الحجر:۲۹) کونہ خیال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رجیم لعین کا خطاب ملا۔(اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا)چنانچہ مولانا قدس سرہ بھی عام نصیحت کے پیرایہ میں فرماتے ہیں۔

چوں کنی با بے حسد مکر وحسد　　زاں حسد دل راسیاہیہا رسد

خاک شومرداں حق رازیر پا　　خاک برسرکن حسد راہم چوما

(جب تو ایسے آدمی سے حسد کرے گا جو حسد کرنے کے لائق نہیں ہے تواس حسد سے تیرے دل کو سیاہی حاصل ہوتی ہے۔مردانِ حق کے پاؤں کی مٹی بن جا۔ہماری طرح حسد کے سر پہ خاک ڈال۔)

علی ہذا تفسیر کبیر میں حضرت امام فخر الدین رازی علیہ الرحمتہ نے سورۂ فاتحہ کے تحت میں لکھا ہے کہ منافذ شیطانی تین ہیں شہوت،غضب،ہوس۔اوران تینوں کے علیحدہ علیحدہ نتائج ہیں۔یعنی حرص اور بخل شہوت کا نتیجہ ہے۔اور کبرونخوت غضب کا۔اور کفر و بدعت ہوس کا۔لیکن یہ چھ صفات رذیلہ جب مجتمع ہوجاتی ہیں،توانہیں سے افرادانسانی میں ساتویں چیز پیدا ہوجاتی ہے جس کا نام حسد ہے۔اس لئے تمام اخلاق ذمیمہ کا اصل الاصول حسد ہے اور جملہ عادات قبیحہ حسد پر ختم ہوجاتے ہیں۔اسی باعث سے خداوندکریم عزاسمہ نے''و من شر حاسد اذا حسد''(اور(میں رب کی پناہ مانگتا ہوں)ہر حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔سورۃ

الفلق:۵) پرتمام شرورانسانی کا خاتمہ کردیا جس طرح ابلیس کا وسوسہ بلحاظ شروایذار سانی تمام دیگر وساوس سے بالاتر ہے اسی طرح نوع بنی آدم کے حسد کو جملہ عادات قبیحہ پرفوقیت ہے۔

غرض یہ ثابت ہوگیا کہ جس طرح تمام صفات رذیلہ کی اصل حرص وطمع ہے اسی طرح قناعت باعث اوصاف حمیدہ ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ؎

کوزہ چشم حریصاں پر نشد
تا صدف قانع نشد پر در نشد

(حریصوں کی آنکھ کا کوزہ کبھی نہیں بھرتا۔ صدف جب تک قناعت کرنے والا نہ ہوتو وہ موتیوں سے نہیں بھرتا۔)

یعنی حرص مانع کمالات ہوتی ہے۔ چنانچہ محققین علم معدنیات کی تحقیق ہے کہ اگر قطرۂ آب نیساں لے کر صدف اپنا منہ بند کر لیتی ہے تو وہ قطرہ موتی ہوجاتا ہے۔ اور اگر ایک قطرہ لینے کے بعد وہی صدف اور قطروں کے واسطے بار بار منہ کھولتی ہے تو اس صدف میں موتی نہیں پیدا ہوتا، اسی مضمون کو حضرت مولانا نے مثال میں فرمایا ہے کہ حرص ایسی مذموم صفت ہے کہ فقط انسان ہی کے واسطے مانع ترقی نہیں ہے بلکہ اس رذیل خصلت سے معدنیات کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن اس رذیل عادت کا ایک علاج بھی بتایا ہے جس سے یہ عیب قطعی طور پر ہمیشہ کے لئے زائل ہوجاتا ہے جس کو دوسرے شعر میں آپ فرماتے ہیں ؎

ہرکہ را جامہ زعشقے چاک شد
اوزحرص وعیب کلی پاک شد

(جب کسی کا لباس عشق کی وجہ سے چاک ہوگیا۔ تو وہ مکمل طور پر حرص اور عیب سے پاک ہوگیا۔)

یعنی قلب انسان کو جب صادق سے سروکار ہوجاتا ہے تو حرص بلکہ تمامی عیوب سے وہ پاک ہوجاتا ہے۔ یہی مجرب نسخہ ہمارے طبیب باطنی نے ہمارے واسطے تجویز فرمایا کہ جہاں یہ ارشاد ہوا ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ'' اسی کے ساتھ یہ بھی حکم ہوا کہ ''محبت کرو'' کیونکہ بغیر محبت کے حرص وطمع کا سد باب ہونا محال ہے۔

الغرض ہمارے حق میں جناب حضرت کا یہ ارشاد فرمانا کہ ''کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ''۔ جو بظاہر روزمرہ کی بات یا معمولی نصیحت معلوم ہوتی ہے۔ مگر درحقیقت یہ بہت بڑی تعلیم اور مہتم بالشان ہدایت ہے۔ اور یہ کلیہ ایسا جامع ارشاد ہوا ہے جو اصول شریعت کے مطابق اور احکام طریقت کے موافق ہے۔ اور اسی ہدایت کی تعمیل پر حصول مقصود اصلی کا بھی انحصار ہے۔ اور حضرت احدیت جل وعلا کی شان ربوبیت کا یقین کامل بھی اسی سے ہوتا ہے۔ گو بعض حضرات صوفیہ کے تذکرہ میں یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے اکثر طلب رزق کے لئے اسباب وتوسل پر نظر کی اور کبھی بقدر ضرورت سوال بھی کیا۔ مگر درحقیقت ان کا سوال مثل ہمارے سوال کے نہیں ہوتا۔ گو صورت دونوں کی ایک ہی کیوں نہ ہو لیکن حقیقت میں بڑا تفرقہ ہے۔ بقول ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
گفتہ اینک مابشر ایشاں بشر — ما وایشاں بستۂ خوابیم و خو
ایں ندا نستند ایشاں از عمیٰ — ہست فرقے درمیاں بے انتہا

این خورد گردد پلیدی زو جدا　　و آں خورد گردد ہمہ نور خدا

(پاک لوگوں کا کام اپنے اوپر قیاس نہ کر۔ اگر چہ لکھنے میں لفظ شیر اور شیر برابر ہی ہیں۔ تمام جہان اسی وجہ سے گمراہ ہو گیا کہ اللہ کے ابدالوں کے مراتب سے لوگ کم آگاہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہ بات کہی کہ ہم بھی بشر ہیں اور وہ بھی انسان ہیں اور ہم اور وہ سونے اور کھانے کے پابند ہیں۔ اندھاپن ہونے کی وجہ سے انہوں نے یہ بات نہ جانی کہ ہم میں اور ان میں بے حساب فرق ہے۔ یہ کھاتا ہے تو اس سے پلیدی جدا ہوتی ہے اور وہ کھاتا ہے تو اُس سے نورِ خدا کا ظہور ہوتا ہے۔)

مثلاً ہمارا سوال کرنے کا مقصود جسم کو آرام پہنچانا ہے۔ جس کی تحریک نفس کی خواہش سے ہوتی ہے۔ اور حضرات صوفیہ کا سوال کرنا اکثر کتمان اور خفا کی غرض سے ہوتا ہے کہ خلق میں ان کی سرداری کا اظہار نہ ہو۔ اور نمود و شہرت کی نوبت بھی نہ آئے۔ اور کبھی نفس کی گوشمالی اور اس کے تزکیہ کے واسطے سائلوں کی صورت میں اس لباس حقارت کو اختیار فرماتے ہیں۔

اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ منازل سلوک میں ایک حالت ہے جو اکثر سالکین پر طاری ہوتی ہے۔ اور اس کا اقتضا یہ ہے کہ خاص قسم کا انتشار و اضطرار پیدا ہوتا ہے۔ اور طبیعت میں رعونت اور خودداری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ جس کی اصلاح کا مفید طریقہ یہی ہے کہ جب تک وہ کیفیت رہتی ہے بقدر ضرورت سوال کرتے ہیں اور جب یہ حالت اطمینان اور جمعیت خاطر سے مبدل ہو جاتی ہے تو پھر بدستور کفالت حق تعالیٰ جل وعلا پر قناعت کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم ادہم کے حالات میں منقول ہے کہ ایک زمانہ میں بخیال لقمۂ حلال آپ نے کسب بھی کیا۔ اور

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ جامع بصرہ میں آپ معتکف ہوئے تیسرے روز افطار کرنے لگے۔ اور شب افطار میں آپ دروازوں پر جا کر سوال کرتے تھے، اور چند لقمے جو ملتے تھے انہیں پر اکتفا فرماتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ کیفیت ہوگئی کہ اعانت رب العزت پر توکل کیا۔ اور استعانت مخلوق سے قطعی احتراز فرمایا۔

اسی طرح ابوجعفر حداد جو حضرت جنید کے استاد تھے۔ چندروز کے واسطے ان کی بھی یہی حالت ہوگئی تھی کہ دوسری یا تیسری سب کو عشا کے وقت حجرہ سے نکلتے تھے اور بقدر احتیاج سوال کرتے تھے۔ مگر پھر بدستور وہی صورت اختیار کی۔ عطائے غیبی پر قناعت کامل فرمائی۔

علیٰ ہذا حضرت ابوسعید خراز علیہ الرحمتہ نے بھی کچھ روز یہی کیا کہ جب محتاج ہوتے تھے تو ہاتھ پھیلا کر "یا نبی اللہ" فرماتے تھے۔ لیکن جب حالت بدل گئی، تو پھر گوشۂ قناعت اختیار فرمایا اور استعانت مخلوق کو حرام سمجھا۔

اس لئے حضرات صوفیہ کا بلحاظ اصلاح نفس واقتضائے وقت طلب رزق کے لئے کسب کرنا نہ مثل ہمارے کسب کے ہے۔ اور نہ ان کا عارضی طور پر سوال کرنا ہمارے سوال کے مانند ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں رضائے مطلوب حقیقی کے واسطے کرتے ہیں۔ بلکہ مولانا تو یہ فرماتے ہیں کہ ان حضرات کا فعل گو بہ ظاہر نامحمود ہی کیوں نہ ہو مگر درحقیت وہ محمود اور مسعود ہوتا ہے۔

ہرچہ گیرد علتی علت شود کفر گیرد کاملے ملت شود
کاملے گر خاک گیرد زر شود ناقص از زر برد خاکستر شود
ذات او بہ زطاعت پیش حق پیش کفرش جملہ ایمانہا خلق

(جو کوئی علت یعنی سبب اختیار کرتا ہے۔ وہ سبب بن جاتا ہے۔ اگر کوئی کامل شخص بظاہر کفر اختیار کرے تو وہ دین بن جاتا ہے۔ کوئی کامل اگر مٹی کو ہاتھ لگاتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ اور ناقص، نااہل سونے کو پکڑے تو وہ مٹی بن جاتا ہے۔ اللہ کے سامنے طاعت سے بڑھ کر اس کی ذات ہے۔ اس کے کفر کے سامنے سب کچھ ایمان بن جاتا ہے۔)

لیکن توکل چونکہ مدارج علیا میں بہت بڑا مرتبہ ہے اس لئے قناعت میں حضرات صوفیہ کی حالت حسب درجات ان کے مختلف ہے۔ توکل کا قلب سے تعلق ہے۔ اور یہ روحانی ترقی ہے۔ لہٰذا بعض حضرات بجہت صفت حال طلب رزق کے لئے توسل اور اسباب بھی اختیار کرتے ہیں اور کبھی کسب کو سبب بناتے ہیں۔

اور بعض اہل جمیعت اور صاحب حال جن کی قوت اختیار یہ قضا و قدرت کی قوت کی قدرت کاملہ کے سامنے فنا ہو چکی ہے وہ کفالت حق تعالیٰ پر اکتفا فرماتے ہیں۔ اور یہ اہل یقین اسباب رزق کے لئے کوئی سبب پسند نہیں کرتے۔ اور نہ ماسوا اللہ سے استعانت چاہتے ہیں۔ جس قدر اور جس طریق سے مسبب الاسباب ان کو رزق پہنچاتا ہے اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت بایزید قدس سرہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں آپ کو کسی کام میں مشغول نہیں دیکھتا۔ آخر آپ کا سبب معاش کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "**مولائی یرزق الکلب و الخنزیر و تراہ الا یرزق ابایزید**" (میرا مولا کتے کو رزق دیتا ہے اور خنزیر کو بھی، اور تو دیکھتا ہے، تو کیا وہ بایزید کو رزق نہیں دے گا۔) اور ہمارے حضور نے بھی متواتر یہ فرمایا ہے کہ "جو شخص خدا پر بھروسہ کرتا ہے خدا اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔" اور مولانا علیہ الرحمۃ نے بھی ایک

حکایت اسی مضمون کی لکھی ہے کہ ۔

آں یکے زاہد شنید از مصطفیٰؐ — کہ یقیں آید بجاں رزق خدا

گر تو خواہی ورنہ خواہی رزق تو — پیش تو آید دواں از عشق تو

(ایک زاہد نے نبی پاکؐ کی ایک حدیث پاک سنی کہ یقینی طور پر اللہ کا رزق بندے کو پہنچتا ہے۔ اگر تو اس رزق کو پانے کی کوشش کرے تو ٹھیک ورنہ وہ رزق خود بخود چل کر تجھ تک پہنچ جائے گا۔ تیری محبت کی وجہ سے دوڑتا ہوا تیرے سامنے آ جائے گا۔)

پھر وہ زاہد اس تجربہ کے واسطہ کہ رزق بے طلب کیونکر پہنچتا ہے۔ ایک پہاڑ پر جا کر خاموش بیٹھا۔ ناگاہ ایک قافلہ ادھر سے گزرا، اور اہل قافلہ کو حیرت ہوئی کہ ایسے خوفناک مقام میں یہ کیوں پڑا ہے۔ دریافت کیا۔ مگر زاہد نے جب کوئی جواب یہ دیا تو خیال ہوا کہ یہ بھوکا ہے، اور شدت ضعف سے طاقت کلام نہیں۔ فوراً روٹی لا کر کھلانا چاہی لیکن زاہد نے دانت بند کر لئے۔ تب ۔

کارد آور دند قوم اشتافتند — بستہ دندا نہاش را بشگافتند

بختند اندر دہانش شوربا — می فشر دند اندراں ناں پا رہا

گفت دل دانم بقاصد می کنم — راز قست اللہ بر جان وتنم

امتحاں زیں بیشتر خود چوں بود — رزق سوئے صابراں خود میرود

بعد ازاں بکشاد آں مسکیں دہن — گفت کردم امتحاں کہ رزق من

ہر چہ گفت ست آں رسول پاک حبیب — ہست حق ونیست دروے ہیچ ریب

(قوم دوڑی اور چھری لائی اور اس کے بند شدہ دانتوں کو آپس سے جدا کیا۔ اس کے منہ میں انہوں نے شوربا ڈالا اور روٹی ڈالی۔ اس نے کہا کہ میں دل سے جانتا ہوں کہ

اللہ تعالیٰ میرے جسم اور جان پر رازق ہے۔اس سے بڑھ کر اور امتحان کس طرح ہو گا۔رزق صبر کرنے والوں کی طرف خود چل کر پہنچ جاتا ہے۔اس کے بعد اس مسکین نے منہ کھولا۔اس نے کہا کہ میں امتحان کر رہا تھا کہ میرا رزق مجھ تک کیسے پہنچتا ہے۔ جو کچھ نبی پاکؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ یا آدمی رزق تک پہنچ جاتا ہے یا رزق آدمی تک پہنچ جاتا ہے۔یہ سچی بات ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔)

اور بعض متوکلین نہ خلق سے استعانت چاہتے ہیں، اور نہ خالق سے روزی مانگتے ہیں۔ بقول حافظ علیہ الرحمۃ۔

نیست در دائرہ یک نقطہ خلاف از کم وبیش
کہ من ایں مسئلہ بے چون و چرامی بینم

(اس دائرہ میں ایک نقطہ بھی جو حضورؐ نے فرمایا ہے اس کے خلاف نہیں ہے نہ کم وبیش ہے۔کیونکہ میں یہ مسئلہ بغیر کسی اعتراض کے دیکھ رہا ہوں۔)

جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا شناس اپنے علم وارادت کو ذات خداوندی کے علم وارادت کے آگے محو کرتے ہیں۔اور تصدیق کامل کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ علم الٰہی جو بے پایاں اور غیر محدود ہے ہمارے مصالح ہم سے زیادہ جانتا ہے۔اس لئے ان کا یقین کامل سوال کرنے سے ان کو مستغنی کر دیتا ہے۔جیسا حضرت ابراہیم خلیلؑ اللہ نے کہا تھا کہ ''**حسبی عن سوالی علمه بحالی** ''(میرا سوال کرنا اس کیلئے کافی ہے کہ وہ میرے حال سے واقف ہے۔) یہ مرتبہ عاشقان باخدا اور فقرائے باصفا کا ہے چنانچہ مشہور مقولہ ہے کہ''**الفقر لا يحتاج الى الله** ''(فقیر اللہ سے بھی کوئی حاجت طلب نہیں کرتا۔) اصطلاح تصوف میں ان متوکلین کو اصحاب فتوح کہتے

ہیں کیونکہ رزق ان کا فتوحات غیبی پر منحصر ہے۔ جب بغیر طمع نفس غیب سے روزی پہنچتی ہے اس کو یہ قبول کرتے ہیں۔

اور اسی طبقہ اہل فتوح میں بعض حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو فتوح غیب سے ان کو پہنچتا ہے۔ اس کے لینے میں بھی اور اس کے تقسیم کرنے میں بھی وہ توقف فرماتے ہیں اور ہر دو حال میں ہوائے نفس کو شریک جانتے ہیں۔

اور بعض متوکلین فتوحات غیبی کے لینے میں تامل کرتے ہیں اور دوسروں پر تقسیم کرنے میں تردد نہیں فرماتے اس لئے کہ تقسیم کرنے میں حظ نفس کا اشتراک نہیں دیکھتے۔

اور اکثر قناعت گزیں تقسیم کرنے میں توقف فرماتے ہیں اور فیوحات غیبی کے لینے میں تامل نہیں کرتے جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ فتوحات غیبی کے آنے کو محض اختیار معبود اور مجرد فعل حق جانتے ہیں اور اس کی تقسیم کو اپنا اختیار اور فعل سمجھتے ہیں۔

اور بعض مقربین نہ فتوحات غیبی کے لینے میں توقف فرماتے ہیں اور نہ اس کی تقسیم میں تامل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ نور توحید مطلق کے آگے ایسے محو اور مستغرق ہوتے ہیں کہ ان کو دوئی نظر نہیں آتی۔

لہٰذا حضرات متوکلین کی شان ان کے حال اور واردات کے لحاظ سے مختلف اور جداگانہ ہوتی ہے۔ ماوشما کا کام نہیں کہ قناعت کے مدعی ہوں۔ یہ منصب انہیں ابرار اور مقدس بزرگوں کا ہے جو صاحب تجرید اور تعلقات دنیا سے دست بردار ہوتے ہیں ان کا صبر اور توکل اس کا مقتضی ہوتا ہے کہ غیر خدا سے استعانت چاہتے ہیں نہ کسب کو رزق رسانی کا سبب بناتے ہیں۔ جو کچھ بارگاہ مسبب الاسباب سے ان کو

پہنچتا ہے اسی پر قناعت کرتے ہیں لیکن باوجود اس اہمیت کے حضور نے اپنے غلاموں سے عام طور پر یہ ہدایت فرمائی کہ "کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔" مگر کس خوبی کے ساتھ یہ ارشاد ہوا۔ اور شفقت وارثی نے ہماری حیثیت اور استعداد کے لحاظ سے ایسے جامع اور مناسب حال الفاظ میں یہ حکم صادر فرمایا کہ احتیاط کرنے سے جس کی تعمیل ممکن ہوتی ہے۔ کیونکہ بہت آسان کر دیا ہے کہ صرف سوال کرنا جو یقینی اخلاق و عزت، شریعت وطریقت، مذہب ومشرب کے خلاف ہے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ اور چونکہ ہم علائق دنیا میں آلودہ ہیں اس لئے ہم کو تلاش معاش کی رخصت دی گئی اور یہ فرمایا کہ رزق کی بہم رسانی کے واسطے کسب بھی نہ کرو، حالانکہ وہ احکام جو حضور نے اپنے فقراء کے واسطے مخصوص طور پر صادر فرمائے ہیں، اور جن کا ذکر انشاء اللہ آئندہ آئے گا۔ اس میں کسب واسباب کی بھی قید ہے۔ مگر اس حکم عام کو ترک کسب اور ترک اسباب کی شرط سے مشروط نہیں فرمایا۔ اور اسی قدر ارشاد ہوا کہ "کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ" (لا یکلف اللّٰه نفسا الا وسعها۔ سورۃ البقرۃ:۲۸۶)

الغرض بصورت امر ہمیں یہ ہدایت ہوئی کہ "محبت کرو۔" اور منہیات میں ترک سوال کو لازمی گردانا۔ اور تھوڑا غور کرنے سے بھی ثابت ہو گیا کہ یہی دو ہدایتیں جملہ ریاضات اور مجاہدات کی اصل ہیں۔ مگر تاہم اسکی بھی صراحت ضروری ہے کہ دیگر اذکار واشغال کے متعلق حضور نے ہماری کیا تعلیم فرمائی ہے گو اس کی پوری تفصیل تو ناممکن اور محالات ہے۔ اس لئے کہ مخصوص ہدایتیں بھی مخصوص طور پر ہوئی ہیں۔ اور اس طبیب باطنی نے ہمارے مختلف طبائع اور جداگانہ حالت کے لحاظ سے ہمارا علاج الگ مختلف عنوان سے کیا جس کی تصریح میں ہماری واقفیت قاصر ہے اور اگر بقدر

معلومات نگارش بھی کریں تو اس مختصر رسالہ میں ان تمام ارشادات کی گنجائش نہیں۔اور نہ اس رسالہ میں ان ہدایات کا تذکرہ مقصود ہے جو فرداًفرداً غلامان وارثی سے مخصوص ہیں بلکہ انہیں ارشادات کا ذکر منظور ہے،جن میں تعلیم ہو،اور جن کی تمامی مریدین سے یکساں تعلق ہو اور جن کو اکثر برادران طریقت نے بگوش خود سنا بھی ہو۔

لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ مثل دیگر طرق حضرات صوفیہ طریق محبت میں کسی ریاضت اور مجاہدات کا کوئی خاص قاعدہ معین نہیں ہے۔ بقول ''مذہب عشق از ہمہ دینہا جداست'' (مذہب عشق تمام ادیان سے الگ ہے۔) چنانچہ جناب حضرت نے بھی متواتر یہ فرمایا ہے کہ'' محبت میں انتقام نہیں۔'' اور ظاہر ہے کہ انتقام کیونکر ہو۔ جب قلب میں سوز محبت جاگزیں ہوا۔ اور دل مضطرب اور بے تاب ہو گیا تو جس وقت اور جس طریقہ سے اور جس زبان میں چاہتا ہے مطلوب کو یاد کرتا ہے جیسا مولانا علیہ الرحمتہ نے اس چرواہے کے قصہ میں فرمایا جو بہزار عجز و نیاز زبان حال سے شاہد حقیقی کی یاد میں مصروف تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی تہدید سے خاموش ہو گیا۔ جس کے سکوت کا یہ اثر ہوا کہ ؎

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا
بندۂ مارا زمن کردی جدا

(اللہ کی طرف سے موسیٰ کی طرف وحی آئی۔ ہمارے بندے کو تو نے کیوں ہم سے جدا کردیا۔)

لیکن بمقتضائے بشریت محبت کا وابستہ بھی کسی شغل میں مصروف ضرور رہتا ہے اور اس شغل کی تحقیق اس سے زیادہ واضع اور مستند اور کیا ہو سکتی ہے کہ فرمایا حضرت

رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے ''من احب شیأ اکثر ذکرہ ''یعنی عاشقوں کا وظیفہ یہی ہے کہ ہمیشہ محبوب کے نام کی تسبیح پڑھتے ہیں۔

پس حضرت وارث عالم کی عنایت خاص سے جب ہم کو یہ ہدایت ہو چکی کہ ''محبت کرو'' جس کو محض روح سے سروکار ہے تو ہمارے واسطے ریاضت بھی اسی رعایت سے تجویز ہوئی جس کو قلب سے تعلق اور محبت سے مناسبت ہے۔یعنی مختلف قواعد سے ہم کو ذکر اسم ذات کی تعلیم فرمائی۔کیونکہ محبّ ہمیشہ وصال ذات محبوب کا طلب گار اور ماسوائے یار موجودات سے دست بردار رہتا ہے۔اس لئے ہدایت بھی ہوئی تو اکثر ذکرہ کی رعایت سے کہ ''اسم ذات کو حرز جاں بناؤ،اور مطلوب حقیقی کا نام لیا کرو۔''

چنانچہ مزاج ہمایوں کا عام طور پر یہ انداز تھا کہ جب کسی طالب نے تعلیم کی استدعا کی تو ارشاد ہوا کہ ''اللہ اللہ کیا کرو۔'' اس تعلیم میں جس قدر سادگی ہے اسی قدر وہ متعدد خوبیوں سے مملو ہے۔اس لئے کہ ذکر اسم ذات کے فضائل بے شمار ہیں۔اور تمامی مشاہیر حضرات صوفیہ نے ذکر اسم ذات کو افضل فرمایا ہے۔جیسا کہ حضرت شیخ احمد ابوالعباس مرسی علیہ الرحمۃ جن کا اکابر عارفین میں شمار ہے،اپنے اصحاب کو اسم اللہ کے ذکر کی تاکید کرتے اور فرماتے تھے''یہ اسم سلطان الاسماً ہے اور اس کی بساط اس کا ثمرہ ہے بساط اس کی علم ہے اور ثمرہ اس کا نور ہے اور اگر نور حاصل ہو جائے تو کشف و عیاں کا وقوع ہوتا ہے۔''(طبقات الکبریٰ)

علاوہ اس کے یہی ایک ہدایت عام مریدین کے واسطے بھی مفید اور خواص کی کاربراری کے لئے بھی کافی تھی۔مثلاً وہ طالب جس کے دل میں شوق وصال الٰہی نے

اپنا گھر بنانے کے لئے ابھی بنیاد ڈالی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ایسا مسافر راہ سلوک جس نے اس وادیٔ غیر محدود کی پہلی منزل طے کرنے کے لئے ہنوز کمر باندھی ہے۔ اس کو اگر یہ ہدایت ہوئی تو وہ اسم ذات کا زبانی ورد کرتا تھا۔ اور بعض کے واسطے تعداد کی بھی قید اور وقت کی بھی پابندی تھی۔

اور وہ خوش نصیب جن کے قلب کو خدا نے صلاحیت اور استعداد مرحمت فرمائی تھی، ان کے لئے اسی اسم ذات کا ذکر بالجہر تجویز ہوتا تھا۔ اور جن کی طلب میں پختگی اور جوش میں ترقی ہوجاتی تھی وہ بحسب وعدہ پاس انفاس ذکر اسم ذات کے عامل ہوتے تھے۔

چنانچہ محققین حضرات صوفیہ نے اس میں بحث کی ہے کہ طالب کے لئے ذکر بالجہر بہتر ہے یا بالخفا۔ لیکن اس کا تصفیہ یہ فرمایا ہے کہ ذکر کا طریقہ ذاکر کی حالت پر منحصر ہے جس کی تصریح شیخ محمد عبدالواہب شاذلی علیہ الرحمۃ نے یہ کی ہے کہ "جو طالب مبتدی ہے اس کے لئے ذکر بالجہر افضل ہے۔ اور جس پر جمعیت غالب ہو اس کے لئے ذکر سری مفید ہے اور حضرت ابوالحسین بن حبان جو مصر کے مشاہیر صوفیہ میں سے تھے فرمایا ہے کہ "زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا درجات پیدا کرتا ہے۔ اور قلب سے اس کا ذکر کرنا قرابت پیدا کرتا ہے۔" (طبقات الکبریٰ)

بعض طالبین کو جناب حضرت نے ذکر اسم ذات جلالی طریقہ سے بھی تعلیم فرمایا۔ یعنی اللہ کی ہا کو پیش کے ساتھ اس طرح پڑھو کہ جس سے واؤ کا اظہار ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضور نے ایک حلقہ بگوش کو ذکر اللہ ہو جب تعلیم فرمایا تو اس نے یہ عرض کیا کہ اس کی تعمیل بالجہر کروں یا بالخفاء۔ آپ نے اس کی بھی تصریح کر دی کہ تنہائی

محض یاصحرامیں بالجہر کرنااور ہر وقت بالخفا۔

اور ایک مرتبہ حضور نے اپنے ایک تہبند پوش کو ذکر اللہ ہو تعلیم فرمایا۔ دوسرے مرید نے بھی جواسی جلسہ میں موجود تھا،استدعا کی۔اس کو آپ نے اسم ذات کا حکم دیا۔اور پاس انفاس کا قاعدہ بتایا۔اس نے عرض کیا کہ میری خواہش ہے کہ ذکر اللہ ہوکا مجھ کوبھی حکم ہو۔آپ نے فرمایا کہ تمہارے واسطے یہی مناسب ہے۔

اور بعض دست گرفتہ جن کے دل کوسوز محبت سے سروکار ہوتا تھا۔ان کے ذکر پاس انفاس میں بھی تبدیلی کی جاتی تھی۔اور ذکر کا وہ طریقہ تعلیم ہوتا تھا کہ جس کو خیال سے تعلق ہوتا تھا۔

غرض مختلف صورتوں میں آپ نے ذکر اسم ذات کی تعلیم فرمائی لیکن ان غلامان وارثی کی تعداد زیادہ ہے جوذکر بالخفا کرتے ہیں۔اور حضور نے بھی عام طور پر متواتر فرمایا ہے کہ عاشق وہ ہے جس کی کوئی سانس خالی نہ جائے۔چنانچہ یہ بھی آیا ہے کہ ”صلوۃ الانبیآء والا ولیآء حبس الحواس وعد الا نفاس عندالقلوب من نیاز المحبوب“ (انبیاءاوراولیاء کی نماز اپنے حواس کو بند رکھنا اور اپنے دل میں سانسوں کی مالا جپنا،کوئی سانس خالی نہ جانے دینا۔یہ محبوب کی نیاز مندی سے ہے۔) بلکہ اسی مضمون کو آپ کے فقیر اوگھٹ شاہ صاحب نے بطور یاداشت زبان برج بھاشا میں یوں نظم کیا ہے۔

اوگھٹ چیلا وہی گنی جو اپنی سدھ بسرائے
دھیان رہے اور گیان رکھے اور سانس نہ خالی جائے

علی ہذا مشاہیر حضرات صوفیہ نے بھی یہ فرمایا ہے کہ جب عارف بوجہ غفلت

کے ایک سانس میں بھی ذکر کو ترک کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر نفس کو مسلط کر دیتا ہے۔ اور وہی اس کا مصاحب ہو جاتا ہے۔

اور شیخ ابوالنجیب عبدالقادر سہروردی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ "اہل تصوف کے نزدیک سب سے افضل انفاس کا شمار ہے۔ اور شیخ احمد بن الحسین رفاعی کا مقولہ ہے کہ فقیر کو لازم ہے کہ اپنی ہر سانس کو سرخ گندھک سے زیادہ قیمتی سمجھے، اور اس لئے ہر سانس میں وہی چیز ودیعت کرے جو سب سے قیمتی ہو۔ پس اس کی کوئی سانس خالی نہ جائے اور حضرت بوعلی شاہ قلندر فرماتے ہیں ؎

پاس دار انفاس اے اہل خرد — تا ترایں قافلہ منزل برد
ہوش در دم دار اے مرد خدا — یک نفس یک دم مباش از حق جدا
اسم ذات او جو بر دل نقش بست — سکۂ ضرب محبت خوش نشست
گشت چوں بر نقش دل نقش الہ — غیر نقش اللہ را اے دل مخواہ
چوں شوی فانی تو از ذکر خدا — راہ یابی در حریم کبریا

(اے عقلمند آدمی اپنے سانس کی حفاظت کر، تا کہ تجھے یہ قافلہ منزل تک پہنچا دے۔ اے مردِ خدا اپنے سانس میں ہوش رکھ، خبر دار رہ۔ ایک لحہ بھی، ایک دم بھی اپنے اللہ سے جدا نہ ہو۔ اللہ کا اسم ذات جب تو نے دل پہ نقش کر لیا تو گویا اللہ کی بہترین محبت کی مہر اس پہ لگالی۔ جب دل پہ الٰہ کا نقش ہو گیا تو اے دل اللہ کے نقش کے سوا اور کوئی شے نہ چاہ۔ جب تو اللہ کے ذکر میں فناہ ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالیہ میں تو راستہ حاصل کر لے گا۔)

اور درحقیقت ذکر اسی شان سے کرنا چاہئے۔ کیونکہ ذکر نسیان کی ضد ہے۔

اور اسی وجہ سے عین عبادت ہے۔ اور جب عبادت میں سہو اور نقصان ہوا تو طالب کی طلب صادق میں نقصان سمجھا جائے گا۔ اور یاد مطلوب میں نقصان محبت کے منافی ہے۔ بدیں وجہ حضور نے اپنے غلاموں کو شمار انفاس کی ہدایت فرمائی جس کو محبت سے کامل نسبت ہے۔

چونکہ باعتبار دیگر اذکار اسم ذات میں کسی قدر تعمیم ضرور پائی جاتی ہے اس سبب سے میں نے اس کا تذکرہ کیا کہ اگر اس کو عام ہدایت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس کی جیسی طلب واستعداد تھی، اسی لحاظ سے اس کی ہدایت ہوئی چنانچہ کسی کو ذکر نفی واثبات کا حکم ہوا۔ اور وہ بھی مختلف طریقے سے کسی کو صرف اثبات یعنی الا اللہ کا ذکر تعلیم فرمایا۔ اور قدیم حلقہ بگوش اکثر اسم حق کے عامل تھے۔ اور ان میں یہ دیکھا ہے کہ مختلف طریقہ سے وہ اسم حق کا ذکر کرتے تھے۔ بعض بالخفا بعض بالجہر اور پھر بالجہر میں بھی تفریق تھی۔ بعض اسم حق کو باہر کی سانس میں اعلیٰ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ کے فقیر معصوم شاہ صاحب جن کا زیادہ قیام دہلی میں رہتا تھا۔ ان کے ذکر کا یہی طریقہ تھا۔ اور ضلع بارہ بنکی کے متوطن عبداللہ شاہ جن کا لقب حق شاہ ہوگیا تھا۔ وہ بھی اسی صورت سے اسم حق کا ذکر کرتے تھے۔ بلکہ ان کی ضرب تو ایسی پختہ اور مؤثر تھی کہ جب وہ ذکر کرتے تھے تو حاضرین کی زبان پر بے ساختہ اسم حق جاری ہو جاتا تھا۔

اور بعض فقرا کی ضرب فضائی قلب سے تعلق رکھتی تھی جیسے کہ شاہ ولی انصاری جن کا امروہے میں مزار ہے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ جس جلسہ میں وہ ذکر کرتے تھے ان کی ضرب اس شدومد کے ساتھ فضائی قلب پڑتی تھی کہ ایک قسم کی آواز آتی تھی، اور

سامعین کے قلب بے چین ہو جاتے تھے۔

علیٰ ہذا غلامان وارثی کو جس طرح اسم ذات کی تعلیم زیادہ ہوئی اسی طرح جناب والا نے ذکر درود شریف کی بھی ہدایت متواتر فرمائی، اور اکثر مریدین کی استدعا پر یہ حکم دیا کہ "درود شریف پڑھا کرو۔ لیکن طالب کی حالت کو ضرور ملحوظ رکھا۔ اور جو حکم جس کے لائق مفید متصور ہوا، وہی اس کو دیا۔ کسی کے واسطے تعداد بھی متعین فرمائی۔ کسی کو مسلسل ورد کی ہدایت ہوئی۔ اور اگر کسی نے دریافت کیا کہ کس درود کا ورد کروں؟ تو اس کے لئے کسی خاص درود کی تصریح بھی کردی۔ لیکن اکثر آپ نے "اللّٰھم صل علے محمد و آل محمد و بارک وسلم" کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔

گو یہ طریقۂ تعلیم بہت سادہ ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ عامۂ مریدین کے لئے بھی ذکر درود شریف کی تعلیم خصوصیت سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ علاوہ فیضان باطنی کے بظاہر بھی جناب حضرت ذاکر کی حیثیت و استعداد کے لحاظ سے کوئی ایسا قاعدہ ضرور تعلیم فرما دیتے تھے جس کو روحانیت سے تعلق اور محبت سے نسبت ہوتی تھی۔ کیونکہ آپ مجتہد فی طریق العشق ہیں۔ اس لئے آپ کی کوئی ہدایت ایسی نہیں دیکھی جس کو محبت سے نسبت نہ ہو۔ اور درود شریف تو کلیتہً مقتضائے محبت ہے۔ جیسا کہ صاحب تفسیر عرائس البیان نے جلد۲ صفحہ۱۶۰ میں لکھا ہے "قال ابن عطا الصلوة من اللّٰہ وصلة و من الملا ئکة رفعة ومن الا مة متابعة و محبته" کہ صلوۃ من اللہ کی حقیقت اس کا وصل ہے اور درود ملائکہ کی تعریف رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان و رفعت کا اظہار ہے جب امت کی طرف سے درود پیش ہوگا تو آپ کی متابعت اور محبت مقصود ہوگی۔

ابن عطا کے اس قول سے واضح ہوگیا کہ ہمارے ہدیۂ درود کی ماہیت یہ ہے کہ ہم بہزار عجز و نیاز بارگاہ رسالت میں آپ کی متابعت اور محبت کی درخواست کرتے ہیں اس لئے محض لسانی استدعاء متابعت اور محبت کے واسطے کافی نہیں ہے۔ بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ یہ درخواست زبان قلب سے ہو۔ کیونکہ متابعت اور محبت کو قلب و روح سے تعلق ہے اس واسطے ذکر درود شریف کے لئے حضور وارث عالم نے یہ لازمی گردانا کہ ذاکر کی حیثیت کے لحاظ سے گو اس کی ابتدائی حالت کیوں نہ ہو مگر درود لسانی کے ساتھ قلبی و روحی مشارکت ضرور ہو۔ اور جس قدر ذاکر کی استعداد میں ترقی ہو اسی قدر روحی مشارکت زیادہ ہوتی جائے حتیٰ کہ جب ذاکر یکسوئی اور جمعیت حاصل ہو تو محض زبان قلب سے اور پھر خیال سے یہ استدعا کرے۔ اور بالآخر ذکر و ذاکر و مذکور میں فرق و امتیاز نہ رہے۔ بقول حضرت بہلول علیہ الرحمتہ

ذکر و فکر و زہد و تقویٰ سوختہ

جہۂ وصل حقیقی دوختہ

(جب تو واصل بحق ہو جائے گا تو ذکر اور فکر، زہد اور تقویٰ سب ختم ہو جائیں گے۔)

اگر یہ شبہ ہو کہ متابعت اور محبت میں منافات یا تفاوت ہے کہ محبت کیفیت قلبی اور اتباع جوارح کا فعل معلوم ہوتا ہے جس کے لغوی معنی پیروی کے ہیں۔ تو رفع شک کے واسطے تھوڑا غور درکار ہے۔ اور سمجھنا چاہئے کہ متابعت کے معنی پیروی کرنا ضرور ہے مگر پیروی جوارح کے واسطے مخصوص بھی نہیں ہے۔ قلب سے بھی خیال سے بھی پیروی ہو سکتی ہے بلکہ یہ پیروی افضل ہے جوارح کی پیروی سے۔ علاوہ اس کے ابن عطا نے متابعت اور محبت کا یکساں ذکر کیا ہے۔ اور یہ مسلمہ ہے کہ محبت کو محض قلب

سے تعلق ہے تو لازم ہوا کہ متابعت سے یہاں وہی اتباع مراد ہو جس کو محبت کی طرح قلب سے سروکار ہے۔اور متابعت کو قلب سے نسبت ضرور ہے۔ کیونکہ متبع اسی فعل کو کرتا ہے جو مرغوب اور پسندیدہ ہوتا ہے۔اور رغبت اور پسندیدگی قلب کا عمل اور محبت کا نتیجہ ہے یا یوں کہا جائے کہ رغبت کے واسطے محبت لازم اور محبت کے لئے رغبت ملزوم ہے اور بغیر رغبت و محبت متابعت محال ہے۔

قطع نظر اس کے حضرات عارفین نے متابعت کی حقیقت وہی بیان کی ہے جو محبت کی ہے۔ چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمۃ طبقات الکبریٰ میں لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو قطب زماں اور سلسلۂ شاذلیہ کے شیخ الطائفہ تھے فرمایا ہے کہ "میں نے رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا، اور عرض کیا کہ رسول اللہ متابعت کی حقیقت کیا ہے؟ آنحضرت نے فرمایا کہ ہر شے کے نزدیک اور ہر شے میں متبوع کا دیکھنا۔" اور یہی تعریف محبت کی ہے "یحرق ما سواء المحبوب" کہ بجز محبوب کے اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

ایسے مقتدر محدث کی مستند کتاب سے اور ایسے مقدس اور ابرار شخص کا قول اور وہ بھی ان کا ذاتی اجتہاد نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کردہ متابعت کی حقیقت جب معلوم ہوگئی تو اب وہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ متابعت اور محبت کا ایک حکم نہیں بلکہ متابعت اور محبت کی وہی تعریف ہے جو ابن عطا نے بیان کی۔

علیٰ ہذا حضرت روز بہاں مقلی الشیر ازی علیہ الرحمۃ نے تفسیر عرائس البیان فی حقائق القرآن میں آیہ کریمہ "ان اللّٰہ و ملا ئکتہ یصلون علی النبی . یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ و سلموا تسلیما O" (بے شک اللہ اور اس کے

فرشتے نبی مکرم ﷺ پہ درود بھیجتے رہتے ہیں، تم بھی اے ایمان والو! ان پر درود بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔ سورۃ الاحزاب:۵٦) کی تحت میں صلوۃ من اللہ وصلوۃ ملائکہ کی تعریف کے بعد صلوۃ امت کی نسبت لکھا ہے۔ کہ **صلوۃ الامۃ علیہ متا بعتھم لہ و محبتھم ایاہ و الثناء علیہ بالذکر الجمیل** "(امت کی صلوٰۃ آپ کی اتباع کرنا اور خاص طور پر اس کے ساتھ محبت کرنا ہے اور اس کی حمد وثناء کرنا ہے، اچھے انداز سے۔) کہ آپ کی متابعت اور محبت میں ذکر جمیل کے ساتھ آپ کی تعریف کریں۔

درود شریف کی یہ تعریف جوروز بہاں علیہ الرحمتہ نے بیان کی ہے اور محبت کی تعریف مرادف ہے کہ محبّ اپنے محبوب کی متابعت اور ذکر کرتا ہے۔ بمصداق "**فقد اکثر ذکرہ**" اور مسلمہ ہے کہ محبت کو قلب سے تعلق ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ ذکر درود شریف کو بقدر امکان واستعداد قلب سے سروکار ہو۔

اسی طرح ابن عربی علیہ الرحمتہ نے متابعت اور محبت کو یکساں بیان کیا ہے۔ اور اپنی تفسیر میں آیہ **ان اللّٰہ وملائکتہ یصلون علی النبی** (الیٰ آخرہ) کے تحت میں صلوۃ امت کی اور زیادہ وضاحت فرمائی ہے۔ اور لکھا ہے کہ صلوۃ کے معنی یہ ہیں "**حقیقۃ صلٰوتھم علیہ قبو لھم بھد ایۃ و کمالہ و محبتھم لذاتہ و صفاتہ**" درود امت کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ہدایت کو قبول کریں۔ اور محبت ذات وصفات میں محو ہو جائیں۔ لیکن یہ مرتبہ ان ذاکرین صلوۃ کا ہے جن کو ذات سے سروکار ہوتا ہے جیسا کہ تفسیر عرائس البیان میں آیۂ "**یا ایھا الذین امنوا اذکروا اللّٰہ**" (اے ایمان والو! تم اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔ سورۃ الاحزاب:۴۱) کی تفسیر

میں مدارج ذکر کی نسبت لکھا ہے کہ ''بالسان فی مقام النفس والحضور فی مقام القلب المناجاۃ فی مقام السروالمشاھدۃ فی مقام الروح و المواصلۃ فی مقام الخفأ و الفنأ فی مقام الذات ''(زبان سے دل میں ذکر کرنااوردل میں ہروقت اللہ کے جلوہ کو حاضر رکھنا۔سر یعنی خفی میں اللہ سے سرگوشی کرنا اورروح سے مشاہدہ کرنا،مقام خفا میں واصل بحق ہونا اور فنا فی ذات ہو جانا۔)اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ ذکر میں بلحاظ استعداد تفرقہ ہےاورذکر کے مدارج ہیں کہ زبانی ذکر مقام نفس ہےاورحضوری مقام قلب ہےاورمناجات مقام سر ہےاورمشاہدۂ جمال مقام روح ہے اور وصل مطلوب مقام خفا اور فنا یعنی ہستی مطلوب کے سامنے ذاکر کے وجود ہستی کا نیست ونابود ہونا مقام ذات ہےاور یہ بغیر محبت کے حاصل نہیں ہوتا۔

اسی واسطے ہمارے سرکار عالم پناہ نے ذکردرودشریف کی تعلیم اسی قاعدہ سے فرمائی جس کوروحانیت سے تعلق اورمحبت سے نسبت تھی۔بلکہ بعض مریدین کوذکر درودشریف جلالی قاعدہ سے تعلیم فرمایا جس سے وہ بہت جلد کامیاب اور فائز المرام ہوئے۔چنانچہ یہ مشہورواقعہ ہے کہ عبدالصمد ساکن مسولی ضلع بارہ بنکی نے استدعا کی کہ ذکردرودشریف کی جلالی قاعدہ سے ہدایت ہواورحضور کی بندہ نوازی تھی کہ اسی قاعدہ سے ذکردرودشریف ان کوتعلیم فرمایا جس کی تعداد بھی بہت کم تھی لیکن مشاہدات کی تاب ان کو نہ ہوئی،آخر پڑھنا موقوف کردیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ فضیحت شاہ صاحب جومعمراوراذکارواشغال سے بخوبی واقف تھے حضور کا تخاطب پا کر تازہ تعلیم کے مستدعی ہوئے۔ارشاد ہوا کہ'' درود

شریف پڑھا کرو" انہوں نے تعداد کی بھی صراحت چاہی تو فرمایا کہ " پانچ سو مرتبہ پڑھا کرو" مجھ کو یہ خیال ہوا کہ یہ صاحب جوش اور باخبر فقیر ہیں ضرور ان کو جلالی طریق سے درود شریف تعلیم ہوگا لیکن اس قاعدہ کے لحاظ سے چونکہ تعداد زیادہ تھی اور شاہ صاحب کی آسانی بھی مطلوب تھی۔ اس وجہ سے عرض کیا کہ حضور تعداد زیادہ ہے ارشاد ہوا کہ اچھا، سو مرتبہ پڑھا کریں۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اس کا بھی تحمل شاید ناممکن ہوگا۔ اس وقت حضور نے فرمایا کہ " جلالی قاعدہ سے نہیں، بلکہ معمولی طریقہ سے بتایا ہے" اور فضیحت شاہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ " تم پانچ سو مرتبہ درود شریف سب کو پڑھ لیا کرو۔ اور جو شغل تمہارا ہے اس کو قائم رکھو۔"

لیکن حضور اکثر یہ فرماتے تھے کہ " بغیر محبت کے ذکر سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔" اور کبھی یہ ارشاد ہوتا تھا کہ " اسی ذکر سے فائدہ ہوتا ہے جو بے غرض ہوتا ہے۔" اس سے صاف ظاہر ہوا کہ ریاضت بغیر محبت کے بے سود ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مشرب محبت میں ریاضت کا عین اصول یہ ہے کہ بجز رضائے مطلوب جملہ خواہشات سے بے غرض اور تمامی مرادات سے بے واسطہ رہنا لازمی ہے۔ بقول حافظ شیراز علیہ الرحمتہ ؎

من ہماندم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق

چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

(جب میں عشق کے چشمہ سے وضو کرتا ہوں تو جو کچھ اس ذات میں موجود ہیں میں انہیں ذبح کر دیتا ہوں۔)

اور صاحب مراۃ الاسرار نے عارف ربانی حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی علیہ

الرحمتہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ''از روے پرسیدند کہ اخلاص چیست۔ گفت ہر چہ برائے حق کنی اخلاص است وہر چہ برائے خود کنی ریاست۔'' (آپ سے پوچھا گیا کہ اخلاص کیا چیز ہے تو آپ نے فرمایا کہ جو کچھ تو اللہ کیلئے کرے گا اخلاص ہے اور جو کچھ تو اپنے لئے کرے گا وہ ریا ہے۔)

خلاصہ یہ کہ غلامان وارثی کی تعلیم ان کی حالت اور کیفیت کے لحاظ سے ہوئی جس کی تشریح ناممکن ہے اور یہ مختصر تصریح بھی تمثیلاً نگارش ہوئی۔ ورنہ حضور کی وہ تعلیم جس کا ہمیں فخر وناز ہے وہ نہ احاطۂ تحریر میں آسکتی ہے اور نہ تقریر سے اس کی حقیقت ادا کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس کے اظہار میں یوں کہنا چاہئے کہ گونگے کا خواب ہے کہ دیکھا سب کچھ مگر بیاں نہیں کر سکتا جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جو الفاظ ہم کو یاد ہیں، وہ اس حالت کے اظہار کے واسطے کافی نہیں۔ ہاں مجملاً اور اشارۃً اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ۔

''ایک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی''

اور جانتے ہیں کہ اس آگ نے ہماری ہستی کو برباد کیا۔ مگر پھر بھی زبان سے نکلتا ہے تو یہی نکلتا ہے۔

اگرچہ مستی عشقم خراب کرد ولے
اساس ہستی من زیں خراب آباد است

(اگر چہ تیرے عشق کی مستی نے مجھے خراب کر دیا ہے۔ لیکن میری ذات کی بنیاد اسی خرابی سے آباد ہوئی۔)

حقیقت یہ ہے کہ اصل تعلیم جو کچھ ہوئی ہے۔ حضور کی توجہ خاص سے ہوئی ہے جس میں ہماری سعی اور کوشش کو کچھ دخل نہیں۔ اور یوں ہی آج بھی ہوتی ہے۔ اور

انشاءاللہ ہمیشہ ہوگی۔اور بڑے بڑے سمجھدار اس کی ماہیت دریافت کرنے میں قاصرو مجبور رہیں گے۔کیونکہ حضور کا مشرب عشق تھا۔اور غلاموں کی تعلیم بھی ہوئی تو محبت کی ہوئی جس کی حقیقت کا اظہار ناممکن بلکہ محالات سے ہے۔

پس جس طرح عامہ مریدین کو بظاہر ذکراسم ذات اور درودخوانی کی ہدایت ہوئی،اسی طرح حضور نے بغیر کسی تخصیص کے جملہ مریدین کو بار بار اس کی بھی تاکید فرمائی ہے کہ تصور میں پختگی حاصل کرو۔چنانچہ قریب قریب روزمرہ ایسا ہوا ہے کہ جب آپ نے غلاموں کی جانب تخاطب فرمایا،تومنجملہ دیگر نصائح کے صاف لفظوں میں یہ بھی ارشاد ہوتا تھا کہ''ایک صورت کو پکڑلو وہی تمہارے ساتھ رہے گی۔''اوراکثر اس مضمون کواپنے ان الفاظ میں عام طور سے فرمایا ہے کہ''جوصورت تمہاے ساتھ یہاں رہے گی وہی مرتے وقت اور وہی قبر میں اور وہی حشر میں تمہارے ساتھ رہے گی۔''اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ''جس کے تصور میں مروگے قیامت کے روز اسی صورت کو دیکھوگے۔''

یہ ہدایات بالمعنی مرادف ہیں۔اور باوجوداختصار کے تھوڑاغورکرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارشادات بہت بڑے انعامات ہیں۔اورحصول مرادات کا اسی شغل پرانحصار ہے۔اور یہ عین دست گیری اور غلام نوازی کی شان ہے کہ ہمارے وارث عالم پناہ نے ایک شغل کے عوض میں اس قدر وسیع وعدہ فرمایا جو ہماری امیداور آرزو سے بہت زیادہ اور جملہ خواہشات ومرادات کی درستگی کے واسطے کافی اور بس ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ غلامان وارثی جواس ہدایت پرعمل کرتے اور دولت

سرمدی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور بڑے عالی ظرف ہیں جن کے گوشۂ دل میں برزخ پیشوا محفوظ ہے۔ واللہ ان کی زندگی بھی بے بہا زندگی ہے، اوران کا مرنا بھی ان کے واسطے حیات جاوید سے بہتر ہے۔ اور روز قیامت بھی ان کے لئے شب وصال سے کم نہ ہوگا، کہ اپنے محبوب کی تصویر سے ہم کنار عرصۂ محشر میں آئیں گے۔ اور آج بھی انہیں کو شایاں ہے کہ بہزار فخر ومباہات وہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

روز قیامت ہر کسے دردست گیرد نامہ

من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل

(قیامت کے دن ہر شخص اپنے ہاتھ میں نامۂ اعمال پکڑے گا لیکن میں جب حاضر ہوں گا تو میری بغل میں اپنے محبوب کی تصویر ہوگی۔)

ان ہدایات کی شرح اور تصور شیخ کی خوبیوں کا ذکر اگر بہ تصریح کیا جائے تو بہت زیادہ طوالت ہوگی۔ کیونکہ حضرات عارفین نے اپنی تصانیف میں تصور شیخ کے فوائد نہایت شرح وبسط کے ساتھ ارقام فرمائے ہیں جن کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرید کی یافت پیشوا کے تصور پر منحصر ہے۔ اور سالک کو منازل سلوک میں بھی برزخ شیخ خضر راہ بن کر جوار مطلوب حقیقی تک پہنچاتی ہے۔ اور اسی تصور شیخ سے طالب صادق اسرار الٰہی کا مشاہدہ کرتا ہے جس کا اقرار حضرت حافظ شیراز نے بھی کیا ہے ؎

ہر دم از روئے تو نقشے زندم راہ خیال

باکہ گویم کہ دریں پردہ چہا می بینم

(میں ہر لحہ اپنے خیال میں تیرے رُخ انور کا نقش بناتا ہوں۔ میں کس سے بیان

کروں کہ میں پردے میں کیادیکھتاہوں۔)

علیٰ ہذا حضرت مولانا قدس سرہ نے بھی اپنی مثنوی میں تصور شیخ کے مفاد بکثرت بیان فرمائے ہیں۔ بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ صورت متصورہ حشر میں ظاہر ہوگی۔ اور ہمارے فہم کے لائق اس کی تمثیل یہ دی ہے کہ جس طرح تخم زمین کے اندر پوشیدہ رہ کرآخر بہ شکل نخل ظاہر ہوتا ہے۔ جودرحقیقت اس کی اصلی صورت ہے۔اسی طرح جو صورت آج مزرعۂ دل میں مخفی ہے یہ کل قیامت کے روز اپنی اصلی صورت پرنمایاں ہوگی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

آں خیالے از دروں آید بروں — چوں زمیں کہ زائد از تخم دروں

ہر خیالے کہ کند در دل وطن — روز محشر صورتے خواہد شدن

(وہ خیال باطن سے ظاہر میں آتا ہے۔ جیسے زمین اندر کے بیج سے بڑھ جاتی ہے۔روزِ محشر ہمارے اندر کا بیج باہر آجائے گا۔ ہروہ خیال جودل میں اپناوطن بنالیتا ہے قیامت کے دن اس خیال کی ایک صورت اس کے سامنے آجائے گی۔)

اور دوسری جگہ مولانا موصوف نے مفادتصور کی وضاحت اور زیادہ فرمائی ہے اور صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے کہ جوصورت اس عالم میں دل نشیں ہوگی اسی صورت متصورہ کے ساتھ محشور ہونالازمی ہے۔ وھوھذا

صورتے کاں برنہادت غالب است

ہم براں تصویر حشرت واجب است

(وہی صورت جو تیرے دل پر غالب ہے روزِ محشر تو لازمی اسی صورت کے ساتھ ہوگا۔)

علاوہ اس کے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "کما تعیشون تموتون کما تموتون تبعثون "۔یعنی زندگی میں جوخیال رہے گا، اسی خیال میں مرو گے اور جس خیال میں مرو گے اسی خیال میں محشور ہو گے۔ اس مستند حدیث سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ اہل تصور کی موت صورت متصورہ کے ساتھ ہوتی ہے۔اور وہ قیامت کے روز بھی اسی صورت متصورہ کے ساتھ محشور ہوں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تصور کسی صورت محمود کا ہے تو فائدہ اٹھائیں گے۔اور اگر شخص مذموم کا ہے تو ذلیل ہوں گے نقصان پائیں گے، اور اس کا تصفیہ کہ خیال محمود اور تصور مذموم کا فرق و امتیاز کیونکر ہو اس کے واسطے حضرات عارفین کی تصنیفات کا مطالعہ کافی ہے۔ جن کا ایک ایک ورق زبان حال سے منادی کرتا ہے کہ دنیا میں رہ نمائے کامل کے تصور سے بہتر اور محمود کوئی خیال نہیں۔اس واسطے کہ خیال صحبت روحانی ہے۔اور یہ مسلم الثبوت ہے کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا کا یہ مقولہ مشہور ہے ؎

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

(نیک آدمی کی سنگت اسے نیک بنادیتی ہے اور برے آدمی کی سنگت اسے برا بنادیتی ہے۔)

پس پیشوائے طریقت کی صحبت عقلاً ونقلاً محمود ومسعود ہے۔اس لئے تصور شیخ جملہ موجودات کے خیال سے افضل ہے۔اور جب ایسے سعید خیال کے ساتھ مریں گے، اور اسی خیال کے ساتھ محشور ہوں گے تو ضرور سعادت نصیب ہوگی۔

لہٰذا اس مستند حدیث کا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ یہی ہوسکتا ہے جو حضور نے

اپنے غلاموں کو بشارت دی کہ ''جوصورت تمہارے ساتھ یہاں رہے گی، وہی مرتے وقت، وہی قبر میں، وہی حشر میں ساتھ رہے گی۔'' جس سے معلوم ہو گیا کہ حصول مقصود اصلی تصور شیخ پر موقوف ہے۔ بلکہ دنیاوی معاملات میں بھی اسی برزخ شیخ کی امداد اور دست گیری سے ہم کامیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ شیخ عنایت اللہ تعلقدار سید نپور جو بارگاہ وارثی کے قدیم حلقہ بگوش تھے، اور حضور بھی ان کے حال پر خاص توجہ فرماتے تھے، خدمت والا میں ملتمس ہوئے کہ تعلقات زمینداری ہمیشہ پیچیدہ رہتے ہیں لہٰذا کوئی اسم حلال مشکلات تعلیم ہو جس کا ورد کروں، حضور نے متبسم لبوں سے فرمایا، کہ ''شیخ جی جب کوئی مشکل پیش آئے تو ہمارا تصور کر لیا کرو'' شیخ صاحب موصوف نے آخر عمر تک اس ہدایت وارثی پر عمل کیا۔ اور ہمیشہ ان کو مشکلات اور مہمات میں اسی تصور شیخ کی بدولت کامیابی نصیب ہوئی۔

علیٰ ہذا مولوی محمد یحییٰ وکیل ورئیس عظیم آباد جن کی عادت تھی کہ حضوری کے وقت بہ لحاظ ادب ساکت اور خاموش رہتے تھے۔ اور جناب حضرت بھی مخصوص طور پر عنایت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ حاضر ہوئے، تو آپ نے فرمایا کہ ''مولوی صاحب تم تصور کیا کرو۔'' مولوی صاحب نے دست بستہ عرض کیا کہ یہ بھی ارشاد ہو کہ کس کا تصور کروں؟ اس وقت جناب والا نے شرم آمیز تبسم کے ساتھ چہرۂ انور پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ ''مولوی صاحب اسی صورت کا تصور کیا کرو۔'' اس کے بعد رخ انور پر گونہ سرخی نمایاں ہوئی، اور پر جوش لہجے میں فرمایا کہ'' اگر ایسا نہ ہو تو انتظام خراب ہو جائے۔''

ایک مرتبہ حضور کی خدمت میں ایک تہبند پوش حلقہ بگوش نے عرض کیا کہ جس

وقت ذکر کرتا ہوں تو یکسوئی اور جمعیت خاطر نہیں ہوتی۔ارشاد ہوا کہ ''تصور کیا کرو''۔ اس نے عرض کیا کہ کس کا تصور کروں؟ آپ نے فرمایا کہ ''جس کو سب سے زیادہ دوست رکھتے ہو۔'' اس نے آپ کی جانب اشارہ کیا، اور کہا کہ میں تو اسی صورت کو دوست رکھتا ہوں۔حکم ہوا کہ ''اسی صورت کا تصور کیا کرو۔خیال بھی پختہ ہو جائے گا، اور یہی صورت ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔''

اور کبھی آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''عاشق کو ایک صورت کے سوا دوسری صورت کا خیال حرام ہے''۔لیکن قرینہ ہے کہ یہ حکم مخصوص ہے اور ان غلاموں کی جانب یہ خطاب ہوا ہوگا جن کے دل باخبر اور سوز و محبت سے گداز تھے۔کیونکہ یہ منصب اہل محبت کا ہے جو ماسوائے یار موجودات سے سروکار نہیں رکھتے۔اور درحقیقت تصور کامل بھی اسی کا نام ہے۔جیسا بلبل شیراز نے فرمایا ہے ؎

صحبت حور نہ خواہم کہ بود عین قصور
با خیال تو اگر باد گرے پروا زم

(حور کی صحبت میں نہیں چاہتا ہوں۔کیونکہ وہ ایک معین صورت ہے۔تیرے خیال کے ساتھ اگر میں کسی دوسرے کے ساتھ مشغول ہو جاؤں تو یہ عین غلطی ہے۔)

یہ عاشقان صادق بعد انقطاع تعلقات ہر وقت مطلوب کی یاد میں مطلوب ہی کا خیال کرتے ہیں۔اور ہر صورت میں مطلوب ہی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔اور دوسری صورت کی دید کو حرام جانتے ہیں۔ بقول

گرچشم بروئے دگرے بازکنم
حق نمک حسن تو کو رم سازد

(اے میرے محبوب! اگر میں اس آنکھ سے کسی غیر کا چہرہ دیکھوں تو تیرے حسن کا حق نمک خواری مجھے اندھا کردے۔)

اگر یہ کہا جائے کہ تصور کا طریقہ کیا تعلیم فرمایا ہے؟ تو اس کی نسبت یہ عرض کروں گا کہ جس طرح ذکر اسم ذات کی تعلیم مختصر طور پر ہوئی، اسی طرح حضور نے اپنے غلاموں کو تصور کی بھی ہدایت ان کی حالت اور استعداد کے لحاظ سے مختلف طریقہ سے کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ طریق محبت میں جس طرح ذکر کے واسطے کوئی خاص قاعدہ معین نہیں ہے، اسی طرح شغل کے واسطے بھی کوئی طریقہ مخصوص نہیں۔ اہل محبت کو اذکار و اشغال کا طریقہ خود ان کا اضطرار خاطر بتادیتا ہے۔ کیونکہ محبت میں آورد نہیں۔ اہل محبت وہی کرتے ہیں جو یاد مطلوب میں ان کی سچی بے قراری ان سے کراتی ہے۔ اسی سے ان کی یاد پر اثر ہوتی ہے کہ ''ہر کہ از دل خیزد بر دل ریزد'' (جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل پہ اثر کرتی ہے۔) کا مضمون ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل محبت کا تصور بھی بغیر کسی سعی اور کوشش کے یوں قائم ہوجاتا ہے کہ یاد مطلوب میں جب زیادہ بے قرار ہوتے ہیں تو صورت مطلوب کے خیال سے دل کو تسکین دیتے ہیں، اور رفتہ رفتہ صورت متصور ایسی قائم ہوجاتی ہے کہ موجودات میں سوائے صورت محبوب ان کو دوسری صورت نظر نہیں آتی۔ بقول

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

حالانکہ ارباب طریقت نے تصور کے قواعد بھی منضبط فرمائے ہیں جو بجائے خود بہت صحیح اور نہایت مفید اور سالک راہ سلوک کے واسطے یقینی بکار آمد ہیں۔ اور ابتدائی حالت میں انہیں قواعد میں ایک طریقہ اختیار کرنا لازم ہے جس کے لئے سعی

اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ طالب اس کی مشق میں جس قدر جدوجہد کرتا ہے اسی قدر اس کے تصور میں پختگی ہوتی ہے مگر وہ تصور جو ''کما تعیشون تموتون کما تموتون تبعثون ''(جس طرح تم زندگی گزارو گے اسی طرح مرو گے اور جس طرح تم مرو گے اسی حال پہ اٹھائے جاؤ گے۔ الحدیث) کا مصداق ہے بغیر محبت کے نہیں قائم ہوتا۔ کیونکہ تصور خاص جس کا نام ہے وہ محبت کا نتیجہ یا محبت کا ضمیمہ ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ محبت کے واسطے تصور لازم اور تصور کے لئے محبت ملزوم ہے کہ محبت ہے تو تصور بھی ہے۔ اور محبت نہیں تو تصور بھی نہیں اور محبت چونکہ وہبی ہوتی ہے جو کسب سے نہیں حاصل ہوتی۔ پس وہ تصور جو عین محبت یا محبت کا خاص نتیجہ ہے اور جس کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ ''جو صورت تمہارے ساتھ یہاں رہے گی وہی مرتے وقت، وہی قبر میں، وہی حشر میں ساتھ رہے گی۔'' سعی وکوشش سے کیونکر حاصل ہوسکتا ہے۔

دوسرا شغل حضور نے شغل سلطان الاذکار بھی اپنے غلاموں کو تعلیم فرمایا ہے۔ لیکن جس طرح تصور کی ہدایت عام اور جملہ مریدین کو بغیر کسی تخصیص کے یکساں ہوئی وہ تعیم شغل مذکور کی تعلیم میں نہیں بلکہ خاص طور پر ہوئی۔ اس لئے صراحت بھی اس کی نہ کروں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جناب حضرت کے بعض بعض حلقہ بگوش اس تعلیم سے مستفیض بھی ہوئے، اور حضور کی تعلیم میں یہ خصوصیت بھی دیکھی کہ شغل سلطان الاذکار کی تعلیم نہایت آسان طریقہ سے فرمائی۔ حالانکہ حضرات مشائخین نے لکھا ہے کہ شغل ہذا کے واسطے ایک زمانے تک مسلسل سعی اور کوشش درکار ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے آج یہ مفید شغل عنقا صفت ہوگیا ہے۔ مگر حضور نے جس دست گرفتہ کو شغل مذکور تعلیم فرمایا۔ تین روز میں اس پر ابتدائی حالت طاری ہوگئی۔ گو طالبین کی یافت اور

کامیابی میں اس عجلت کا باعث آپ کی خاص توجہ کا اثر ہے لیکن طریقہ بھی نہایت آسان تھا۔

اس کا بھی اظہار ہونا چاہئے کہ سرکار عالم پناہ نے مجاہدات کی نسبت ہم کو کیا ہدایت فرمائی۔ لہٰذا مخصوص طور پر جو احکام صادر ہوئے ہیں، ان کا ذکر تو بعد میں کروں گا لیکن بغیر کسی تخصیص کے امیر، غریب، بوڑھے، جوان، مرد، عورت، عالم، جاہل، فقیر، دنیادار، حتی کہ جملہ مریدین کو بلالحاظ حیثیت واستعداد جس مجاہدہ سے سروکار ہے وہ دل کی گرفتاری ہے کہ ہر شخص بقدر یافت اس قدرتی مجاہدہ میں مصروف ہے۔ بارگاہ وارثی کا کوئی غلام ایسا نہ ملے گا جس کے دل کو محبت سے سروکار نہ ہو۔ ہاں کم اور زیادہ کا امتیاز ضرور ہے۔ شاید عاقل اور سمجھ دار اس کا اعتبار کرنے میں تامل کریں لیکن دوسری صورت سے ان کا اطمینان کرنا میرے امکان میں بھی نہیں۔ بجز یہ عرض کرنے کے کہ ع

ذوق ایں می نہ شناسی بخدا تانہ چشی

(خدا کی قسم، محبوب کے ساتھ محبت کرنے کا جو مزا ہے وہ تو نہیں چکھے گا جب تک تو خود عاشق نہیں بنے گا۔)

جو ہمیشہ عیش سے مسرور اور آرام سے ہم بغل رہا وہ اسیران محبت کی صعوبت کو کیا جانے، بقول

کجادانند حال ماسبک ساران ساحلہا

(ہمارے حال کو وہ کیسے واقف ہو سکتے ہیں جو کنارے پر آسانی سے پہنچ گئے۔)

مگر میں بہزار افتخار یہی کہوں گا کہ غلامان وارثی بقدر حیثیت دردمحبت سے

ضرور مضطر ورنجور رہتے ہیں۔ اوراس دائمی مجاہدہ کا اندازہ وہی کر سکتا ہے۔ جس کے پہلو میں محبت کا مارا ہوا دل ہے۔

غرض یہ کیفیت تو عام مریدین کی ہے لیکن اکثر حلقہ بگوش وارثی ایسے بھی ہیں کہ جو ہمہ تن دام الفت کے اسیر اور تیر محبت کے شکار ہیں، وہ زندگی سے بیزار رہتے ہیں۔ شب تنہائی میں جب زیادہ دل گھبراتا ہے تو اپنی قسمت کی شکایت یوں کرتے ہیں۔ ے

کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے　　کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے
ہماری یہ شب کیسی شب ہے الٰہی　　نہ روتے کٹے ہے نہ سوتے کٹے ہے

جن کو پہلے خوش پوشاک دیکھا تھا، انہوں نے فقیرانہ لباس میں، اور بشریت کے خلاف درندوں کی طرح ویران جنگلوں میں زندگی بس کی۔ اکثر اہل علم تھے جن کو اس غیر معمولی مصیبت سے سروکار ہوا، تو پڑھنا ایک طرف ایسے بے کار ہوئے کہ حرف شناس بھی نہ رہے۔ چنانچہ مولانا عبدالکریم صاحب متوطن شیخ پورہ ضلع مونگیر جو علامۂ وقت تھے لیکن فیضان وارثی نے جب محبت کا سبق ان کو پڑھایا تو درس وتدریس یک قلم موقوف ہوا۔ عالم سہو میں ایسا مستغرق ہوئے کہ طفل مکتب سے زیادہ بے خبر ہوگئے۔ بقول ے

جبھی جاکے مکتب عشق میں سبق مقام فنا لیا
جو پڑھا لکھا تھا نیاؔز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

علیٰ ہذا ملا رضی الدین بغدادی نے جو مستند اور متبحر عالم تھے، ہندوستان میں آکر جب سرکار عالم پناہ کا نام نامی سنا، تو پہلے معترض ہوئے۔ عرصہ کے بعد خوبی

قسمت سے حضوری نصیب ہوئی، تو ایک نظر عنایت نے ایسا محواورر بےخود کر دیا کہ عالمانہ لباس بار ہوا۔ کپڑے پھاڑے، تہبند پوش ہوئے۔ بغدادی شاہ خطاب ملا عرصہ تک حسب الحکم پرانا جوتا ٹانکا۔ چار پیسے سے زیادہ مزدوری نہیں کرتے تھے۔ اس میں بھی یہ انتظام تھا کہ دو پیسے خیرات اور دو پیسے میں بسر اوقات۔ یادِ مطلوب میں اپنا قدیم علم ایسے بھولے کہ تا زندگی پڑھنے لکھنے کا ذکر بھی نہ کیا۔

علاوہ اس مجاہدہ کے بعض غلام عرصۂ دراز تک صائم رہے۔ مثلاً فیضو شاہ خادم خاص نے چھبیس ۲۶ برس، اور مکہ شاہ نے چودہ برس، اور ابوالحسن شاہ نے بارہ سال تک مسلسل روزہ رکھا۔ مزید براں اکثر حلقہ بگوش حکم حضرت سے دائم الصوم ہیں۔ جیسے بابو کنہیالال وکیل عرف غلام وارث متوطن علی گڑھ کہ بجز عذر علالت روزہ قضا نہیں کرتے۔ معہذا احمد شاہ نے قبل تہبند پوشی بارہ سال تک ہر شب نماز معکوس پڑھی۔ بعض کو صلوٰت العشق کی مدائمت کا فرمان ہے۔ بعض سے متواتر حج کرائے جیسے مکی شاہ متوطن بارہ بنکی نے علاوہ سفر عراق وغیرہ کے سات مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ بعض حلقہ بگوش اپنا وطن مالوف چھوڑ کر زمین حجاز میں پناہ گزیں ہوئے۔ اور وہیں کی خاک پاک میں مل کر آخر خاک ہو گئے۔ اور ایک یا دو حج تو عموماً غلامان وارثی نے ضرور کئے بلکہ یہ خصوصیت ہے کہ جماعت غلامان وارثی میں اگر دیکھا جائے تو ہر مقام میں بہ لحاظ اپنی تعداد کے حاجی زیادہ ہیں جس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ خصوصیت اس نسبت سے ہے کہ حضور کے حج ایسے جوش اور خلوص سے آراستہ اور مملو اور من وجہہ اللہ ہوئے کہ جن کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ کیونکہ عام حجاج کا دستور ہے کہ حج بیت اللہ سے فائز ہونے کے بعد اپنے نام

کے ساتھ حاجی بھی لکھتے ہیں، اور اکثر اپنے حج کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ مگر نہ ان کے حج کی شہرت ہوتی ہے اور نہ سوائے اہل خوشامد کے عام طور پر لوگ ان کو حاجی کہتے ہیں۔ البتہ بزرگان دین کے واسطے یہ ہوتا ہے کہ ان کے نام نامی کے ساتھ لفظ حاجی بھی ضم ہو جاتا ہے اور ان کے معتقد یا ان کے شہر کے باشندے بغیر حاجی کہے ان کا نام نہیں لیتے۔ اور یہ بھی بڑا خدائی انعام ہے۔ اور مقبولیت حج کی خاص دلیل ہے کہ خلق اللہ بغیر کسی غرض کے حاجی کے خطاب کے ساتھ ان کا نام لیتی ہے۔

لیکن حضور کے حج بھی غیر معمولی خصوصیت سے خالی نہیں۔ حالانکہ آپ نے سفر حج نہایت سادگی سے کئے۔ نہ مریدوں کا قافلہ ساتھ تھا، نہ کوئی ظاہری سبب ذریعۂ شہرت ہوا۔ اور اس کا تو کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ آپ نے کبھی اپنے نام کے ساتھ حاجی کا لفظ لکھا ہو۔ کیونکہ خصوصیاتِ عادات میں ہے کہ آپ نے کتابت نہیں فرمائی بلکہ برخلاف اس کے اس قدر گمنامی پسند تھی اور مزاج ہمایوں میں اس کی کامل احتیاط تھی کہ برسبیل تذکرہ اپنا نام بھی زبان سے کبھی نہیں لیا۔ لیکن خدا کی جانب سے یہ شہرت ہوئی اور منادیٔ غیب نے ڈنکا بجایا کہ تمام ہندوستان میں آپ کے حج کا شہرہ ہو گیا۔ اور خلق اللہ نے بغیر کسی تحریک کے آپ کو حاجی کہا۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے باہر بھی آپ کے نام نامی کے ساتھ حاجی کا خطاب ایسا مشہور ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ جو خاص مقبولیت حج کی نشانی ہے۔

علاوہ اس بے نظیر شہرت کے ایک لطیف اور بین خصوصیت اس میں یہ بھی ہے کہ صرف لفظ حاجی ہی آپ کے نام نامی کے ساتھ ضم نہیں ہوا۔ جس سے آپ کے نام کی عظمت اور منزلت کا اظہار ہوتا۔ بلکہ آپ مجسم حاجی ہو گئے۔ یعنی اس کی

ضرورت ہی نہ رہی کہ آپ کا نام بھی لیں تب آپ مقصود متکلم سمجھے جائیں۔ چنانچہ دیکھتے یہ ہیں کہ دنیا میں جب کوئی یہ کہتا ہے کہ حاجی صاحب بہت بڑے بزرگ تھے۔ یا فلاں شخص حاجی صاحب کا مرید ہے۔ تو مخاطب کو اس کی ضرورت نہیں باقی رہتی کہ وہ دریافت کرے کہ کون حاجی صاحب؟ بلکہ مجرد اسی قدر کہنے سے وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ دیوہ شریف کے حاجی صاحب کی جانب اشارہ ہے۔ اور یہ آپ کے مقبول حج کی خاص خصوصیت ہے۔ اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کعبۃ اللہ کے ساتھ آپ کو ایسا گہرا تعلق تھا۔ اور حقیقت کعبہ کا ایسا ظہور کامل ہوا کہ دیگر صفات پر یہ صفت غالب ہوگئی۔ اور عین ذات سے تعلق ہوگیا۔ جو حصول مقصود اصلی کی خاص دلیل اور فنا تام کا نتیجہ ہے کہ جس کے شوق دیدار میں گئے تھے، اس کو دیکھا۔ اور جوش اشتیاق میں جس کی جستجو تھی اس کو پایا۔ اور بصورت عوام اینٹ اور چونے کا طواف منظور نہ تھا۔ بلکہ اس پردے میں صاحب خانہ کی تلاش تھی وہ ملا۔ اور مطلوب حقیقی کا وصال مقصود تھا وہ ہوا۔ چنانچہ جناب حضور مولانا علیہ الرحمۃ کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے:۔

حج زیارت کردن خانہ بود

حج رب البیت مردانہ بود

(حج کیا ہے؟ اللہ کے گھر کی زیارت کرنا۔ یہی حج ہے۔ اور اللہ کے گھر کی زیارت کرنا، مردانہ کام ہے۔)

الغرض حضور کے حج چونکہ حقیقی حج ہوئے لہٰذا اسی نسبت کی یہ کشش ہے کہ جناب والا کے زیادہ حلقہ بگوش حج بیت اللہ سے فائز ہوتے ہیں۔ اور اس سفر کی اہمیت اور راستہ کی صعوبت کو بکمال رغبت گوارہ کرتے ہیں جس کو ہم خصوصیت کے ساتھ یہ

کہہ سکتے ہیں کہ غلامان وارثی بہ لحاظ اپنی تعداد کے حاجی زیادہ ہیں۔

علیٰ ہذا بعض مریدین کو گوشہ نشینی کا حکم ہوا۔ اورانہوں نے حسب فرمان گوشہ تنہائی میں زندگی بسر کی۔ اورتا حیات اس مقام سے باہر قدم نہیں نکالا جوان کے واسطے تجویز ہوا تھا۔ اور بعض کے لئے اسی مجاہدہ کو اور بھی زیادہ سخت اور دشوار کر دیا۔ جو بہ ظاہر نا قابل برداشت معلوم ہوتا ہے۔ مگر حضور کی توجہ نے ایسا تحمل اور استقلال مرحمت فرمایا کہ آپ کے غلاموں نے اس کی بھی تعمیل کی۔ مثلاً بدنام شاہ متوطن کھیولی ضلع بارہ بنکی جو ابتدا میں خادم خاص کے عہدے پر ممتاز تھے مگر بعد میں ان کو گوشہ نشینی کا حکم اس قید کے ساتھ ہوا کہ ان سے یہ وعدہ فرمایا کہ جب ہم دیوے آئیں گے تو تم سے ضرور ملاقات کریں گے۔ لیکن کوئی احتیاج کیوں نہ ہو، دروازہ اپنا ہمیشہ بند رکھنا۔ جب ہم آئیں تب کھولنا چنانچہ سولہ سال تک وہ قناعت گزیں اسی حالت میں رہ کر جاں بحق تسلیم ہوا۔ کہ جب حضور تشریف لے جاتے تھے تو دروازہ کھلتا تھا۔ اور اس روز جو سامان بہم پہنچتا تھا وہ آپ کی دعوت میں صرف ہوتا تھا۔ اور جو باقی بچتا تھا اسی میں وہ اپنی بسر اوقات اس وقت تک کرتے تھے جب حضور دوبارہ تشریف لے جاتے تھے۔ اور اکثر جناب والا چار یا چھ ماہ کے بعد بھی دیوے شریف میں آئے اور بدنام شاہ سے ملاقات کی۔ مگر اس متوکل نے مٹی کھا کر بسر کی اور درمیان میں دروازہ نہ کھولا۔

کسی غلام کو حضور نے خاموشی کا حکم دیا۔ اور اس کے ساتھ یہ توفیق بھی عنایت ہوئی کہ وہ حلقہ بگوش تاحیات خاموش رہا۔ بلکہ بعض کے واسطے اسی خاموشی کا حکم ایسے راز و نیاز کے ساتھ صادر ہوا کہ جس کی حقیقت سمجھنے میں ہمارا ادراک قاصر ہے۔ جیسے عبدالرزاق شاہ جن کا زیادہ قیام باڑہ ضلع پٹنہ میں رہتا تھا۔ ان کو حضور نے

خاموشی کا حکم قطعی دیا۔ وہ ضرورت کے وقت لکھتے یا اشارہ سے کام لیتے تھے۔ اور ان کی یہ تکلیف دیکھ کر ان کے احباب کو افسوس ہوتا تھا۔ عرصہ کے بعد جب حضور دوبارہ بانکی پور تشریف لے گئے۔ تو وہاں کے مخصوص عمائدین نے بالاتفاق عبدالرزاق شاہ کی تکلیف کا اظہار کیا۔ اور ملتجی ہوئے کہ ضرورت کے وقت بات کرنے کی اجازت ہو جائے آپ نے عبدالرزاق شاہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ۔ کیا تم کو تکلیف ہوتی ہے؟'' عبدالرزاق شاہ نے شرم سے سر نیچا کر لیا۔ تب حضور نے فرمایا کہ'' عبدالرزاق اب تمہارا بولنا وضعداری کے خلاف ہے۔ بلکہ اشارہ بھی نہ کیا کرو۔ اور لکھنا بھی چھوڑ دو'' ادھر تو اس حکم سے عبدالرزاق شاہ ساکت و آبدیدہ ہوئے۔ اور ادھر شان محبوبیت کے جوش میں حضور نے یہ فرمایا کہ عبدالرزاق اس تھوڑی زندگی کو یوں ہی کاٹ دو۔ وضعداری اسی میں ہے کہ اب مرتے وقت بھی کوئی کلمہ زبان سے نہ نکلے۔ اور قبر میں نکیرین سوال کریں، تو اس کا بھی جواب نہ دینا۔ بلکہ حشر میں خدا کے سامنے بھی خاموش رہنا''۔ حضور کا یہ ارشاد گو معمولی الفاظ کے پردے میں تھا، مگر حاضرین پر ایسا رعب حق طاری ہوا کہ سب نے سر جھکا لیا۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد سب کو رخصت کر دیا۔ اور جناب والا کا یہ ارشاد کہ'' اس تھوڑی سی زندگی کو یوں ہی کاٹ دو۔'' ظاہر ہو گیا کہ چھ مہینے نہیں گزرے تھے کہ عبدالرزاق شاہ نے بہادر علی خاں صاحب خان بہادر رئیس باڑہ کے مکان میں انتقال کیا۔

علیٰ ہذا مستقیم شاہ کو یہ حکم ہوا کہ موجودات عالم میں کسی چیز کو نہ دیکھو۔ چنانچہ اس صاحب بصیرت نے تمام عالم سے بے تعلق ہو کر تہتر سال تک اس فرمان وارثی کی تعمیل میں آنکھیں بند رکھیں۔ پہلے اجمیر شریف کے پہاڑ موسومہ مدار ٹیکری پر چالیس

برس قیام کیا۔ بعدہ تینتیس سال مدار دروازے کے قریب زندگی بسر کی اور ایک سو دس برس کی عمر ختم کر کے ۱۳۳۵ ہجری میں راہیٔ ملک بقا ہوئے۔ اجمیر شریف میں ان کی غیر معمولی شہرت تھی۔ میں نے معتبر ذرائع سے سنا ہے کہ جناب حضرت نے جب حجاز کا دوسرا سفر کیا ہے تو یہ ہمراہ رکاب تھے۔ اور اس قدر تو خود حضور نے مجھ سے فرمایا کہ ''مستقیم شاہ قدیم تہبند پوش ہیں۔ ساٹھ برس ہوئے جب مدار ٹیکری پر ان کو بٹھایا، تو ہم سے یہ خواہش کی کہ ایک مرتبہ اپنی صورت دکھادو۔ ہم نے صورت تو دکھادی۔ مگر یہ کہہ دیا کہ اب دنیا کی کسی چیز کو نہ دیکھنا۔ جب سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور وضع کے پابند ہیں۔ انہوں نے اکسیر کھالی ہے اور اکسیر بنانا بھی جانتے ہیں''۔

یہ غیر معمولی مجاہدہ جس کی تعمیل بمقتضائے قوت بشری محالات سے معلوم ہوتی ہے۔ مگر حضور کی توجہ اور فیضان باطنی کی یہ شان تھی کہ آپ کے ادنیٰ غلام نے بکمال صبر و استقلال حسب ارشاد تہتر سال تک (خلاف) فطرت انسانی آنکھ نہیں کھولی اور دنیا کی کسی چیز کو نہیں دیکھا۔ اور غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جب کہ حضور نے یہ عام ہدایت فرمائی کہ ''محبت کرو'' اور اپنے غلاموں کا مشرب عین محبت تجویز فرمایا ہے، تو اسی مناسبت سے ہماری تعلیم بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ مستقیم شاہ صاحب کے اس مجاہدہ کو بھی محبت سے کامل مناسبت اس لئے ہے کہ تقاضائے محبت صادق یہی ہے کہ موجودات عالم میں سواء محبوب کچھ نہ دکھائی دے۔ بلکہ حضور نے اکثر فرمایا ہے کہ ''محبت میں انسان اندھا ہوتا ہے۔'' اور شیخ اکبر حضرت محی الدین عربی نے فتوحات میں محبت کی یہی تعریف لکھی ہے کہ انسان اندھا اور گونگا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جناب والا نے مستقیم شاہ سے مجاہدہ بھی وہ کرایا جس کو محبت سے خاص سروکار ہے۔

دوسرے غلام کے واسطے بالکل اس کے برعکس اور ایسا ناقابل برداشت مجاہدہ تجویز ہوا۔ جو صریح فطرت بشری کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہ گلاب شاہ ساکن آگرہ، کڑہ مداری خاں کو یہ حکم ہوا کہ کسی وقت آنکھ نہ بند کرو۔ شب و روز ایک نشست سے بیٹھو، اور بیدار رہو۔ اور ہمہ دم کی مصروفیت کے واسطے ان کو شغل سلطان الاذکار تعلیم فرمایا چنانچہ چوالیس سال تک سچا فرماں بردار ایک پتھر کا تکیہ لگائے بیٹھا رہا۔ اور اسی حالت میں جاں بحق تسلیم ہوا۔

یہ مجاہدہ بھی اپنی نوعیت میں ایسا فرد ہے کہ شاید دو چار صدی میں اس کی مثال نہ ملے گی۔ جس کی تعمیل عقل سے بعید اور خیال کرنے سے ناممکن اور محال معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ چوالیس سال تک جس خیال نے آنکھ نہ بند کرنے دی۔ اور شب و روز بے خواب و بیدار رکھا وہ اسی محبت کا جوش تھا جس کی حضور نے عام ہدایت فرمائی ہے۔ کیونکہ محبت کا ایک مشہور خاصہ خفقن حرام بھی ہے۔ ورنہ سوائے درد محبت کے کسی دوسری قوت سے ممکن نہ تھا کہ خلاف فطرت انسانی چوالیس سال تک اس اہم اور دشوار مجاہدہ کی تعمیل گلاب شاہ سے ہوتی۔

اور خدا بخش صاحب کا مجاہدہ اور بھی عجیب ہے جس کو مفصل نگارش کروں تو طوالت ہوگی۔ گو تذکرہ ان کا عبرت انگیز اور استقامت کا پورا سبق ہے۔ لیکن خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضور نے ان کو موضع پینڈ ضلع بارہ بنکی میں چند شرائط کے ساتھ گوشہ نشیں کیا۔ جن میں سے بعض احکام یہ تھے۔ اول بہت مختصر مقام محدود فرما کر ارشاد ہوا کہ اس کے باہر نہ قدم رکھنا۔ دویم یہ کہ مکان میں نہ رہنا۔ بلکہ درخت کے سایہ میں زندگی بسر کرنا۔ سویم، یہ شرط بہت سخت ہے کہ حیوانات اور نباتات کا ترک قطعی لازم

گردانا، خدا کی شان ہے کہ وہ جانباز متوکل سات برس تک تو اس حکم کی تعمیل یوں کرتا رہا کہ جب زیادہ اشتہا معلوم ہوتی تو پانی میں راکھ گھول کر پی لیتا تھا۔ مگر اس کے بعد حضور نے اس قدر آسانی فرمائی کہ اس محدود مقام میں جو نباتات خودرو ہوں یا لال دانہ بغیر شرکت نمک کھالیا کرو۔ چنانچہ چھتیس سال ان کی خوراک اسی محدود مقام کی گھانس رہی جس کو جوش کرکے پی لیتے تھے۔ یا کبھی کبھی لال دانہ اس جنگل میں اگر کوئی شخص دے گیا تو کھالیا کرتے تھے۔

خدا بخش شاہ معمولی طبقہ کے بے پڑھے آدمی تھے۔ مگر علاوہ اور اور صفات کے جن کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا۔ ان کا یہی ثبات واستقلال ان کی منزلت کے لئے کافی دلیل ہے کہ اس غیر معمولی مجاہدہ کی تعمیل کس دلیری اور مردانگی سے کی کہ جس خیال سے دل لرزتا ہے۔ مگر میں پھر وہی عرض کروں گا کہ خدا بخش شاہ کی یہ قوت نہ تھی کہ خلاف فطرت انسانی اس ناقابل برداشت مجاہدہ کی تعمیل کرتے۔ بلکہ اسی محبت کا یہ کرشمہ ہے جو فیضان وارثی نے اپنے غلاموں کو تفویض فرمائی ہے جس نے خدا بخش شاہ کی طلب کو طلب صادق بنایا کہ خودی سے بے خود ہوکر ضروری خواہشات انسانیہ سے قطعی فارغ ہوئے۔ اور مطلوب حقیقی کی ہستی کے سامنے اپنی ہستی کو نیست و نابود کیا۔

الغرض تمثیلاً چند مجاہدات کا یہاں ذکر کیا گیا ورنہ آپ کے معتدد مسترشدین نے ایسے ناقابل برداشت مجاہدے کئے ہیں جو یقینی قوت بشری سے باہر اور صریح فطرت انسانی کے خلاف تھے۔ لیکن یہ حضور کے فیضان باطنی کا کرشمہ ہے کہ ان غلاموں نے بکمال صبر واستقلال تعمیل کی۔

علیٰ ہذا بہ لحاظ مشرب ہمارے عقائد اور عادات و خیالات کی درستگی کے لئے بھی حضور نے ہم کو ہدایتیں فرمائی ہیں۔ حالانکہ اس باب میں زیادہ ہدایتیں وہ ہیں جن کو مسترشدین کے ساتھ شخصی خصوصیت ہے۔ لیکن میں انہیں احکام کا ذکر کروں گا جن میں تعمیم ہے۔ چنانچہ اکثر حضور نے یہ فرمایا ہے کہ ''جو تم سے محبت کرے اس سے محبت کرو۔ اور کسی کے حق میں دعا یا بددعا نہ کرو۔ کیونکہ مشرب تسلیم و رضا کے خلاف ہے''۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''دشمن کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ یہ حضرت شیر خدا کی سنت ہے''۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''دشمن سے بدلہ نہ لو۔ کیونکہ فاعل حقیقی تو وہی حضرت ہیں، جن کا سب جلوہ ہے۔'' اور متواتر فرمایا ہے کہ ''تصدیق ہی ایمان ہے جس کو تصدیق نہیں، اس کا ایمان نہیں۔'' یہ بھی حضور نے اکثر فرمایا ہے کہ ''عاشق وہ ہے جو ہر وقت معشوق کے خیال میں رہے۔ اور کوئی سانس اس کی خالی نہ جائے''۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''خیال میں صورت معشوق کو نقش کرنا چاہئے''۔ اور یہ بھی عام طور سے فرمایا ہے کہ ''جس صورت کا خیال پختہ ہو جائے گا وہی صورت بعد مرگ بھی قایم رہے گی''۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ''جو وعدہ کرو اس کو پورا کرو''۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''کسی کو برا کہو نہ برا سمجھو''۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ ''کسی کی عداوت کو دل میں جگہ نہ دو۔ جس دل کو محبت سے سروکار ہوتا ہے، اس میں عداوت کی گنجائش نہیں''۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ ''رنج پہنچے تو صبر، راحت پہنچے تو شکر کرو۔ کیونکہ سب خدا کی جانب سے ہے۔ اسباب دنیا کا بہانہ ہے''۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ ''جو ہم سے محبت کرے وہ ہمارا ہے۔ منزل عشق میں خلافت اور جانشینی نہیں ہوتی۔''

ارشاد آخر الذکر میں خاص اہمیت ہے۔ بلکہ خود حضور نے اس کے اعلان

کے لئے یہ اہتمام فرمایا کہ ۷ نومبر ۱۸۸۹ء کو آپ کے حکم سے یہ فرمان بایں صراحت ضبط تحریر میں آیا کہ ''ہمارے یہاں منزل عشق ہے۔ جو کوئی دعوے جانشینی کا کرے، وہ باطل ہے۔ ہمارے یہاں جو کوئی ہو۔ چمار ہو یا خاکروب، جو ہم سے محبت کرے ہو ہمارا ہے''۔

اس تحریر کی نقل بعض دیگر مریدین کو بھی حاصل ہوئی۔ مگر قصبۂ مسولی ضلع بارہ بنکی میں جب آنریبل مولوی سید شرف الدین قدم بوسی کو حاضر ہو گئے۔ تو حضور نے خاص طور پر یہ تحریر ان کو دی۔ اور ایک مثنیٰ اس کا اپنے قدیم حلقہ بگوش منشی نادر حسین رئیس نگرام کو اس مخصوص ارشاد کے ساتھ مرحمت فرمایا کہ ''نادر حسین اگر کوئی انگریز بھی مانگے تو دکھا دینا''۔ آنریبل موصوف نے تو ۱۳۱۲ ہجری میں حکیم عبدالاحد شاہ کی کتاب موسومہ عین الیقین میں اس تحریر کو شائع کرا دیا۔ اور جب ۱۹۱۵ء میں انجمن درگاہ وارثی کی جانب سے عدالت ڈسٹرکٹ جج لکھنؤ میں تنسیخ جانشینی کا دعوے ہوا، تو ممدوح الصدر نے اپنے اظہار میں اس تحریر کا ذکر کیا۔ اور منشی نادر حسین صاحب نے وہ تحریر عدالت میں داخل کی جس کی بنا پر آستانۂ اقدس قانوناً بھی لوث سجادگی سے مبرا ہو گیا۔

لیکن سرسری طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امتناع جانشینی کا فرمان بھی شاید حضور کا اجتہاد ہوگا۔ کیونکہ سلاسل مشائخین عظام میں خلافت و سجادگی کا دستور مروج ہے۔ مگر نہیں، یہ ہماری عدم واقفیت کا باعث ہے۔ تھوڑا غور کرنے سے ظاہر ہو جائے گا کہ درحقیقت یہ حکم اصول طریقت کے مطابق ہے کیونکہ حضرات صوفیہ نے اپنے مابعد کے لئے یہ دستور اس ضرورت سے مقرر فرمایا ہے۔ اور منصب خلافت و سجادگی اس مرید کو مرحمت ہوا کرتا ہے جو اس کا اہل ہو کہ اس سلسلہ کی تعلیم دوسروں کو

دے۔اور یہ مسلمہ ہے کہ جناب والا کا طریق عشق ہے جس کو متواتر حضور نے فرمایا۔ اور فرمان مذکور کی ابتدا میں بھی صریح الفاظ میں اس کا اظہار کر دیا کہ ''ہماری منزل عشق ہے۔'' اور عشق اسرار الٰہی ہے جس کی حقیقت دریافت کرنے میں ہمارا فہم و ادراک قاصر ہے۔ بلکہ عشق کی تعریف بھی کماحقہٗ ہم نہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ عشق کی تعلیم دینا۔ جو یقینی ناممکن اور محالات سے ہے۔ لہٰذا جب مشرب عشق کی تعلیم امکان میں نہیں تو طریق عشق میں سجادگی بےضرورت ہے۔

علاوہ اس کے عشق درس و تدریس، تعلیم و تربیت پر منحصر نہیں۔ یہ باطنی کیفیت اور قلبی واردات ہے جو منجانب اللہ نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ متواتر حضور نے فرمایا کہ ''عشق وہبی ہے جو کسب سے نہیں حاصل ہوتا۔'' اور جملہ حضرات صوفیہ نے بھی یہی تسلیم کر لیا ہے کہ عشق موہبت محض ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا دفتر سویم میں فرماتے ہیں۔

گرچہ آں عاشق بخارا می رود
نہ بدرس و نے بہ استامی رود
عاشقاں راشد مدرس حسن دوست
دفتر و درس سبق شان روئے اوست
آں طرف کہ عشق می افزود درد
بوحنیفہؒ شافعیؒ درسے نکرد

(اگرچہ وہ عاشق بخارا سے چلتا ہے۔ لیکن نہ وہ سبق پڑھتا ہے اور نہ استاد کو ملنے جاتا ہے۔ عاشقوں کیلئے سبق دینے والا دوست کا حسن ہوتا ہے۔ محبّ کیلئے سبق کا پڑھنا

اور دفتر محبوب کا رُخِ انور ہے۔ عشق اس لحاظ سے درد کو زیادہ بڑھاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے اس کے متعلق کوئی درس نہیں دیا۔)

پس جب کہ عشق خاص عنایت وہبی ہے۔ اور کوشش وکسب سے حاصل نہیں ہوتا۔ اور اسی وجہ سے مشربِ عشق میں تعلیم نہیں۔ اور جب تعلیم ظاہری نہیں ہے تو پھر نہ خلافت کی ضرورت ہے نہ سجادگی کی۔ اس لئے حضور نے فرمایا کہ ''ہماری منزل عشق ہے جو کوئی دعوے جانشینی کا کرے وہ باطل ہے۔''

قطع نظر اس کے صحیح معنی میں سجادگی یا جانشینی تعلیم وتربیت کے انتظام کا نام ہے کہ حضرات صوفیہ آیندہ نسلوں کو افاضہ پہنچانے کی غرض سے یہ انصرام فرماتے ہیں کہ اپنا جانشین یعنی منتظم تعلیم اس کو کرتے ہیں جو ان کے مسلک کا عالم، اور فارغ التحصیل ہوتا ہے۔ لیکن ''مشربِ عشق از ہمہ دینہا جداست'' (عشق کا مشرب تمام ادیان سے جدا ہے۔) عشق میں انتظام ہی نہیں۔ اور نہ کوئی علم وصولِ عشق میں معین ہوتا ہے کیونکہ علم اور انتظام کو عقل سے سروکار ہے۔ اور حضرت عشق کی تشریف آوری سے پہلے عقل انسان مفرور ہوجاتی ہے۔ جیسا منقولات قدیمہ سے ثابت ہے اور خود حضور نے بھی فرمایا ہے کہ ''جہاں حضرت عشق آئے، پھر وہاں علم وعقل کا دخل نہیں۔'' اور مولانا علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔

عشق آمد عقل او آوارہ شد　　　صبح آمد شمع او بے چارہ شد
عشق سایہ حق بود حق آفتاب　　　سایہ رابا آفتاب اوچہ تاب

(جب عشق آتا ہے تو عقل آوارہ ہوجاتی ہے۔ جب صبح ہوتی ہے تو شمع بے بس ہوجاتی ہے۔ عشق حق کا سایہ ہوتا ہے اور حق سورج ہے۔ سایہ کو سورج کی تاب کے ساتھ کیا

نسبت ہوسکتی ہے۔)

جب ثابت ہوگیا کہ عشق کی عملداری میں علم وعقل کا دخل نہیں۔اور انتظام عقل کا فعل ہے جس سے عاشق کو سروکار نہیں،تو پھر عاشق صادق اس کا نظم کیونکر کرسکتا ہے کہ آئندہ کے لئے اپنا جانشین بنائے جواقتضائے عشق کے صریح خلاف ہے۔اس وجہ سے وہ عاشقان جانباز جن کا سرمایۂ فخر وناز محض عشق تھا۔اور بجز نظارہ جمال شاہد حقیقی جمیع مرادات سے دست بردار تھے۔ان کا اس مشرب خاص میں کوئی جانشین نہیں ہوا۔

مثلاً صاحب تصدیق ویقین حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندر تارک کامل قدس اللہ سرہ العزیز جو پروانہ وار شمع جمال ایزدی پر شیفتہ،اور سطوت جلال فردانیت خداوندی پر فریفتہ محوتجلیات انوار، ماسوائے یار تمام عالم سے بے سروکار تھے۔ان کا مشرب قلندری میں یعنی تعلیم عشق حقیقی کے لئے کوئی جانشین نہیں ہوا جس کا سبب یہی ہے کہ طریق عشق میں نہ تعلیم وتربیت کی حاجت، نہ انتظام وانصرام کی گنجائش۔نہ عبارت واشارت سے حقیقت عشق کا اظہار ہوسکتا ہے، اور نہ حصول عشق کے لئے جدوجہد درکار ہے، بقول حافظ شیراز علیہ الرحمتہ ؎

قلم را آں زباں نبود کہ سر عشق گوید باز
ورائے حد تقریر ست شرح آرزو مندی
دل اندر زلف لیلیٰ بندو کار عشق مجنون کش
کہ عاشق رازیاں دارد مقالات خرد مندی

(قلم کے پاس وہ زبان وہ طاقت نہیں ہے کہ وہ عشق کا راز سر عام بیان

کر سکے۔آرزومندی کی شرح بیان کی حد سے باہر ہے۔ دل کو لیلیٰ کی زلف سے باندھ دے یعنی اپنے آپ کو محبوب کی فکر اور کاموں میں مصروف رکھ۔ اور مجنون کے عشق کا کام کر۔ کیوں کہ عاشق کیلئے عقلمندی کی باتیں کرنے میں نقصان ہوتا ہے۔)

بلکہ یہ واردات قلبی خاص ودیعت الٰہی اور عین عنایت وہبی ہے جو نہ تعلیم و تربیت پر موقوف، نہ واسطہ اور وسیلہ کی محتاج ہے۔ فیضان عشق ومحبت عاشقان کامل کی توجہ باطنی پر منحصر ہے۔ اور ان کے جوش قلبی کی نسبت طالبین کے دلوں کو گداز اور مائل محبت کرتا، اور ان کا فیض وتصرف اپنے وابستہ کو اس کی حیثیت واستعداد کے لحاظ سے بغیر کسی ظاہری تعلیم کے مستفیض کرتا ہے۔ اور اس کو اصطلاح صوفیہ میں نفحۂ روحی بھی کہتے ہیں۔ اور یہ تصرف ان کے وصال کے بعد بھی قائم رہتا ہے جس کی دوسری تمثیل یہ ہے کہ سلطان العاشقین حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ جن کا نام نامی طبقۂ عشاق میں خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے۔ آپ نے بھی طریق عشق میں تعلیم ظاہری کے لئے کسی کو اپنا جانشین نہیں تجویز فرمایا۔ بلکہ جس طرح آپ کے زمانے میں آپ کے فیضان باطنی سے مسترشدین کو افاضہ حاصل ہوا، اسی طرح آپ کے مزار پرانوار سے طالبان صادق مستفیض اور فائز المرام ہوئے۔ چنانچہ صاحب تذکرۃ الاولیا نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی آپ کے وصال کے ایک صدی بعد پیدا ہوئے، اور آپ کے فیض باطنی سے مستفیض ہوئے۔ بلکہ مولانا قدس سرہ نے اس واقعہ کو دفتر چہارم میں ارقام فرمایا ہے۔ وھوھذا

بو الحسن بعد از وفات بایزید از پس آں سالہا پدید
بو الحسن از مرداں آنرا شنود ہم چناں آمد کہ او فرمود بود

کہ حسن باشد مرید و امتم — درس گیرد ہر صباح از تر بتم
ہر صباحی آید و خواند سبق — بر سر خاک وشود پیر بحق
ہر صباحے تیز رفتے بے فتور — برسر گورش نشستی با حضور
ہر صباحے رو نہادی سوئے گور — ایستادہ تا ضحٰے اندر حضور
تا مثال شیخ پیشش آمدے — تا کہ بے گفتن شکالش حل شدی

(حضرت ابوالحسن خرقانیؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ کی وفات کے کئی سال بعد پیدا ہوئے۔ حضرت ابوالحسنؒ نے یہ بات لوگوں سے سن رکھی تھی تو جیسے حضرت بایزیدؒ نے فرمایا تھا ویسے ہی آپ کی پیدائش ہوئی۔ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا تھا کہ ابوالحسن خرقانیؒ میرا مرید ہوگا اور میرے گروہ میں سے ہوگا۔ اور میری قبر سے وہ ہر صبح سبق حاصل کرے گا۔ ہر روز صبح ہی صبح میری قبر پہ حاضری دے گا اور سبق پڑھے گا۔ اور واصل بحق پیر ہوگا۔ وہ ہر صبح بڑی تیزی کے ساتھ بغیر کسی کمی بیشی کے آئے گا اور میری قبر پر با حضور بیٹھے گا۔ ہر صبح کو قبر کی طرف متوجہ ہوگا اور وہ چاشت کے وقت تک وہاں حضوری کے عالم میں بیٹھے گا۔ وہ شیخ کی طرح لوگوں کے سامنے آئے گا یہاں تک کہ بغیر کہے ان کے سوالات حل ہوجایا کریں گے۔)

علیٰ ہذا حسین ابن منصور حلاج علیہ الرحمۃ جن کے کلام ابوالقاسم نصرآبادی نے نقل کئے ہیں، اور محقق اور صاحب حال کہا ہے۔ اور ابوالعباس بن عطاء محمد بن حنیف کا قول ہے کہ حسین بن منصور ربانی عالم تھے۔ اور یہ تو مسلمہ ہے کہ اس برگزیدۂ خدا نے پروانہ وار شمع جلال حضرت احدیت پر جان دے کر عشق کی آخری منزل طے فرمائی مگر ان کے طریق خاص کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی ان کا جانشین نہیں ہوا۔ اور

ان کے تصرف نے بھی زمانہ حیات ظاہری میں جس طرح طالبین کو مستفیض کیا، اسی طرح بعد وصال شاہد حقیقی بھی فیضان باطنی کا چشمہ جاری رہا۔ چنانچہ حضرت فریدالدین عطار علیہ الرحمتہ عہد ابن منصور کے ایک سو پچاس سال بعد پیدا ہوئے اور آپ کے فیضان روحی سے انہیں افاضیہ نصیب ہوا۔

علیٰ ہذا دور رسالتؐ کے عاشق صادق حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ جن کے عشق کامل کے لئے کسی تصریح کی ضرورت نہیں۔ جو ہمیشہ یاد مطلوب میں مدہوش رہے، اور خیال محبوب میں اپنی ہستی فراموش کی۔ مگر طریق عشق کی تعلیم ظاہری کے لئے ان کا بھی کوئی جانشین نہیں ہوا۔ حتی کہ نہ ان کی ارادت کے واسطے کوئی ظہری انتظام ہوا۔ اور نہ ان کے مشرب خاص کے لئے کسی زبانی تعلیم وتلقین کی ضرورت ہے۔ نادیدہ جمال محبوب ذوالجلال پر وہ شیفتہ ہوئے۔ اور بے دیکھے ان کے فیضان باطنی سے طالب خدا مستفیض ہوتے ہیں۔ تیرہ سو برس سے یہ تصرف جاری ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ جس کا سبب اصلی یہی ہے کہ بقول سرکار عالم پناہ ''عشق میں انتظام نہیں۔''

الغرض جملہ عاشقان الٰہی نے مشرب عشق کی تعلیم وتربیت کے لئے انتظام ظاہری کی ضرورت متصور نہیں فرمائی ہے جس طرح عنایت وہبی نے بغیر واسطے کے ان کو سرفراز فرمایا۔ اسی طرح ان کے فیضان باطنی سے طالب خدا بغیر وسیلہ کے مستفیض ہوئے اور ہوتے ہیں اور ہوں گے۔ اسی واسطے حضور نے متواتر فرمایا۔ اور بہ کمال اہتمام اس کا اعلان کرادیا کہ ''مشرب عشق میں جانشینی نہیں، جو محبت کرے وہ ہمارا ہے''۔

از آنجملہ حضور نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''جو مرید پیر کو دور سمجھے وہ مرید ناقص ہے اور جو پیر مرید سے دور رہے وہ پیر ناقص ہے''۔ اور یہ بھی متواتر حضور نے فرمایا ہے کہ ''اگر ہزار کوس پر ہو گے اور محبت ہے تو ہم دل کے پاس ہیں۔''

فرمان اوّل الذکر میں ایسا کلیہ فرمایا ہے جو نہایت ضروری اور جس کی تعمیل طلب کو طلب صادق، اور طالب کی ارادت کو ارادت واثق بناتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ حقیقت پیر کامل بیان فرمائی کہ مرید کی نگرانی کا وہ ذمہ دار ہے۔ اور فرمان ثانی میں اپنی شفقت اور عنایت کا اظہار کر دیا۔ اور اپنے غلاموں کو مخاطب فرما کر بشارت دی کہ ''اگر خلوص اور محبت ہے، تو ہزار کوس پر کیوں نہ ہو۔ مگر ہم دل کے پاس ہیں۔''

غرض ہر دو ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ مریدین کو آگاہ کیا کہ پیر کو دور نہ سمجھو جو ارادت کے لئے لازمی ہے۔ اور پھر اس کی بھی بشارت دی کہ ہم تمہارے قریب اور معین و معاون رہیں گے، جو آپ کے علوی مرتبت کی کافی دلیل بھی ہے۔

جس طرح بچوں کو ان کی بہبودی کے واسطے ان کے بزرگ غایت محبت سے سمجھاتے ہیں کہ اگر تم پڑھو گے تو ہم مٹھائی دیں گے اسی طرح حضور نے اپنی کمال شفقت سے ہم غلاموں کو سمجھایا کہ ''اپنا خیال پختہ کرو۔ ہم تم سے دور نہیں ہیں۔''

ہمارے وارث عالم پناہ کی یہ شفقت بالکل سنت الٰہی کے بھی مطابق ہے۔ کیونکہ حضرت احدیت جل جلالہ نے جب ہم کو اس فرض کا لازمی حکم دیا جس کا خاص محبت سے تعلق ہے، تو اس کی ترغیب کے واسطے اپنے انعام غیر محدود کا بھی وعدہ فرمایا کہ ''فاذکرونی اذکرکم''۔ یعنی تم ہمارا ذکر کرو گے تو ہم تمہارا ذکر کریں گے اسی طرح شفقت وارثی نے ہم کو آگاہ کیا کہ پیر کو دور نہ سمجھو۔ پھر اپنی اس خاص عنایت کا

وعدہ فرمایا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

حضرت صوفیہ کرام نے پیر کی غائبانہ امداد و دست گیری کو قطعی طور پر ثابت فرمایا ہے جس کا ذکر کتب تصوف میں اس کثرت اور وضاحت سے ہے کہ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ حضرت سلطان باہو قادری علیہ الرحمتہ نے اپنی کتاب گنج الاسرار میں اس کی بحث کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ پیر اپنے مرید کا غائبانہ دست گیر رہتا ہے۔ اور جو پیر اپنے مریدوں کے حالات سے بے خبر رہے وہ پیر ناقص ہے۔ اور مولانا علیہ الرحمتہ بھی یہی فرماتے ہیں ؎

اولیا اطفال حق اند اے پسر
غائبی و حاضری بس باخبر

(اے بیٹے! اولیاء حق کے بچے ہیں۔ کبھی غائب ہوتے ہیں اور کبھی حاضر۔ لیکن باخبر ہوتے ہیں۔)

اور بعض مقبولان کردگار جو صاحب اختیار کامل تھے، انہوں نے مریدین سے امداد اور دست گیری کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ امام شعرانی نے طبقات الکبریٰ میں حضرت ابراہیم دسوقی قرشی علیہ الرحمتہ کی کتاب الجواہر سے نقل کیا ہے کہ آپ مریدوں سے فرماتے تھے: (ترجمہ) ''اے بچو۔ اگر تمہارا عہد میرے ساتھ درست ہے تو میں تم سے قریب ہوں دور نہیں ہوں۔''

نیز حضرت غوث الثقلین ابو صالح سیدی عبدالقادر رضی اللہ عنہ کے مقدس حالات میں لکھا ہے کہ آپ کا قول ہے: (ترجمہ) ''میرے مریدوں میں سے جس کا گھوڑا ٹھوکر کھائے قیامت تک میں اس کا ہاتھ پکڑنے والا ہوں''۔ چنانچہ قصیدۂ غوثیہ

میں آپ فرماتے ہیں ؎

مریدی لا تخف واش فانی
عزوم قاتل عند القتالی

(اے میرے مرید نہ ڈر۔ بے شک میں پختہ ارادہ کرنے والا ہوں۔اور جنگ کرنے والا ہوں جنگ کرنے والوں کے ساتھ۔)

لہٰذا ہم غلامان وارثی بھی اس انعام سے محروم نہیں رہے۔اور ہمارے مقتداً برحق نے بھی وعدہ فرمایا کہ ''ہزار کوس پر ہو گے اور محبت ہے تو ہم دل کے پاس ہیں''۔ اور اس صادق الاقرار پیشوا نے دکھا بھی دیا کہ ہم غائبانہ دست گیری کرتے ہیں۔اور تمہارے معین و مددگار رہتے ہیں۔

چنانچہ اکثر مریدین حضرات کو ایسے واقعات پیش آئے کہ حضور نے امداد فرمائی اور تکلیف مبدل بہ راحت ہوگئی۔جس کی تصریح کی شاید ضرورت نہیں۔کیونکہ جن کے دکھانے کے لئے یہ واقعات نہ تفصیل نگارش کروں گا'' وہ مجھ سے زیادہ حضور کے اس فیض و تصرف سے واقف ہیں۔اور خوب جانتے ہیں کہ ہمارا وارث ضرور ہماری امداد کرتا ہے۔اور اس کا بھی یقین ہے کہ ہمیشہ یوں ہی دست گیری فرمائے گا۔

لیکن یہ ہدایت کہ پیر کو دور نہ سمجھو جس کی عدم تعمیل ارادت کو ناقص کرتی ہے اور اس ارشاد میں قطعیت اور تعمیم کلی بھی ہے۔اس لئے ہمارا فرض منصبی نہیں بلکہ فرض عین ہے کہ بقدر امکان خیال کو پختہ کریں۔اور بہزار عجز و نیاز اس کارساز حقیقی سے توفیق کے مستدعی اور خواستگار ہوں کہ

بدل دے اور دل اس دل کے بدلے

الٰہی تو تو رب العالمین ہے!

معہذا جناب حضرت نے اس کی بھی عام تاکید فرمائی ہے کہ "وضع کی پابندی کرو۔" اور جس حلقہ بگوش نے وضع کا خیال کیا، اس سے ضرور آپ خوش ہوئے، بلکہ خود حضور کے مزاج ہمایوں کا یہ انداز تھا، کہ اتفاقیہ طور پر اگر کوئی کام ایک مرتبہ بھی کیا تو بہ لحاظ وضع ہمیشہ اس کا خیال رکھا۔ اور اس کی ضرور پابندی کی۔ اگر چہ اس کی تفصیل میں طوالت بہت ہے لیکن نہایت اختصار کے ساتھ جناب والا کی چند عادات نگارش کرتا ہوں جن کے دیکھنے سے ظاہر ہو جائے گا کہ حضور نے روزمرہ کی معمولی باتوں میں بھی ایسی مستقل پابندی سے وضع کا لحاظ فرمایا، جس کی نظیر نہیں ملتی۔

مثلاً انداز استراحت یہ تھا کہ آپ داہنے پہلو سے آرام فرماتے تھے۔ چنانچہ حضور نے بکمال اہتمام اس کی پابندی فرمائی، اور ہر وقت داہنے پہلو سے آرام فرمایا۔ کسی وجہ سے نشست چارزانو بالکل ناپسند تھی۔ جس کو ایسا ترک فرمایا کہ کسی خاص ضرورت کے وقت بھی یہ نشست جائز نہ رکھی۔

ہر روز سر اقدس اور ریش اطہر میں شانہ ہوتا تھا۔ اس وضع کا ایسا خیال رکھا کہ ہمیشہ وقت معینہ پر ضرور شانہ کیا۔

علیٰ ہذا سرمہ بھی اسی طریقہ سے لگایا کہ جو وقت اس کے لئے مقرر تھا اس وقت سرمہ لگانا کبھی سہو نہیں فرمایا۔

کھانا تناول فرمانے کے لئے جو طرز اور نشست اختیار کی تھی، کبھی کسی خاص وجہ سے بھی اس میں تغیر نہیں ہوا۔

ایک مرتبہ بھی جس حاجت مند کی حاجت روائی فرمائی پھر جب وہ حاضر ہوا،

تو اسی قدر اس کی پرورش ضرور کی گئی۔

دستور یہ تھا کہ جب سفر سے دیوے میں تشریف لاتے تھے تو بدنام شاہ اور خدا بخش شاہ کو اپنی صورت دکھانے کھیولی اور پینڈ ضرور جاتے تھے۔اس وضع کا لحاظ ایسا فرمایا کہ بدنام شاہ اور خدا بخش شاہ کے انتقال کے بعد بھی اس صاحب وضع کامل نے چند مرتبہ یہ تکلیف گوارا فرمائی۔

کسی شہر یا قصبہ یا گاؤں میں پہلی مرتبہ جس کے مکان میں قیام پذیر ہوئے پھر جب وہاں تشریف لے گئے تو اسی کے مہمان ہوئے۔ بلکہ اکثر یہ ہوا ہے کہ پہلے ایسے شخص کے مہمان ہوئے کہ جو غریب یا معمولی طبقہ کا ہو،اور بعد میں وہیں کے شرفا اور سر برآوردہ رئیس حلقہ بگوش ہوئے ،اورانہوں نے التجا کی کہ اس مکان میں تکلیف ہوتی ہے حضور ہمارے مکان میں قیام فرمائیں۔مگر جناب حضرت نے کبھی پسند نہیں کیا اور یہی فرمایا کہ وضع کے خلاف ہے۔

چنانچہ ایسے متعدد واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ بہرائچ میں حافظ پیاری نے نہایت اولوالعزمی سے حضور کی دعوت کی جس میں چند راجہ بھی ان کے مہمان تھے واپسی کے وقت آپ کے قدیم حلقہ بگوش محمد سلیم مستری نے جو معمولی تنخواہ پر ریاست پیاگ پور میں ملازم تھے اس استحقاق سے آپ کو مدعو کیا کہ پہلے بھی ان کو یہ سعادت نصیب ہو چکی تھی ، کہ حضور اس راستہ سے گزر رہے تھے اور ان کے مہمان ہوئے تھے جب یہ خبر راجہ صاحب پیاگ پور کو ہوئی جو اس جلسہ میں موجود تھے،تو دست بستہ ملتجی ہوئے کہ محمد سلیم غریب آدمی ہے اور اس کا مکان اسٹیشن سے دوکوس ہے اور میرا مکان اسٹیشن سے بہت قریب ہے۔ لہٰذا آپ وہیں قیام فرمائیں،تو میری

عزت افزائی ہوگی۔ راجہ صاحب کا یہ اصرار حضور کو ناپسند ہوا، اور فرمایا کہ ''ہم کو کسی امیر سے غرض ہے نہ غریب سے۔ مستری کو محبت ہے۔ اور ہم اس کے یہاں ٹھہر چکے ہیں۔ دوسری جگہ رہنا وضع کے خلاف ہے''۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ محمد سلیم کے خس پوش مکان میں قیام کیا۔ اور باوجود اصرار بلیغ راجہ صاحب کی رفیع الشان کوٹھی میں رہنا گوارا نہ فرمایا۔ اور غریب مستری کی محبت کے مقابلہ میں راجہ صاحب کی وجاہت کو ہیچ سمجھا۔

انتہا یہ کہ دیہات کے سفر میں اگر کسی مقام پر استنجاء کیا یا کسی درخت کے سایہ میں آرام کیا۔ یا کسی کنوئیں کا پانی پیا۔ تو جب کبھی اس راستہ سے گزر ہوا تو اسی مقام پر ضرور استنجاء کیا جہاں کیا تھا۔ اور اس درخت کے سایہ میں وقفہ کرنا لازمی تھا۔ یا اس کنوئیں کا پانی ضرور نوش فرماتے تھے۔ جناب حضرت کا ہر بات میں غیر معمولی طور پر لحاظ وضع فرمانا شاید اس وجہ سے بھی تھا کہ اکثر ارشاد ہوا ہے کہ ''سید واڑہ میں سب وضع دار تھے جو کہتے تھے وہ کرتے تھے۔'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''ہمارے خاندان میں ایسے پابند وضع تھے کہ چچا ہمارے والد سے ناخوش ہوکر بریلی چلے گئے۔ اور کہا کہ جب مر جاؤ گے تو آؤں گا۔ وہی کیا کہ جب انتقال کی خبر سنی، تو آئے اور فاتحہ میں بہت روپیہ صرف کیا۔''

شاید اسی وجہ سے حضور نے اپنے غلاموں کو بھی پابند وضع رہنے کی تاکید فرمائی، اور جس نے عمل کیا، اس سے خوش ہوئے۔ جیسا کہ مولوی محمد یحیٰی وکیل و رئیس عظیم آباد جن کو وضع دار کا خطاب مرحمت ہوا تھا۔ کیونکہ مولوی صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا تھا ہمیشہ اس کے پابند رہے۔ حتیٰ کہ میلہ کاتک کی شرکت کے لئے جس تاریخ

کووہ پہلی مرتبہ آئے تھے اسی تاریخ کو ہمیشہ حاضر ہوتے تھے۔

بلکہ ایک مرتبہ یہ دشواری پیش آئی کہ ان کی لڑکی عارضہ ہیضہ میں مبتلا تھی، اور تاریخ حاضری آگئی۔ مولوی صاحب اس کو احتضار یا جان کندنی کی حالت میں چھوڑ کر دیوے شریف چلے آئے جس کے دوسرے روز مریضہ کے معالج ڈاکٹر اصدر علی خاں کا تار آیا کہ لڑکی کا انتقال ہوگیا۔

یہ خبر حضور نے سنی، تو مولوی صاحب کو بلا کر فرمایا کہ ''مولوی صاحب تم نے تو اپنی وضعداری دکھا دی۔ لیکن اکثر مریض کو سکتہ ہو جاتا ہے، اور سب سمجھتے ہیں کہ مر گیا''۔ اس وقت حاضرین نے اس کا خیال نہیں کیا کہ اس ارشاد کے پردے میں کیا تصرف فرمایا۔ مگر تیسرے روز مکان سے خط آیا کہ چھ گھنٹہ کے بعد لڑکی زندہ ہوگئی، اور اب اچھی ہے۔ غرض مولوی صاحب کو اس وضعداری نے صدمۂ جانکاہ سے بچایا اور ''ہم خرما و ہم ثواب'' کے مصداق ہوئے۔

ازاں جملہ یہ بھی حضور نے فرمایا ہے کہ ''عاشق کا مرید بے ایمان نہیں مرتا۔'' اس ارشاد میں قطعی تعمیم اور بلا تخصیص حیثیت و استعداد کل مریدین سے خطاب اور سب کے واسطے یہ خوش خبری یکساں ہے۔ کیونکہ اس فرمان میں مطلق مرید کا ذکر ہے۔ اس کے مدارج سے بحث نہیں کی گئی۔ اس لئے بغیر کسی تفریق کے جس طرح بہ لحاظ بیعت جملہ حلقہ بگوش ایک رشتہ میں وابستہ ہیں۔ اور اپنے مقتداء برحق کو بیک زبان پیر کہتے ہیں۔ اسی طرح حضور نے ہمارے اعمال واطوار میں تخصیص و امتیاز کو دخل نہیں دیا۔ بلکہ غیرت وارثی نے اپنے اچھے اور برے مریدوں کو یکساں یاد فرمایا۔ اور اس انعام میں سب کا مساوی حصہ تجویز ہوا۔ اور سب کی امداد وحمایت کا ایک طور پر

وعدہ کیا۔ اور جوش رہبری اور شان محبوبیت میں فرمایا کہ ہمارا کوئی مرید بے ایمان نہ مرے گا۔ لہٰذا دیگر ہدایات میں تو عقائد و اعمال کی تعلیم یا شائستگی اخلاق کا سبق ہے۔ لیکن یہ فرمان سراپا بشارت اور حضور کی قوت کامل وتصرفات اتم کی بین دلیل ہے۔

اگر ارشاد مذکور بظاہر مشروط معلوم ہو کہ یہ بشارت بحق مرید عاشق ہے اور حضور نے ایک کلیہ بیان کیا ہے۔ یہ تو فرمایا نہیں کہ میرا مرید بے ایمان نہ مرے گا۔ تو اس شبہ کی رفعدادیوں ہوجائے گی کہ جناب حضرت کی انکسار آمیز طبیعت اور سادگی پسند مزاج کا یہ تقاضا ہے کہ اپنے کامل اختیار اور علوی مرتبت کے اظہار تصریح میں تامل ہوا، اور لفظ عاشق کے حجاب میں یہ بشارت دی۔ اور یہ لفظ عاشق واضح طور پر ضمیر متکلم اس وجہ سے ہے کہ وہ فرمان جس کے اعلان کا اہتمام ہوا۔ اور آپ کے حکم سے ضبط تحریر میں آیا۔ اس میں صاف ارشاد ہوا ہے کہ ہماری منزل عشق ہے جس سے ثابت ہو گیا کہ حضور قطعی عاشق کامل ہیں۔ اور عشق الٰہی آپ کا عین مشرب ہے۔ اور جب یہ فرمایا کہ ''عاشق کا مرید بے ایمان نہیں مرتا۔'' تو عاشق سے مراد حضور ہی کی ذات بابرکات متصور ہوگی۔ اور اس کے معنی یہی ہوں گے کہ ہمارا مرید بے ایمان نہیں مرتا۔''

اور بفرض محال اگر یہ خصوصیت اجمالی ہی متصور ہو، اور لفظ عاشق میں دیگر عاشقان باصفا بھی شریک سمجھے جائیں، تو بھی ہم کو اتفاق ہے۔ اس لئے کہ امت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اکثر ایسے اولوالعزم اور صاحب اختیار عاشق گزرے ہیں جن کے عشق صادق کا زمانہ معترف ہے۔ بلکہ بعض مقبولان احدیت نے جوش عشق میں اپنے مریدوں کو جنت کی خوش خبری بھی دی ہے جس کا ذکر ان کے ملفوظات میں

ہے۔اوراس خوش خبری پر متقدمین حضرات صوفیہ نے بھروسہ بھی کیا ہے۔جیسا کہ حضرت نظامی فرماتے ہیں۔

خوف رستا خیزاز قلب نظامی محوشد

لطف پیرے فروشاں را پنا ہے ساختم

(جنگ کا ڈر نظامی کے دل سے مٹ گیا۔شراب بیچنے والے پیر مغاں کی شفقت کو میں نے اپنی پناہ بنالیا۔)

پس جس طرح وہ حضرات اپنے مریدین کو جنت کی بشارت دے گئے۔اسی طرح ہمارے مقتداء ذی مرتبت نے جس کے عشق کامل کا چار دانگ عالم میں نقارہ بجا،اپنے غلاموں کو یہ بشارت دی کہ بے ایمان نہ مرو گے۔

لیکن اس حقیقت اجمالی میں بھی ہم کو فخر اس کا ہے کہ ہماری بشارت میں خاص امتیاز ہے۔اور سرکار وارثی سے ہم کو وہ انعام ملا ہے جس کے لائق ہرگز ہم نہ تھے۔کیونکہ حضرات عاشقین نے اگر اپنے مریدوں پر شفقت فرمائی،توان کو جنت کی بشارت دی لیکن ہمارے صادق الاقرار وارث عالی تبار نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ تم بے ایمان نہ مرو گے۔گو جنتی ہونا بھی آسان نہیں۔مگر ایمان تصدیق کا مرادف اور روحانی مدارج میں بہت بڑا مرتبہ ہے۔جس کی تشریح سے حضرات صوفیہ کرام کی تصنیفات مملو ہیں۔اس لئے ہم بہزار ناز اس کا آوازہ بلند کر سکتے ہیں،کہ انشاءاللہ وارث پاک کی دست گیری سے بے ایمان نہ مریں گے۔

چنانچہ اسی عالم میں مشاہدہ ہوگیا کہ فیضان وارثی ہمارے ایمان کا قطعی محافظ ہے۔اور دم آخر ضرور دست گیری ہوتی ہے۔اور ہم با مراد مرتے ہیں۔مگر یہ تصرف

عام تو ایسا مشہور ہے کہ جس کی تصریح کی بھی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ جملہ غلامان وارثی واقف ہیں، اور متعدد واقعات بچشم خود دیکھ چکے ہیں کہ آپ کے دست گرفتہ کا خاتمہ اچھا ہوتا ہے۔ اوران کا یہ علم ان کے اطمینان کے واسطے کافی ہے۔ اور اس کی تصدیق ہے کہ ''عاشق کا مرید بے ایمان نہیں مرتا۔''

اگر یہ خیال ہو کہ مستر شدین عشاق کے لئے بے ایمان نہ مرنے کی خصوصیت کیوں ہے؟ تو اس کا تصفیہ یوں ہوتا ہے کہ ایمان جس کا تعلق قلب سے ہے وہ بغیر محبت حاصل نہیں ہوتا۔ اس واسطے مرید عاشق کی شرط لازمی تھی، کیونکہ عاشق کامل کا حلقہ بگوش فیضان محبت ہی سے مستفیض ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ایمان یعنی محبت سے جب سروکار رہوا، تو ضرور ہے کہ خاتمہ ایمان پر ہو جو محبت کا نتیجہ ہے۔

یا یوں کہا جائے کہ مشرب عشق میں بیعت کے لئے محبت کو شرط گردانا ہے جیسا صاحب فوائد الفواد نے لکھا ہے کہ ''ارادت و بیعت عبارتست از عشق و محبت پیر''۔ یعنی ارادت کی ابتدا ہی محبت پیر سے ہوتی ہے،۔ اور مرید بقدر استعداد پیر کا عاشق ضرور ہوتا ہے۔ یہ تعریف تو عاشق کے مرید کی ہوئی۔ اور نتیجہ محبت یہ ہے کہ بموجب حدیث نبویؐ ''المرء مع من احب''۔ جس سے محبت ہوتی ہے وہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ لہٰذا ارشاد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صاحب محبت مرید اپنے پیر عاشق کامل کے ساتھ رہے گا۔ اور جب عاشق کامل کی معیت میں ہے، تو بے ایمان کیونکر مر سکتا ہے۔ اس لئے ہم کو امید بلکہ یقین ہے کہ انشاء اللہ بے ایمان نہ مریں گے۔

لیکن یہ دوسری بشارت اور زیادہ واضح اور باعث افتخار ہے کہ حضور نے متواتر یہ فرمایا ہے کہ ''ہمارے یہاں سب کا حصہ ہے۔ جو جس کی قسمت کا ہے، وہ اس

کوضرور ملتا ہے۔ اگر زندگی میں نہیں ملتا ہے تو مرتے وقت اس کو دیا جاتا ہے اگر مرتے وقت بھی نہیں، تو اس کی قبر میں ٹھونس دیا جاتا ہے''۔

اس خوش خبری کا مضمون بغیر کسی تصریح کے عام ہے۔ اور ہمارے خضر طریقت نے اس ارشاد میں سخائے پنجتنی اور شان وارثی کا اظہار فرمایا ہے کہ غلاموں کو وہ انعام دینے کا وعدہ کیا ہے جو ان کی حیثیت اور امید سے بہت زیادہ ہے۔ اور حضور کے اس فیض عام نے ہر ایک حلقہ بگوش کو اس نعمت عظمیٰ کا حصہ دار بنادیا جس کی حقیقت سمجھنے میں ہمارا ادراک قاصر ہے۔ کیونکہ جناب والا نے اپنے جملہ غلاموں سے یہ خطاب کیا ہے کہ جس کا جو حصہ ہے وہ اس کو دیا جائے گا۔ یہ وعدہ زر و جواہر تقسیم کرنے کا تو ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ زر و جواہر سے تو ہمیشہ تنفر رہا۔ چنانچہ آپ کے متروکات میں ایک ترک یہ بھی خصوصیت کے ساتھ دیکھا گیا ہے کہ حضور نے روپیہ، پیسہ، اشرفی کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ لہٰذا یہ حصہ آپ نے اسی دولت لازوال کا تقسیم فرمایا ہے۔ جو آپ کے گنجینۂ صدر میں محفوظ تھی۔ یا یوں کہا جائے کہ بہ نظر پرورش آپ نے ہر ایک غلام کو اس دولت میں سے حصہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے جو آپ کو وراثتاً اہل بیت کرام سے پہنچی اور عرف صوفیہ میں جس کو فقر کہتے ہیں۔

یہ بشارت غلامان وارثی کے لئے ضرور سرمایہ ناز ہے۔ کیونکہ اس تقسیم میں سب سے چھوٹا حصہ بھی جس کو مل گیا، یا ملے گا، وہ خوش نصیب ''کر منا بنی آدم'' کا مصداق ہوگا۔ کیونکہ مقام فقر وہ اعلیٰ اور برتر مرتبہ ہے کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ''الفقر فخری ''، بس ایسی مہتم بالشان عظمت کی اگر ہوا بھی کسی کو لگ جائے گی تو جو کچھ فخر و مباہات وہ کرے، اس کو زیبا ہے۔ اس واسطے کہ خلاصۂ

فقر یہ ہے کہ موجودات عالم سے انقطاع قطعی اور خدا سے سروکار کامل ہو۔ اور جس کو فقر سے جس قدر نسبت ہوتی ہے، اسی قدر اس کو حضرت احدیت جل جلالہ سے سرکار ہوتا ہے۔ لہٰذا معمولی سروکار الٰہی بھی اگر نصیب ہو تو کم از کم اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوگا کہ باایمان مریں گے۔

البتہ یہ حصہ قسمت مریدین کے ساتھ مشروط ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عطیۂ وارثی بہ لحاظ حیثیت و استعداد تقسیم ہوگا۔ اور اس کی ضرورت بھی تھی، کیونکہ ہمارا ظرف مساوی نہیں ہے۔ بلکہ حضور کی یہ بندہ پروری ہے کہ ہم ایسے نااہل و ناکارہ غلاموں کو بھی اس تقسیم میں شریک گردانا۔ اور شاید اسی وجہ سے یہ استحقاق مشارکت کسی خدمت پر منحصر نہیں رکھا۔ محض اپنی عنایت سے یہ شان وارثی دکھائی کہ ہر ایک دست گرفتہ کو فیضان باطنی سے مستفیض فرمانے کا وعدہ کیا۔

الحمد للّٰه علی احسانه۔ (تمام تر تعریفیں اللہ کیلئے ہیں اس کے احسانات پر)

الغرض جناب اقدس کے مجموعہ ملفوظات میں سے یہ چند ارشادات اس خیال سے نقل کئے کہ تمامی مریدوں کے واسطے یہ احکامات مساوی حکم رکھتے ہیں۔ اور جملہ آستاں بوس بقدر حیثیت ان کی تعمیل کے لئے ضرور مکلّف ہیں۔ اور یہی ہدایات ہمارے دنیوی معاملات کو بھی درست کرتے ہیں۔ اور دینی فتوحات حاصل کرنے کے لئے بھی انہیں کی تعمیل کافی ہے۔ بلکہ انہیں چند ارشادات کو اگر غلامان وارثی کے مشربی قانون کا خلاصہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

مگر یہ ضرور ہے کہ ان کی شرح وبسط کے ہم محتاج ہیں۔ اور وہ نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہ احکام بھی بظاہر روزمرہ کے الفاظ میں صادر ہوئے ہیں۔ لیکن باطنی فیوضات

سے چونکہ گہرا تعلق رکھتے ہیں، اس لئے درحقیقت روحانیت سے مملو اور نکات معنوی سے معمور ہیں۔

گو اپنی جسارت سے بعض ہدایات کی مختصر طور پر شرح بھی کی، مگر اس کا اعتراف ہے کہ واقعی مجھ کو یہ اہلیت نصیب ہے۔ رموز تصوف سے محض نابلد ہوں اور سلوک طریقت سے بالکل بے خبر۔ اسی وجہ سے نکات معنوی کا ذکر بھی نہ کر سکا، اور یہ شرح ناکافی اور ناتمام رہ گئی۔ ہاں اگر کوئی عالی خیال اور صاحب کیفیت وحال لکھتا تو وہ شرح بکار آمد اور قابل اعتبار ضرور ہوتی۔

علاوہ اس کے یہ معیار بھی قائم نہیں کر سکتا کہ انہیں ملفوظات میں تعمیم ہے۔ اور یہی ہدایتیں جملہ مریدین کے حق میں مساوی حکم رکھتی ہیں۔ کیونکہ یہ ارشادات تو اپنے علم وحافظہ کے اعتبار سے نقل کئے ہیں۔ اور ان کو سرکار وارثی کا حکم عام سمجھنا ہے۔ بہت ممکن بلکہ ضرور ہے کہ ایسے اور بھی متعدد فرمان وارثی ہماری ہدایت کے لئے وقتاً فوقتاً صادر ہوئے ہوں۔ لیکن اس کمی کو وہ معزز برادران طریقت پورا کر سکتے ہیں جو ایسے ملفوظات کی سماعت سے مستفید ہوئے ہوں اور اپنے گوشۂ دل میں ایسے گوہر بے بہا محفوظ رکھتے ہوں۔

لیکن اس ناتمام تصریح سے بھی اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ شفقت وارثی نے ہماری ہدایت کے لئے کیا کیا اہتمام فرمایا اور کیسے کیسے انعام مرحمت ہوئے۔ اور کس کس نعمت کی بشارت دی ہرگز جس کے لائق ہم نہ تھے۔ اور یہ بھی ظاہر ہو جائے گا، کہ غلامان وارثی کا مذاق ومسلک کیا ہے۔ آپ کے ایک ایک حلقہ بگوش نے بکمال صبر واستقلال کیسے کیسے اہم اور دشوار بلکہ ناقابل برداشت مجاہدے کئے اور شاہد حقیقی

کی یاد میں اپنی ہستی کو برباد کیا۔

مگر غلامان وارثی کے اس کثیر التعداد گروہ میں فقراء تہبند پوش بھی ہیں جن کے لباس اور طرز معاشرت میں خاص امتیاز ہے۔ گواحکام مذکورہ کی بجا آوری میں یہ گروہ بھی خصوصیت کے ساتھ شریک ہے۔ اوران ہدایات کی تعمیل اس گروہ کے لئے اسی قدر لازمی ہے۔ جس قدر عام غلامان وارثی کو ضروری ہے۔

لیکن سرکار وارثی نے اپنے خرقہ پوش غلاموں کے واسطے مخصوص طور پر بعض احکام صادر فرمائے ہیں جس کی تعمیل اسی حلقہ بگوش پر واجب ہے جو تہبند پوش ہے۔ مگر وہ ارشادات اس رسالہ میں نہیں درج ہو سکے۔ ہاں خدائے لایزال کا فضل اگر شامل حال رہے تو دوسری جلد میں وہ احکامات بھی بصراحت نگارش کروں گا۔ واللّٰہ المستعان وھو خیر الوارثین ۔(اوراللہ ہی مددگار ہے اور وہی سب وارثوں سے بہتر ہے۔)

تقریظ بے نظیر وتحریر دلپذیر

ازنتیجہ فکر عالی مقبول بارگاہ صمد جناب قاضی سلیمان احمد صاحب وارثی لکھنوی

صبا وقت سحر بوئے ز زلف یار می آورد
دل شوریدۂ ما را زِ نو درکار می آورد

(بادِ صبا سحری کے وقت یار کی زلف کی خوشبو لاتی ہے۔ ہمارے پریشان دل کو ایک نئے راز میں مصروف کرتی ہے۔)

الحمد اللہ کہ سرکار والا تبار تاج العارفین امام الواصلین سیدی وآقائی وارثی و مولائی کریم ابن کریم الحسنی آیۃ من آیت اللہ حضرت وارث پاک خلف الصدق صاحب لولاک سلام اللہ علیہ وعلی آبادیہ الکرام کا وہ کلام قدسی جس کو کتاب اللہ کی حقیقی تفسیر اور نبی امی ورسول ہاشمی ﷺ کی اصلی روحانی تعلیم کہنا زیبا ہے ہنوز پردۂ خفا میں مستور تھا۔ اس کو ہمارے خواجۂ تاش برادر دینی مخدوم ومحترم جناب مرزا محمد ابراہیم بیگ صاحب شیدا وارثی لکھنوی نے جو اس بارگاہ محتشم کے قدیم حلقہ بگوش ہیں۔ اور جن کو کافی زمانہ پیشوائے ذی مرتبت کی خدمت فیض درجت میں شرف حضوری حاصل رہا بکمال اہتمام رسالہ منہاج العشقیہ فی ارشاد الوارثیہ میں جمع کیا۔ جس کو مشرب غلامان وارثی کا دستور العمل کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

اس قانون محبت کا کتابی صورت میں لانا مؤلف ممدوح کا وہ احسان ہے جس سے کبھی ہم سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ بجز اس کے کہ حضرت وارث عالم پناہ کے

وسیلہ سے درگاہ احدیت جل جلالہ میں عرض کریں کہ پروردگار اپنے فضل وکرم سے مولف موصوف کو دارین میں خوش رکھے۔آمین۔ یہ ضرور ہے کہ ارشادات وارثی کو اس شرح وبسط کے ساتھ لکھنا دشوار تھا۔لیکن مولف کی سعی اور کوشش کو افضال ایزدی اور تصرف وارثی نے کامیاب فرمایا کہ وہ ارشاد جو غلاموں کے سینہ میں محفوظ تھے درج سفینہ ہوئے۔

مؤلف ممدوح نے یہ بھی اہتمام کیا ہے کہ وہی ہدایات نقل فرمائی ہیں جن کا مشرب وارثی سے گہرا تعلق اور عامہ مریدین سے یکساں سروکار ہے۔ بلکہ نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس رسالہ کا اصل موضوع صرف محبت اور ترک سوال ہے۔لیکن ہر دو مسائل کی تصریح اس خوبی سے عام فہم الفاظ میں مستند اور معتبر حوالہ سے کی ہے جو ناظرین کے لئے عموماً اور غلامان وارثی کے واسطے خصوصاً واقفیت کا اچھا ذریعہ ہے۔ حالانکہ خود مؤلف موصوف نے اعتراف کیا ہے۔اور بہت صحیح ہے کہ ارشادات وارثی کی تشریح محال ہے۔اس خیال سے اگر حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمتہ کا ہم نوا ہو کر یہ عرض کروں تو شاید ناموزوں نہ ہوگا۔

ایں شرح بے نہایت کز حسن یار گفتند

حرفیست کز ہزاراں کاندر عبارت آمد

(یہ لمبی شرح کہ جو یار کے حسن کے بارے میں انہوں نے کہی۔یہ ہزاروں میں سے فقط ایک حرف ہے جو بیان ہوگیا ہے۔)

اور احکامات وارثی کی حقیقی تشریح اس وجہ سے دشوار اور ہمارے حد اختیار سے باہر ہے۔کہ مشرب وارثی کا اصل الاصول عشق حقیقی ہے۔اور اس ہادی برحق و

خضر طریقت نے ہمارے واسطے موصل الی المقصود والمطلوب طریق عشق ہی کو تجویز فرمایا ہے۔اس لئے جملہ ہدایات وارثی محبت پر مشتمل ہیں اور حقیقت عشق اور ماہیت محبت کا اظہار قطعی دشوار ہے بس بجز سکوت وخاموشی اختیار نہیں۔ بقول۔

قصة العشق لا انفصام لها

وصمت ها هنا لسان القال

(عشق کا قصہ ختم ہونے والا نہیں بلکہ یہ تو مسلسل جاری رہتا ہے۔اس کیلئے کوئی انقطاع نہیں۔اور باتیں کرنے والی زبان وہاں خاموش ہوجاتی ہے۔)

لہٰذا اب خداوند جل وعلا کے حضور میں عرض ہے کہ وہ اس کتاب کو مقبول فرمائے۔اور طالبان صادق کو اس سے فائدہ پہنچائے۔اور آخر میں قطعۂ تاریخ طبع نگارش کرتا ہوں۔ وھوھذا

ہدایات وارث چو شیدآ نوشتہ ہمہ عین تلقین وتعلیم عشق است
چنیں بہر سالش ندا آمدہ بگو ہادی راہ اقلیم عشق است

۱۳۲۸ھ

(وارث پاک قدس سرہ العزیز کے ملفوظات، ہدایات اور ارشادات جو جناب شیدآ نے لکھے ہیں یہ سب عشق کی تلقین وتعلیم ہے۔اس کے سال کے بارے میں یوں آواز آئی کہ یہ عشق کی ولایت کے راستے کی رہنمائی کرنے والا ہے۔)

تمت بالخير

حصہ دوم

فحبک راحتی فی کل حین
وذکرک مونسی فی کل حال

(تیری محبت ہر وقت میرے لئے راحت ہے۔ اور تیرا ذکر ہر حال میں میرا مونس و غمخوار ہے۔)

اس شعر میں لسان الغیب حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمتہ نے عاشقان جان باز کی اس حقیقی حالت کا ذکر کیا جو بغیر کسی فرق وامتیاز کے عشق کا نتیجہ اور عشاق کا لازمی خاصہ ہے کہ محبت حبیب جب محبّ صادق کی عین راحت ہے تو ذکر محبوب کسی پیرایہ میں کیوں نہ ہو۔ عاشق غمگین کے خاطر بیقرار کے حزن و اضطرار کے واسطے ضرور باعث تسکین ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے ممتاز اور برگزیدہ اطبائے روحانی کی متفقہ رائے ہے کہ علیل محبت کی دوا ذکر خلیل ہے۔ چنانچہ حضرات عاشقین کا مقولہ ہے کہ ''طبیبی ذکر حبیبی'' اور مشہور ہے کہ قیس عامری کا مرض ہمیشہ ذکر لیلےٰ سے زائل ہوا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ''ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے''۔

لہٰذا سرگرداں وادی الفت کے رنج وآلام کا صریح علاج فقط مطلوب کا نام ہے۔ بلکہ بعض فراق رسیدہ عشاق نے خاطر مغموم کی تشفی کے لئے اسم یار کی کتابت فرمائی ہے اور اسی شغل کی بدولت غم روزگار سے فراغت پائی۔ جیسا کہ مجنون کے احوال میں حضرت شمس الملت والدین مولانا جلال الدین رومی قدس سرہ العزیز کے

یہ اشعار مشہور ہیں:۔

دید مجنوں رایکے صحرا نورد — در بیابان غمش بہ نشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتان قلم — می نمودی بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست این — می نویسی نامہ بہر کیست این
گفت مشق نام لیلیٰ میکنم — خاطر خود را تسلی میکنم

(ایک صحرانورد مسافر نے مجنون کو دیکھا کہ لیلیٰ کے غم کے بیابان میں وہ اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ ریت کاغذ اور انگلیاں قلم تھیں۔ کسی کیلئے وہ ایک نامہ لکھ رہا تھا۔ اس مسافر نے کہا اے مجنون، شیدائی یہ کیا ہے؟ تو کس لئے نامہ لکھ رہا ہے؟ اس نے کہا میں لیلیٰ کے نام کی مشق کرر ہاہوں۔ اور اپنے آپ کو تسلی دے رہاہوں۔)

لیکن یہ حالت انہیں اہل محبت کو نصیب ہوئی ہے جو روز میثاق سے شاہد قدیم وقدیر کے شیفتہ اور میثاق ہیں۔ عوام کا یہ منصب نہیں کہ عارضی جوش کا عاشقان ذی مرتبت کی گرانقدر حالت سے مقابلہ کریں۔ کجا لعل بے بہا۔ کجا سنگ خارا۔ وہ عاشق صادق مقبول حق ہم ظاہر بین ہوسناک۔ ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' (خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت۔) بقول

پائے بست عالم سفلی بعلوی کے رسد
ہرزہ کارے دیگر و دیدار بنی دیگر است

(جس کے پاؤں علوم سفلی کی طرف بندھے ہوئے ہوں وہ بلند مقام کی طرف کیسے پہنچ سکتا ہے۔ بے ہودہ فالتو کام کچھ اور ہیں اور محبوب کا دیدار کرنا کچھ اور ہے۔)

خصوصاً مجھ نابلد راہ محبت کو ذکر عشق و عاشقی کا خیال کرنا بھی نازیبا ہے

حالانکہ نام تو ضرور شیدا مشہور ہوا۔ مگر نہ سوز محبت سے دل باخبر نہ انتظار یار سے آنکھیں بہرہ ور۔ نہ واقف رموز اشتیاق لذت فراق ہوں۔ فی الحقیقت۔ ''برعکس نہند نام زنگی کافور'' (زنگی کا نام کافور رکھ دینا) کا مصداق ہوں۔ البتہ اس کی قوی امید ہے کہ حضرات اہل محبت کی تقلید میرے واسطے مفید ہوگی۔ اس لئے وہی کام پھر کرتا ہوں جس میں مصروف تھا۔ اور ارشادات وارثیہ کی دوسری جلد بسم اللہ کر کے شروع کرتا ہوں ''رب یسر ولاتعسر وتمم بالخیر۔'' (اے میرے رب! آسان فرما اور میرے لئے مشکل نہ فرما۔ اور یہ کام جو میں نے شروع کیا ہے اسے اچھائی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔)

ہر چند جلد اول میں جو احکام وارثی نقل ہوئے۔ وہ جملہ مریدین کے واسطے مساوی حکم رکھتے ہیں۔ لیکن حضور کے حلقہ بگوشوں میں ایک ممتاز گروہ تہبند پوشوں کا ہے جو بہ لحاظ ارادت جمیع غلامان وارثی کے ساتھ ارشادات مذکورہ کی تعمیل میں بغیر کسی افتراق کے شریک ہیں۔ لیکن اس خرقہ پوش جماعت کے لئے بعض قیود شرائط مخصوص بھی ہیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں وہی احکام نقل کروں گا جن کی تعمیل کے واسطے وہی ارادتمند مکلّف ہیں جو بارگاہ وارثی کے فقیر تہبند پوش ہیں۔

اور میں نے یہ اہتمام بھی ملحوظ رکھا ہے کہ بعض فقرا کے حق ہیں جو خاص احکام صادر ہوئے ہیں اور جن کی شخصی خصوصیت اور انفرادی حیثیت سے ان کا ذکر نہ کروں گا بلکہ اس رسالہ میں وہی فرمان وارثی نقل ہونگے۔ جن کو کلیۂ تعمیم کا مرتبہ حاصل ہے اور بغیر کسی فرق و امتیاز کے جن کی تعمیل جملہ فقرائے وارثی کو یکساں لازمی اور ضروری ہے۔ تاکہ یہ مجموعہ ملفوظات فقرائے وارثی کے مشربی دستورالعمل کا خلاصہ اور قانون مسلک کا ایک نمونہ سمجھا جائے۔

یہ بھی عرض کروں گا کہ اس رسالہ میں وہی ملفوظ نقل ہوں گے جو میرے حافظہ میں محفوظ ہیں یا جن کا علم معتبر ذرائع سے ہوا ہے کیوں کہ میری مختصر زمانہ کی حاضری ہرگز اسکی مقتضی نہیں کہ جملہ احکام وارثی سے خبردار ہونے کا دعوے کروں ممکن ہے کہ اپنے فقرا کے حق میں علاوہ ان ارشادات کے حضور نے اور بھی احکامات صادر فرمائے ہوں۔ اور قرینہ ہے کہ ضرور فرمائے ہوں گے۔ لیکن ان کا علم مجھ کو نہیں۔ اگر ایسا ہوتو اس کمی کو وہ ممتاز اخوان ملت پورا کر سکتے ہیں جن کو پیشوائے برحق کی خدمت دیرینہ کا اختصاص حاصل ہے۔

علیٰ ہذا اس محدود واقفیت کے ساتھ مجھ کو اپنی عدم قابلیت کا بھی بخوبی اندازہ ہے اور اس کا اعتراف ہے کہ مذاق فقر و مسائل تصوف سے قطعی نابلد و ناواقف ہوں اور مشکل یہ ہے کہ اس رسالہ میں وہی ملفوظات وارثی نقل کرنا چاہتا ہوں جن کو فقر سے واسطہ ہے اور لازمی ہے کہ فقر کے شرائط و قیود کو روحانیت سے گہرا تعلق ہوگا اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ مسائل روحانی کی تشریح بہت دشوار ہے۔ بقول جامی علیہ الرحمتہ

جامیؔ کشیدہ دار زبان را کہ سر عشق
رمزیست کس مدان و حدیثے است کس مگوئے

(اے جامیؔ! اپنی زبان کو کھینچے رکھ کیونکہ یہ عشق کے راز ایسی رمز ہیں کہ جن کو کوئی نہیں جانتا اور یہ ایسی بات ہے کہ جو کسی سے بیان نہ کر۔)

اور خاص کر مجھ نااہل کو تو مطلق اس کی صلاحیت نہیں۔ اس لئے اگر کسی ملفوظ کی تشریح کرنے کی جسارت بھی کروں گا تو شاید اس کا ظاہری مفہوم کسی قدر رنگارش کر سکوں ورنہ باطنی نکات و لطائف تو بالکل چھوٹ جائیں گے اور میری تشریح یقینی ناممل

رہے گی۔

اور دستور ہے کہ نامکمل تحریر ہمیشہ غیر مفید سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا بہزار ادب ناظرین کی خدمت میں گذارش ہے کہ میری بے ربط اور عامیانہ تشریح کو جو بیرونی پوست کے مانند بیکار محض ہے نظر انداز فرما کر کلام یعنی مرشد برحق کے ارشادات کے حسن ظاہری و باطنی کو اگر آپ بغور وتامل دیکھیں گے۔ تو انشاء اللہ بقدر حیثیت و استعداد ضرور گوہر مراد سے مالا مال ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ ملفوظات اس مبدۂ فیاض کے ہیں جو ادنے و اعلےٰ کی دستگیری کا ذمہ دار ہوا۔ اور جس کی شان رہبری نے یہ کر شمہ دکھایا کہ ہزاروں حلقہ بگوش اس کے محبت الٰہی کے جوش میں بے خود و مدہوش ہوئے اور لاکھوں خوش انجام کامیاب اور فائز المرام ہو گئے اور آج بھی اہل ظواہر اسی کے ملفوظات کے ظاہری مفہوم سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور صاحب ذوق فیوضات باطنی سے روحانی ترقی حاصل کرتے ہیں۔ بقول

بہار عارض گلگون دل و جان تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت رابہ بوار باب معنی را

(پھولوں جیسے رخسار والے کے دل و جاں کو بہار تازہ رکھتی ہے۔ ظاہر بیں لوگ ان گلوں کے رنگ اور حقیقت شناس ان کی خوشبو سے تازہ دم ہوتے ہیں۔)

لیکن افضال الٰہی سے اگر یہ رسالہ مترتب ہو گیا تو ناظرین کو اس کا علم بخوبی ہو جائے گا کہ ہمارے شہنشاہ عالم پناہ نے اپنے فقرا کے واسطے کیا شرائط و قیود مقرر فرمائے ہیں جن میں بعض جز و مسلک ہیں اور بعض عین مسلک اور جب فقرائے وارثی کے حقیقی مذاق سے ناظرین کو واقفیت ہو جائے گی۔ تو وہ وارثی نما حضرات کے دام

تزویر سے محفوظ رہیں گے اور کسی خود رو درویش کے مکر میں نہ آئیں گے۔ کیونکہ مشرب فقرائے وارثی کے معیار سے آگاہ ہونے کے بعد ارباب حق و اصحاب باطل کی شناخت آسان ہو جائے گی۔

لہٰذا بکمالِ ادب اخوان ملت سے یہ التماس ہے کہ اگر میری تحریر میں کوئی غلطی ہو اور ضرور ہوگی کیوں کہ انسان خطاونسیان سے مرکب ہے۔ تو براہ کرم صحت فرما کر مجھ کو مرہون منت فرمائیں گے۔

محمد ابراہیم شیدؔا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے زہے شان حق زہے قدرت

ہست وحدت عیاں دریں کثرت

من چہ گویم کمال قدرت او　　وحدہ لا الہ الا ھو

ہمچنیں نعت احمد ذی جاہ　　پس چہ گویم ورائے صلی اللہ

نور او نور خالق مطلق　　من رآنی بگفت رای الحق

(کیا ہی حق کی شان ہے اور کیا ہی اس کی قدرت ہے۔ اس کثرت سے اللہ کی وحدت عیاں ہے۔ اس کی قدرتِ کاملہ کے بارے میں میں کیا بیان کرسکتا ہوں۔ وہ ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ صاحبِ مرتبہ نبی پاک احمد مرسل ﷺ کی میں اس طرح تعریف کرتا ہوں کہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ کا نور خالق مطلق کا نور ہے۔ حضورؐ نے خود فرمایا ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے حق کو دیکھا۔)

امابعد۔ مصرع۔ ''باز بایاراں بگویم ماجرائے حسن دوست۔'' (پھر میں اپنے یارانِ طریقت سے اپنے دوست کے حسن کا ماجرا بیان کرتا ہوں۔) پھر وہی بیان جو درحقیقت حرز جان بلکہ تقویت ایمان ہے۔ شروع کرتا ہوں اور حضرت وارث پاک خلف الصدق صاحب لولاک اعظم اللہ ذکرہ کے وہ احکام جن کو تعمیم وتواتر کا مرتبہ حاصل ہے اور جن کا خطاب انہیں ارادت مندوں کی جانب ہے جو بغایت پیشوائے کامل تعلقات عالم سے دست بردار سبکدوش ہوکر حامل خرقہ وارثی یعنی تہبند پوش ہیں نگارش کرتا ہوں۔

لیکن یہ ارشادات بہ نسبت ان ہدایات کے جن کا ذکر جلد اول میں ہو چکا ہے اسی قدر ممتاز بھی ضرور ہوں گے جس قدر عام مریدین سے یہ حق شناس گروہ اگر اپنے ظاہری لباس کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو جلیل القدر اور مہتم بالشان ہے اور درحقیقت یہی صورتیں ہمارے شہنشاہ عالم پناہ کی زندہ یادگاریں ہیں۔ اور یہی اہل ارادت راسخ العقیدت ہیں جوننگ وعیش و آرام کو خیر باد کہہ کر راہ مطلوب میں برباد ہوئے۔ فرط محبت میں لذات موجودات کو فراموش کیا۔ اسباب تزئین سے دست بردار ہو کر تہبند پوش فقیر ہو گئے۔ بقول

دررہِ منزلِ لیلےٰ کہ خطرہاست بجان
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنون باشی

(لیلیٰ کی منزل کے راستے میں جان کیلئے خطرات ہیں۔ اس راہ میں پہلا قدم رکھنے کیلئے شرطِ اوّلیں مجنون بننا ہے۔)

مگر دشواری یہ ہے کہ وہ ارشادات نگارش کرنا چاہتا ہوں جو فقرا کے حق میں صادر ہوئے ہیں اس لئے یہ ہدایات مسائل فقر ادر نکات معنوی سے ضرور معمور ہوں گے۔ لہٰذا مسلک فقرائے وارثی کے ظاہری شرائط و قیود کا ذکر کروں گا۔ اور رموز فقر کی تصریح مجھ نااہل کے امکان سے باہر ہے کیونکہ یہ مسلمہ ہے کہ حقائق فقر کی تشریح کرنا صاحب کیف و وجدان کا کام ہے خصوصاً فقر بھی مشرب وارثی کا فقر جو عشق سے ماخوذ یا عین عشق ہے جس کا پہلا سبق شکر و قناعت، توکل و استقامت کے ساتھ دنیا اور اسباب دنیا سے استغنا اور استعانت غیر سے احتراز قطعی ہے اور یہ سبق اسی طالب صادق کو پڑھایا جاتا ہے جو طلب مطلوب میں اپنی ہستی کو نیست و نابود کرتا ہے۔ اور

پیشوائے برحق کے فیضان باطنی سے مستفیض ہوکر فقیر کا خطاب پاتا ہے۔ کیونکہ مقام فقر قرب الٰہی میں وہ مرتبہ علیا ہے جس کی فضیلت ارباب طریقت نے بکمال شرح و بسط ارقام فرمائی ہے چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمتہ نے طبقاۃ الکبریٰ میں شیخ احمد بن ابی الحسین رفاعی قدس سرہ کا یہ قول نقش فرمایا ہے۔''**الفقر آ ء اشرف الناس لان الفقر لباس المرسلين و جلباب الصالحين و تاج المتقين و غنيمة العارفين و منية المريدين و رضاء رب العالمين و كرامة لا هل ولا ية**''۔ کہ فقرا سب میں افضل ہیں کیونکہ فقر مرسلوں کی پوشاک، نیکو کاروں کی چادر، پرہیزگاروں کا تاج، عارفوں کی غنیمت مریدوں کی آرزو، رب العالمین کی خوشنودی اور اس کے اہل ولایت کی کرامت ہے۔ بقول حضرت حافظ شیرازعلیہ الرحمتہ:۔

بخواری منگر اے منعم ضعیفان وفقیران را

کہ صدر مسند عزت فقیر رہ نشین و ارد

(اے ضعیفوں اور فقیروں پر انعام کرنے والے تو ان کو ذلیل وخوار نہ سمجھ کہ یہ راہ نشین فقیر ہی دراصل صدرِ مسند نشین ہیں۔)

اور درحقیقت فقرائے باعظمت کی شان و رفعت کا اندازہ بھی ہمارے فہم و ادراک سے باہر ہے۔ بقول

بردر میکدہ رندان قلندر باشند　　　کہ ستانندو دہند افسر شاہنشاہے

خشت زیر سر و بر تارک نہ اختر پا　　　حال ایشان نگر و منصب والا جاہے

(میکدے کے دروازے پر رندان قلندر ہوتے ہیں۔ وہ شہنشاہی کا تاج لیتے اور دیتے ہیں۔ گویا وہ بادشاہ گر ہیں۔ وہ سر کے نیچے سرہانے کی جگہ اینٹ رکھ لیتے ہیں۔ اور

اپنے سر کی چوٹی پر نوستارے رکھتے ہیں۔ان کا حال دیکھ اور ان کا اونچا مرتبہ دیکھ۔)

اور احیاء العلوم میں امام غزالی علیہ الرحمتہ نے لکھا ہے کہ حضرت یحییٰ بن معاذ نے فرمایا ''حبک للفقراء من اخلاق المرسلین و ایثارک بمجا لستهم من علا مة الصالحین و فرارک من صحبتهم من علا مة المنافقین'' کہ فقرا کی محبت پیغمبروں کی عادت ہے۔اور ان کی ہم نشینی اختیار کرنا صلحا کی شناخت ہے اور ان کی صحبت سے بھاگنا منافقوں کی علامت ہے۔ بقول

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا — گو نشین اندر حضور اولیا

چوں شوی دو راز حضور اولیا — درحقیقت گشتہ دور از خدا

یک زمانہ صحبت باولیا — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

(جو شخص خدا کے قرب کا خواہشمند ہے اسے کہہ کہ اولیاء اللہ کی محفل میں بیٹھے۔اگر تو اولیاء کی محفل سے دور ہو جائے گا تو تو درحقیقت اللہ کے قرب سے دور ہو جائے گا۔ ایک لمحہ اولیاء اللہ کی محفل میں بیٹھنا سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔)

حتیٰ کہ حضرت سرور کائنات علیہ التحیۃ والصلوۃ نے ''الفقر فخری ''فرمایا جو فضیلت فقر کے لئے کافی دلیل اور فقرا کے مباہات کے واسطے بس ہے۔ بلکہ جناب باری عز اسمہ نے آیہ ''للفقرآء المهاجرین الذین اخرجوا من دیارهم و اموالهم یبتغون فضلا من الله و رضوانا و ینصرون الله و رسوله . اُولٰئک هم الصادقون O''((مذکورہ بالا مال) فقراء مہاجرین کیلئے بھی ہے جو اپنے گھروں اور اپنے اموال اور جائیدادوں سے باہر نکال دیئے گئے ہیں، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا و خوشنودی چاہتے ہیں اور (اپنے مال و وطن کی قربانی سے) اللہ

اوراس کے رسول ﷺ کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہی سچے مومن ہیں۔سورۃ الحشر:۸) میں فقر کی صفت کو ہجرت کی فضیلت سے مقدم فرمایا ہے حالانکہ مہاجرین خیرالقرون کا بہت بڑا مرتبہ ہے پھر دوسری آیت میں ارشاد ہوا ''**للفقرآء الذین احصروا فی سبیل اللّٰہ لا یستطیعون ضربا فی الارض**۔''((خیرات)ان فقراء کا بھی حق ہے جواللہ کی راہ میں (کسب معاش سے) روک دیئے گئے ہیں، وہ (امور دین میں ہمہ وقت مشغول رہنے کے باعث) زمین میں چل پھر بھی نہیں سکتے۔ سورۃ البقرۃ:۲۷۳)اس آیت میں مدحت فقر ابصراحت بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ امام غزالی علیہ الرحمتہ نے آیات مذکورہ کے تحت میں لکھا ہے''**ساق الکلام فی معرض المدح ثم قدم و صفھم بالفقر علی وصفھم بالھجرت والاحصار فیہ دلالت ظاھرۃ علی مدح الفقر**۔''(یہ کلام بیان کیا گیا ہے تعریف بیان کرنے کیلئے۔ پھران کا وصف فقر سب سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ان کے وصفِ ہجرت سے یعنی ان کے وصفِ فقر کو مقدم بیان کیا گیا ہے وصفِ ہجرت اوراحصار سے،بطور دلالتِ ظاہرہ فقر کی تعریف میں۔احیاء العلوم باب الفقر)

اور چونکہ قرب الٰہی میں فقر خاص اور ممتاز مقام ہے اس لئے مخصوص حضرات کو یہ شرف اختصاص ہمیشہ حاصل ہوا۔اوراسی لحاظ سے غلامان وارثی کے اس کثیر التعداد گروہ میں بھی تہبند پوش زیادہ نہیں ہوئے۔ ہر چند بادی النظر میں فقرائے وارثی کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ اول تو وہی فقراء کم نہیں ہیں جن کو سب نے دیکھا ہے اوران کے نام اور جائے قیام سے واقف ہیں۔علاوہ ان کے اکثر ایسے بھی فقرائے وارثی دیکھے گئے۔جن کی صورت سے پہلے ہم ناآشنا تھے لیکن دوران سیاحت

میں مختلف مقام پر حضور کی قدمبوسی کو وہ آئے اور اس وقت سے ہم لوگ ان سے واقف ہوئے۔ علیٰ ہذا اکثر حضور نے بھی اپنے ایسے فقیروں کا ذکر فرمایا ہے۔ جن کا نام بھی پہلے نہیں سنا تھا۔

در باراخوان ملت نے بعض فقرائے وارثی کو غیر آباد پہاڑوں پر بعض کو ویران جنگلوں میں مسکن گزیں پایا۔ اور چونکہ ان کا قیام اسی محدود مقام میں ہمیشہ رہا جو ان کے واسطے تجویز ہوا تھا۔ اور سیر وسیاحت کی قطعی ممانعت تھی۔ اس وجہ سے ان کی عام شہرت بھی نہیں ہوئی۔

بعض فقرائے وارثی روم وشام، عراق وحجاز کے مختلف حصص میں دیکھے گئے اور دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حضور نے دوران سیاحت میں اپنے فیضان باطنی سے ان کو مستفیض فرمایا تھا۔ حالانکہ جناب حضرت سے انکا ذکر بالتصریح نہیں سنا جس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ کہ مزاج ہمایوں کا انداز ہی یہ تھا کہ شہرت افزا واقعات کا کبھی اعادہ نہیں فرمایا اور وہ خدام بھی جو سفر میں ہمرکاب تھے واپس نہیں آئے جن سے مفصل حال معلوم ہوتا اس لئے فقرائے عرب وعجم کے نام ونشان سے پوری واقفیت ہم کو نہیں ہوئی لیکن اکثر برادران طریقت نے دیار مغرب میں وارثی درویش دیکھے۔ اور وہ معمر خداشناس نہایت خلوص ومحبت سے ملے اور اپنی سرگذشت بیان کی اور پیشوائے برحق کی عنایت کا ذکر کیا۔

غرض ہر چند فقرائے وارثی کی صحیح تعداد ہم نہیں بتا سکتے۔ لیکن وقتاً فوقتاً جن کو دیکھا ہے یا جن کا ذکر معتبر ذرائع سے سنا ہے ان کا شمار سینکڑوں بلکہ ہزاروں تک قیاس کیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

لیکن غلامان وارثی کی غیر معمولی کثرت کے لحاظ سے اگر کہا جائے کہ یہ تعداد بھی بہت کم تجویز ہوئی ہے تو ناموزوں نہیں۔ حالانکہ لفظ ہزاروں بڑے مجمع کے واسطے استعمال کی جاتی ہے اور دیکھا بھی گیا ہے کہ اکثر حضرات مشائخین کے جملہ مریدین کا شمار ہزار تک نہیں پہنچا لیکن اسی کے ساتھ یہ سوال کیا جائے کہ حضرت وارث پاک کے جملہ حلقہ بگوش کس قدر رہوں گے۔ تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جواب میں یہی کہنا پڑے گا کہ شمار کرنا تو محالات سے ہے بلکہ اس کثیر التعداد گروہ کا صحیح اندازہ بھی کرنا امکان سے باہر ہے کیونکہ عہد وارثی میں ہر روز یہ کرشمہ تعجب کی نظر سے دیکھا گیا ہے کہ شہر میں دیہات میں جس مقام پر حضور نے ایک شب کے لئے بھی قیام فرمایا۔ وہاں طالبین کا شوق ارادت میں جوق جوق آنا۔ اور حلقہ غلامی میں داخل ہونا ایک ضروری بات تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج شہر کی قید ہے، نہ قصبات کی تخصیص بلکہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں بارگاہ وارثی کے آستان بوس بکثرت موجود ہیں۔ حتےٰ کہ ممالک غیر کے متعدد باشندے حضرت وارث پاک کے ظل حمایت میں پناہ گزین ہوئے۔ لہٰذا غلامان وارثی کی حیرت انگیز اور غیر معمولی کثرت کے لحاظ سے فقرائے وارثی کا شمار اگر ہزاروں سے زیادہ بھی کیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

ہر چند یہ مسلمہ ہے کہ فقیر ہونا بہت مشکل ہے۔ اور فقیر ہر زمانہ میں کم ہوئے چنانچہ جناب حضرت نے اکثر یہ فرمایا ہے کہ ''فقیر کم اور مشائخین زیادہ ہوتے ہیں''۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''تصدیق ہزاروں میں ایک کو ہوتی ہے''۔ اس ارشاد میں اہل تصدیق کی قلت کو بامحاورہ الفاظ میں فرمایا ہے۔ کہ تصدیق ہزاروں میں ایک کو ہوتی ہے۔ اس لئے کہ تصدیق فقر کا ضمیمہ ہے اور چونکہ حصول مرتبۂ فقر عنایت ایزدی پر

موقوف ہے اس واسطے ضمیمہ فقر یعنی تصدیق بھی کسب وکوشش سے نہیں حاصل ہوتی۔ پس جس طرح خلق میں فقرا کی تعداد کم ہوتی ہے اسی طرح اہل تصدیق بھی زیادہ نہیں ہوتے۔ لیکن فیضان وارثی نے یہ کرشمہ دکھایا کہ ہر چند ایسا فقر جلیل القدر مرتبہ ہے مگر بکثرت حلقہ بگوش آپ کے طلب الٰہی میں تہبند پوش ہوئے اور پیشوائے کامل کی سرکار سے ان کو فقیر کا خطاب ملا۔

لیکن مجھے اپنی اس مجبوری کا بھی اظہار کر دینا ضروری ہے کہ جس طرح عدم واقفیت کی وجہ سے فقرائے وارثی کی صحیح تعداد بتانے سے قاصر رہا اسی طرح اپنی کم بضاعتی کے باعث اس کی بھی تصریح میرے امکان سے باہر ہے کہ جب غلامان وارثی کی طلب صادق ان کو ترک تعلقات پر مائل کرتی تھی، اور اپنے قدیم لباس سے بیزار ہو کر شوق تہبند میں حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمۃ کے ہم نوا ہو کر عرض کرتے تھے۔

دولت فقر خدایا بمن ارزانی دار
کیں کرامت سبب حشمت و تمکین منست

(اے اللہ مجھے فقر کی دولت عطا فرما کہ یہ میرے پختہ اور بارعب ہونے کا سبب ہوگی۔)

تو ان کی قلبی حالت کیا ہوتی تھی جس سے خیال میں یہ انقلاب عظیم پیدا ہوتا تھا۔ اور قلب مردہ پر جوش اور صاحب کیف ہو جاتا تھا۔ لہٰذا یہ باطنی معاملات اور قلبی واردات ہیں۔ ان کے اظہار کرنے کی جرأت وہی کر سکتا ہے جس کو روحانیت سے سروکار ہو۔ مجھ نا اہل و ظاہر بین کا تو یہی منصب ہے کہ طالبین فقر کی تہبند پوشی کے وقت بظاہر جو صورت رونما ہوتی تھی وہ نگارش کروں۔

چنانچہ دیکھا یہ گیا ہے کہ خرقہ وارثی کی طلب میں طالبین کا شوق مختلف عنوان

سے ظاہر ہوتا تھا۔ بعض خدمت اقدس میں بہزار عجز و نیاز خود استدعا کرتے تھے۔ بعض کسی خادم کی وساطت سے اپنی درخواست تہبند پوشی حضور وارثی میں پیش کراتے تھے۔ اور منظوری کا انتظار کرتے تھے لیکن بعض مضطرب الحال بیقرار ہوکر پروانہ وار جان نثاری کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

مگر حضور نے بعض طالبین راہ فقر کی استدعائی تہبند پوشی ان کے مناسب حال متصور نہیں بھی فرمائی ہے۔ اور انکے حق میں ارشاد ہوا کہ ''تہبند کی ضرورت نہیں تمکو خدا اسی لباس میں ملے گا''۔ اور بعض سے یہ فرمایا کہ ''خدا کا ملنا تہبند پر موقوف نہیں طلب پختہ ہوتو وہ ہر لباس میں ملتا ہے''۔ یا کسی امیدوار تہبند کو یہ بشارت دی کہ ''تہبند باندھنے کی حاجت نہیں تم حشر کے روز تہبند پوش اٹھو گے''۔ چنانچہ شیخ مظہر علی صاحب رئیس قصبۂ مسولی ضلع بارہ بنکی اور میر واحد علی صاحب ساکن قصبۂ سندیلہ کی استدعا پر یہی حکم ہوا تھا اور اکثر طالبین کی درخواست قبول تو ہوئی۔ اور تہبند بھی اسی وقت مل گیا۔ لیکن کسی مصلحت سے ان کو یہ حکم ہوا ''اسکو رکھ چھوڑو۔ جب وقت آئے گا تو باندھ لینا۔'' اور ان غلاموں نے ایسا ہی کیا کہ عرصہ تک اپنے قدیم لباس میں رہے۔ اور بالآخر وہی تہبند باندھ کر فقیر ہو گئے۔ اور بعض غلاموں کی یہ استدعا مستجاب بھی ہوئی اور انکو تہبند بھی مرحمت ہوا مگر شاید ان کی حالت کے لحاظ سے ان کی درخواست بعنوان مختلف منظور فرمائی ہے۔ مثلاً کسی طالب صادق کی استدعا کو فوراً بھی منظور فرمایا۔ اور اسی وقت اس کو لباس فقر یعنی تہبند مرحمت ہوا۔ اور کسی کی التجا پر یہ حکم ہوا کہ تین سال یا پانچ سال کے بعد آنا۔ اور جب مدت گذار کر وہ پھر ملتجی ہوا تو اس وقت اس کو تہبند عطا ہوا۔ بعض طالبین کو ایک مدت مقررہ کے واسطے اگر منتظر رکھا ہے تو ان

کیلئے کوئی ریاضت اور مجاہدہ بھی تجویز فرمایا ہے۔ جیسے ابوالحسن شاہ صاحب متوطن اٹاوہ جب تہبند کے خواستگار ہوئے تو ارشاد ہوا کہ پہلے بارہ سال تک روزہ رکھو اور بعض فقرا کی درخواست پر جو تعویق ہوئی تو ان کو سیر وسیاحت کا حکم ہوا کہ عراق کی سیر کر آؤ۔ کبھی سفر حجاز کے واسطے اشارہ ہوا۔ اور بعد تعمیل ارشاد جب انہوں نے پھر التجا کی تو اکثر دوسرے مجاہدہ کا حکم ہوا اور عرصہ تک وہ طالبین ریاضت شاقہ میں مشغول رہے اور مابعد خلعت فقر سے مستفیض ہوئے۔

لیکن بعض غلاموں کا لباس قدیم بغیر کسی ظاہری استدعا کے یوں بھی تبدیل ہوا ہے کہ ایک نظر عنایت نے ان کو ایسا محو اور سرشار کیا کہ کپڑے پھاڑ کر مثل ماہی بے آب مضطر وبیقرار ہو گئے اور حضور نے فوراً اپنا ملبوس خاص ان کو مرحمت فرمایا۔ مگر ایسے واقعات شاید کم ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی اس قلیل حاضری میں صرف دو مرتبہ یہ کرشمہ دیکھا۔ ایک ملا رضی الدین بغدادی جو معترض ہو کر حضور اقدس میں حاضر ہوئے اور ہنوز قریب نہیں پہنچے تھے کہ جناب والا نے ایک نظر عنایت سے مالا مال کر دیا کہ ملا صاحب خودی سے بےخود ہو گئے۔ کپڑے پھاڑ کر زار زار رونے لگے۔

اور حضور نے اسی حالت میں اپنا احرام پاک ان کو مرحمت فرمایا۔ اور دوسرا واقعہ دربھنگہ میں عرب شاہ صاحب کا دیکھا جس کی مختصر تصریح جلد اوّل میں نگارش کر چکا ہوں کہ ان کو بھی خرقہ وارثی اسی صورت سے نصیب ہوا۔ غرض غلامان وارثی کی تہبند پوشی گو مختلف عنوان سے ضرور ہوئی مگر مآل ایک تھا کہ قدیم اور آبائی وضع ولباس کو چھوڑ کر وہی تہبند باندھتے تھے جو سرکار وارثی سے مرحمت ہوتا تھا اور دیکھنے والے سمجھ جاتے کہ یہ تارک تعلقات اور خرقہ پوش فقیر ہو گئے۔

تصانیف حضرات عارفین کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسم خرقہ پوشی بھی مشاہیر صوفیہ کرام کی سنت قدیمہ ہے۔ ہر چند لباس مالوف کا تبدیل کرنا ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر درحقیقت اس پردہ میں متعدد راز مستتر ہیں۔ چنانچہ حضرت مخدوم شیخ شہاب الدین عمر سہروردی علیہ الرحمتہ عوارف المعارف میں تحریر فرماتے ہیں کہ جس طرح مطعومات اور مشروبات باعث حصول حظ ولذات ہیں اسی طرح ملبوسات سے بھی بلحاظ عادت نفس کو حلاوت ملتی ہے۔ بدیں وجہ ہادیان راہ طریقت نے طالب راہ فقر کیلئے ترک مالوف کو لازمی گردانا ہے اور تغیر عادات کو ضروری سمجھا ہے۔ کیونکہ تبدل لباس سے نفس طالب کا تصفیہ منظور ہوتا ہے۔ اسی سبب سے مخدومان سلف نے اسکو طریق مستحسن فرمایا ہے۔

علاوہ اسکے خرقہ شیخ ظل ولایت شیخ ہے۔ جو مرید کی کامیابی کے واسطے کافی وسیلہ ہے۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عطائی خرقہ اظہار تصرف شیخ ہے۔ اور تصرفِ ظاہری تصرفِ باطنی کی علامت ہے۔ معہذا خرقہ نصیب ہونا مقبولیت شیخ کا بھی ثبوت ہے اور مقبولیت حق تعالیٰ ہے۔

چونکہ ذات پیر را کردی قبول
ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول

(جب تو نے پیر کی ذات کو قبول کر لیا تو اس کی ذات میں اللہ بھی آ گیا اور رسول بھی آ گیا۔ بصورتِ فنا فی الشیخ، فنا الرسول، فنا فی اللہ)

اس لیے خرقہ پوش ہونا عین دلیل اس کی ہے کہ اللہ جل جلالہ نے مقبول فرمایا۔ اور خرقہ پوشی مرید صادق کی ارادت واثق کی بھی نشانی ہے اور خرقہ پوشی میں بڑا

فائدہ یہ ہے کہ طالب ''مَن تشبہ بقوم فھم۔ '' کا مصداق ہوتا ہے جواس کے فخر و مباہات کے واسطے کافی ہے۔

پھر حضرت مخدوم نے اقسام خرقہ کی تصریح فرمائی ہے جسکو مصباح الہدایت ترجمۂ عوارف المعارف سے نقل کرتا ہوں۔ وھو ھذا ''خرقہ دونوع است۔ خرقہ ارادت وخرقہ تبرک۔ خرقہ ارادت آنست کہ چون شیخ بنفوذ نور بصیرت وحسن فراست در باطن احوال مرید نگرد۔ ودر آثار حسن سابقہ تفرس کیذ وصدق ارادت اودر طلب حق مشاہدہ نماید ویرا خرقہ پوشاندتا مبشراو گردد''۔ (اوروہ یہ ہے کہ خرقہ دوقسم کا ہے۔ایک خرقہ ارادت اور دوسرا خرقۂ تبرک۔خرقۂ ارادت وہ ہے کہ شیخ اپنے نورِ بصیرت اور حسن فراست کی روشنی میں مرید کے باطنی احوال کی نگرانی کرتا ہے۔ اوراس کے صدق ارادت اور طلب حق کے پیش نظر اسے مشاہدۂ حق کراتا،خرقہ پہناتا اور بشارت دیتا ہے۔) اور قسم ثانی یعنی خرقہ تبرک کی تعریف یہ لکھی ہے کہ ''واما خرقہ تبرک آنست کہ کسے بر سبیل حسن الظن و بہ نیتِ تبرک خرقہ مشائخ آنرا طلب دارد۔'' (اور خرقۂ تبرک وہ ہے کہ طالب بطور حسن ظن،تبرک کی نیت سے خرقۂ مشائخ طلب کرے۔)

حضرت مخدوم سہروردی علیہ الرحمۃ کی اس تشریح سے جس طرح خرقہ کے مفاد واقسام سے واقفیت ہوئی اسی طرح یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہمارے سرکار عالم پناہ نے تقسیم خرقہ میں حضرات صوفیہ کرام کی سنت جاریہ کا پورا لحاظ فرمایا ہے۔ کیونکہ حضرت مخدوم نے خرقہ تقسیم ثانی کی تعریف یہی لکھی ہے کہ اس مرید کو دیا جاتا ہے جو ''بر سبیل حسن الظن و بہ نیتِ تبرک بخرقۂ مشائخ آنرا طلب دارد''۔ (طالب بطور حسن ظن،تبرک کی نیت سے خرقۂ مشائخ طلب کرے۔) چنانچہ حسن ظن محبت کی فرع ہے

اور ملبوس مرشد کو تبرک قیاس کرنا یہ بھی بغیر محبت کے ناممکن ہے اور غلامان وارثی کا مشرب عین محبت ہے اور فخر کیساتھ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضور کا یہ فیض عام ہے اور آپ کے جملہ حلقہ بگوش بقدر حیثیت واستعداد اثر محبت سے ضرور بہرہ ور ہیں۔لہٰذا یہ کہنا پڑتا ہے کہ حسن الظن کی قید اور نیت تبرک کی شرط کا تو کیا ذکر ہے۔ غلامان وارثی اپنے یوسف جمال پیشوا کے ملبوس اطہر کو جان کے برابر عزیز سمجھتے تھے۔اور شاید اسی سبب سے حضور نے اپنا ملبوس قریب قریب جملہ مریدین کو تقسیم فرمایا۔ جو بطور سرمایہ فخر وناز کے پاس محفوظ ہے۔

چنانچہ دستور یہ تھا کہ جس غلام نے تہبند تبدیل کرایا۔حضور نے اپنے احرام پاک کا نصف حصہ اس کو ضرور مرحمت فرمایا۔اور بعض کو پورا تہبند بھی عنایت ہوا ہے۔ علاوہ اس کے روزمرہ زائرین کو ملبوس اقدس کا چھوٹا یا بڑا ٹکڑا عطا ہوا کرتا تھا۔خصوصاً ایام میلہ کا تک میں تو انعام عام تھا۔غرض جس طرح عموماً حلقہ بگوش دلدادہ جمال وارثی تھے اسی طرح حضور نے اپنا ملبوس اپنے مریدین کو عام طور پر تقسیم فرمایا۔جس کو خرقۂ تبرک کے نام سے موصوف کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

علیٰ ہذا خرقہ ارادت بھی بارگاہ وارثی میں شرائط مقررہ کے مطابق تقسیم ہوا کہ طالب کی طلب صادق وارادتِ واثق پر ضرور توجہ فرمائی۔ جیسا اوپر مذکور ہوا کہ طالبین کی حالت کے لحاظ سے حضور نے بعنوان مختلف تہبند پوشی کا حکم دیا ہے بلکہ خرقۂ مفوضہ صورتاً بھی جداگانہ ہوتا تھا۔ چنانچہ دیکھا یہ گیا ہے کہ بعض فقرا کو غیر مستعمل تہبند مرحمت ہوا ہے بعض کو احرام خاص اتار کر تفویض فرمایا۔بعض کو تہبند کے ساتھ لنگوٹ بھی عنایت ہوا۔ وہ بھی اسی طرح کہ بعض کو غیر مستعمل اور بعض کو اپنا لنگوٹ کھول کر

دیدیا۔ کسی کوتہبند اور لنگوٹ کے ہمراہ فولادی چھلے بھی عطا ہوئے۔ کیونکہ آپ کے زیب جسم تہبند اور لنگوٹ اور پاؤں میں فولادی چھلے رہتے تھے۔ اوراسی مجموعہ کوہم خرقۂ وارثی سمجھتے ہیں جوعموماً فقرا کی وضع میں داخل ہوا۔

اور یہ تو قریب قریب سب کومعلوم ہے کہ حضور کا احرام ہمیشہ رنگین اور عموماً سوتی کپڑے کا مگر عرض میں ڈیڑھ گز اور طول میں ۶ گز ہوتا تھا۔ لیکن ایام سرما میں اگر کسی ارادتمند نے اونی کپڑا کا تہبند پیش کیا تو حضور نے اسکوبھی قبول فرمایا ہے جس کے استعمال کا یہ طریقہ تھا کہ نصف حصہ سے ستر پوشی اور نصف حصہ بطور چادر نہایت سادگی سے اسطرح زیب دوش فرماتے تھے کہ فرق انور بالکل کھلا رہتا تھا صرف حالت نماز میں یہی حصہ تہبند یا دوسری چادر سر پہ اوڑھی جاتی تھی۔ ورنہ آپ کے خصوصیات میں ہے کہ سردی کی احتیاط یا تمازت آفتاب سے حفاظت کے لئے کبھی آپ نے یہ اہتمام نہیں فرمایا کہ گوشۂ تہبند یا دوسرے کپڑے سے فرق انورکو چھپایا ہو بلکہ ہمیشہ سر انور بےنقاب رہا۔ جومحرم کے لئے خاص شرط ہے۔

لیکن بعض معمر حضرات سے یہ بھی سنا ہے کہ ابتدا میں اسی عرض وطول کا احرام اکثر دوحصوں میں علیحدہ علیحدہ بھی منقسم ہوا ہے جس کے ایک ٹکڑے کوحضور نے تہبند بنایا اور ایک ٹکڑے کوبطور چادر کے استعمال فرمایا۔

مگراس کاعلم نہیں کہ یہ وضع لباس کب سے پسند فرمائی۔ البتہ یہ مسلمہ ہے کہ عنفوان شباب میں جب حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے فائز المرام ہوکرآپ ہندوستان میں تشریف لائے تو آپ کا یہی لباس تھا جس کی صورت کلیۂ احرام کی ہے۔ اور پھر کبھی خاص ضرورت کے وقت بھی کسی اور وضع کا لباس کسی حصۂ جسم کے

لئے پسند نہیں فرمایا۔

لیکن سفر حجاز میں کس موقع پر اور کس وجہ سے حضور نے یہ لباس اختیار فرمایا۔ اس میں مختلف اقوال ہیں جن کا اعادہ بخوف طوالت نہیں کرتا ہوں اور شاید اسی قدر عرض کرنا بھی ہوگا کہ جناب حضرت تقریباً پندرہ سال کی عمر میں اول مرتبہ جب عازم سفر حجاز ہوئے تو اس وقت لباس آپ کا کرتہ اور زیر جامہ۔ یا بعض کا قول ہے کہ کرتہ اور تہبند تھا اور جب واپس تشریف لائے تو آپ کو احرام پوش دیکھا۔ اس لئے ہم اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ تغیر لباس اسی سفر میں ہوا۔

مگر وجوہات اور واقعات کی تصحیح کا معیار تو اسی پر موقوف ہے کہ حضور کے ملفوظات سے استدلال کیا جائے۔ اور میرے حافظہ میں کوئی ارشاد جناب حضرت کا اس بارہ میں صریح اور واضح نہیں ہے اور جب اس کا ذکر آیا تو مجمل طور پر۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ''جب ہم نے احرام باندھا تو اپنے کپڑے خیرات کر دیئے''۔ اس ارشاد کا مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب حج بیت اللہ کے لئے آپ نے احرام باندھا تو شاید بعد فراغ ارکان مفروضہ بھی اس وضع میں تبدل ناپسند فرمایا۔ اور وہی احرام ہمیشہ کے واسطے آپ کا مستقل لباس ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کا حج بھی خاص تھا جس کے ارکان بھی خصوصیت سے خالی نہ تھے۔ نہ بصورت عوام در و دیوار کے طواف کے واسطے گئے تھے۔ نہ ظاہری ارکان مثل عام حجاج کے ادا کئے چنانچہ جیسا غیر معمولی آپ کا حج تھا۔ ویسا ہی اہم اور غیر مشروط احرام آپ نے باندھا۔ صاحب خانہ کے شوق دیدار نے بے قرار کیا تھا۔ لہٰذا جس کا دیکھنا مقصود تھا اس کو دیکھا بقول مولانا علیہ الرحمۃ

حج زیارت کردن خانہ بود　　　حج رب البیت مردانہ بود

حقیقت کعبہ منکشف ہوئی۔ اور حضرت رب البیت سے ایسا سروکار ہوا کہ دنیا اور تعلقات دنیا سے دست بردار۔ ملفوفات وملبوسات سے بیزار ہو کر تجلیات انوار الٰہی کی دید میں محو مستغرق ہوگئے۔ اور اسی لباس کو ہمیشہ کے لئے اختیار کیا جو معراج معرفت میں زیب جسم تھا۔ کیونکہ یہی وہ لباس ہے جو باوجود اس سادگی کے صوری اور معنوی خوبیوں سے مملو ہے جس کی خصوصیت اور عظمت اسی سے ظاہر ہے کہ حضرت مالک الملک کے سالانہ دربار کی یہی مخصوص وردی ہے۔

نیز لباس زبان حال سے صاحب لباس کے وفور شوق اور صفاءِ باطنی کی شہادت دیتا ہے۔ چنانچہ امام شعرانی علیہ الرحمۃ کا قول ہے کہ "**وعری البدن للفقیر اشارۃ للتجرید بالباطن من الکون** "یعنی فقیر کا برہنہ جسم رہنا اشارہ ہے کہ باطن میں ہستی سے تجرید ہے۔ (الیواقیت والجواہر)

لہٰذا احرام میں علی الدوام رہنا اور اس لباس کو مستقل طور پر اختیار کرنا۔ اور اس کے شرائط وقیود کو نہ کمال احتیاط حد اتمام تک پہنچانا انھیں عارفین باتمکین کے لئے مخصوص ہے جو صاحب مقامات علیا ہوتے ہیں۔ اور عشق الٰہی میں اپنی ہستی کو ہستی شاھد مطلق کے سامنے نیست اور نابود کرتے ہیں۔ چنانچہ امام شعرانی علیہ الرحمۃ نے عاشق ربانی ابوحمزہ خراسانی کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ بھی احرام پوش تھے۔ اور اپنے عہد کے درویش باتمکین اور حضرت جنید علیہ الرحمۃ کے ہمنشین اور ابوسعید الخراز علیہ الرحمۃ کے ہم سفر وہم صحبت تھے اور علاوہ مدارج باطنی کے آپ علوم ظاہری کے بھی عالم متبحر اور صاحب فتویٰ تھے کہ امام احمد حنبل علیہ الرحمۃ کا معمول تھا کہ جب ان کے

سامنے کوئی مسئلہ تصوف کا پیش ہوتا تھا تو ان سے کہتے تھے کہ صوفی صاحب آپ اس میں کیا فرماتے ہیں۔ بلکہ حضرت ابوحمزہ نے اپنی احرام پوشی کوخود بہ تصریح بیان فرمایا ہے جس کوامام شعرانی نے طبقات الکبریٰ میں لکھا ہے"وکان یقول بقیت محرما فی عبادة اسافر الف فرسخ کل سنة کلما تحلات احرمت جدید اسنین عدیدة "یعنی میں کمل میں برابراحرام باندھے رہا۔ ہرسال ایک ہزار فرسخ سفر کرتا تھا۔ اور برسوں دستور رہا کہ احرام سے باہر آیا تو جدید احرام باندھ لیا۔

فردفرید صاحب تجرید ابوحمزہ خراسانی علیہ الرحمتہ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ آپ ہمیشہ احرام پوش رہے اور یہ بھی بظاہر ہوگیا کہ ایسے محرم کے لئے سفر کرنا بھی لازمی ہوتا ہے جیسا کہ ہمارے سرکار عالم پناہ نے تعلقات عالم کے ترک وانقطاع کو کمال کے درجہ تک پہنچایا کہ نہ رہنے کو مکان نہ آرام وعافیت کا سامان ہمیشہ سفر میں ہی رہے۔ اور دعوت کا کھانا نوش فرمایا۔ چنانچہ اکثر آپ فرماتے تھے کہ 'ہم مسافر ہیں۔''

بلکہ معتبر روایات سے بھی ثابت ہے کہ سفر کرنا فقیر کے واسطے شرط لازمی ہے۔ چنانچہ صحیحین میں عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ 'کن فی الدنیا کانک غریب عابر سبیل و عد لنفسک فی اصحاب القبور۔'' کہ دنیا میں مسافروں کے طرح یاراہ گیروں کی مانند بے تعلق رہے۔ اور اپنے کومردہ سمجھے۔ شاید اسی اصول سے حضور نے فرمایا کہ 'ہم مسافر ہیں۔'' اور دکھا بھی دیا کہ ہمیشہ سفر کیا۔ اور مسافروں کے مانند دنیا اور اسباب دنیا سے بے تعلق رہے۔ اور''وعد نفسک فی اصحاب القبور '' کی مناسبت سے لباس بھی ایسا

اختیار کیا جو کفن سے مشابہ ہے۔ اور عاشقین اور موحدین کے واسطے جو زیادہ موزوں ہے کیوں کہ ان کی حالت باطنی کے لحاظ سے یہی لباس ان کے لئے مزیب معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مشرب عشق کی آخری منزل ذات مطلوب میں فنا ہو جانا ہے۔ چنانچہ ''موتوا قبل ان تموتوا ''اسی کی دلیل ہے کہ مرنے سے پہلے مرجاؤ۔ اور کمال توحید بھی یہی ہے۔ جیسا کہ مولانا علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے۔

چیست توحید خدا آموختن   خویشتن را پیش واحد سوختن
ہستیت در ہست ہستی نواز   ہچو مس در کیمیا اندر گداز
تو مباش اصلاً کمال اینست و بس   تو در وگم شووصال اینست و بس
تو در و گم شو کہ توحید این بود   گم شدن گم کن کہ تفرید این بود

(اللہ کی توحید کیا ہے؟ یہ بات سیکھنی ہے کہ اپنے آپ کو ایک اللہ کے سامنے جلا دینا یعنی مٹا دینا فنا کر دینا۔ اپنی ہستی کو ہستی ہونے میں مٹا دینا۔ تانبے کی طرح کیمیا میں اپنے آپ کو پگھلا دینا۔ صحیح طور پر تو باقی نہ رہ۔ یہی کمال ہے تو خدا کی ہستی میں اپنے آپ کو گم کر دے۔ وصال کی حقیقت یہی ہے تو اس میں گم ہو جا۔ توحید یہی ہے۔ گم ہو جانا۔ کہ گم ہو جانا ہی تفرید ہے۔)

لہٰذا جبکہ رہروان وادیٔ عشق و توحید کی زندگی موت کی مرادف ہے تو انکا لباس بھی ہمشکل کفن ہونا لازمی ہے۔ بلکہ اکثر حضور نے تہبند کی حقیقت سے اپنے فقیروں کو آگاہ کیا ہے۔ اور بہ تصریح فرمایا کہ ''یہ کفن ہے۔'' اور کبھی اس مفہوم کو یوں سمجھایا ہے کہ ''جس طرح مردے کو اسباب دنیا سے تعلق نہیں رہتا اسی طرح فقیر کو چاہئے کہ دنیا اور اسباب دنیا سے سروکار نہ رکھے۔'' اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''فقیر مر

جائے تو اسی تہبند میں لپیٹ کر دفن کر دو یہی اسکا کفن ہے۔'' اور اکثر اس حکم کو اور زیادہ وضاحت سے یوں فرمایا ہے کہ'' فقیر کا جہاں انتقال ہو وہیں دفن کر دے۔ اور مجبوری سے دوسری جگہ دفن کرنا ہو تو پلنگ پر نہ لے جائے اور کفن میں تہبند دے کر دفن کر دے۔

یہ ارشادات بظاہر فقرائے تہبند پوش کی آسانی کے واسطے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ متوکل فقیروں کو تعلیم فرمائی کہ مطمئن رہو تمہارا تہبند ہی تمہارے کفن کے لئے کافی ہے۔ لیکن نظر غائر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ ہمارے حضور نے نہایت جامع اور اصول کے مطابق یہ ہدایت فرمائی ہے بلکہ آپ کے جملہ ملفوظات کا مفہوم اور ہدایات کا ماحصل احکام الٰہی کے مطابق اور مستند احادیث کے موافق ہوتا ہے چنانچہ اس مسئلہ میں بھی حضور نے اپنے جد نامدار کی کامل اتباع فرمائی ہے کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک محرم صحابی کے حق میں یہی حکم دیا تھا۔ جس کو مولانا جلال الدین سیوطی علیہ الرحمتہ نے'' **بدور السافرة فی امور الآخرة**'' میں لکھا ہے کہ شیخین نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص احرام باندھے تھا اس کو اونٹنی نے ٹکر ماری جس کے صدمے سے وہ مر گیا۔ رسول خدا صلعم نے فرمایا کہ اسکو مہندی کے پانی سے غسل دے کر اسی کے کپڑوں کا کفن دو۔ اور خوشبو نہ لگاؤ۔ اور سر نہ ڈھانکو۔ قیامت کے روز یہ لبیک کہتا ہوا اٹھے گا۔ بقول

بہ محشر کشتہ شمشیر ناز لالہ رخساران
چو گل خونین کفن از عرصۂ میدان برون آید

(روزِ محشر لالہ رخساروں کے ناز کی تلوار سے قتل ہونے والے، پھولوں کی طرح خون

والا کفن پہنے ہوئے، اپنی قبروں سے باہر نکلیں گے۔)

اس حدیث سے ظاہر ہو گیا کہ موتی کا ملبوس اس کا کفن ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصلحت وارثی نے علاوہ مشروع ہونے کے یہ حکم اس لحاظ سے صادر فرمایا ہو کہ ہمارے غلام ہماری آبائی سنت سے مستفیض ہوں۔ کیونکہ حضرت خاتون جنت نے سفر آخرت کے لئے اپنے ملبوس اطہر ہی کو پسند فرمایا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق دہلوی علیہ الرحمتہ نے "جذب القلوب الی دیار المحبوب" میں لکھا ہے کہ "روزے فاطمہؓ زہرہ صبح کرد در غائت فرح وسرور۔ جاریہ را فرمود کہ تا آبے برائے غسل دے کر تیار کرد۔ پس غسل در غایت مبالغہٗ واحتیاط برآورد۔ وجامہاے پاکیزہ پوشید درمیان خانہ فرشے افگند و مستقبل قبلہ بخواب رفت۔ ودست شریف خود راز زیر خسارۂ مبارک خود نہاد و گفت اکنوں من میرم و غسل گردم و جامۂ پاک پوشیدہ ہیچ یکے مرا بعد مردن کشف نکند۔ وہم دریں جا بوضع کہ افتادہ ام دفن کنند۔ وچوں علی مرتضےؓ دروں خانہ آمد صورت حال بوے باز نمود۔ دید کہ روح پاکش بہ اعلےٰ علیین رسیدہ بود فرمود کہ واللہ ہیچ کس اور انکشاید۔ بہ ہمان غسل سابق و جامہ کہ پوشیدہ بود دفن کرد۔" (ایک دن فاطمہ الزھرہ سلام اللہ علیہا نے انتہائی خوشی کے عالم میں صبح کی۔ آپ نے اپنی لونڈی کو حکم دیا کہ آپ کیلئے غسل کا پانی تیار کرے۔ پس آپ نے انتہائی احتیاط کے ساتھ غسل کیا۔ اور پاکیزہ کپڑے پہنے۔ اور اپنے گھر کے صحن میں فرش بچھایا۔ اور قبلہ رُو ہو کر سو گئیں۔ اور اپنے ہاتھ مبارک کو اپنے مبارک رخسار کے نیچے رکھ دیا۔ اور فرمایا کہ اب میں جا رہی ہوں اور میں نے غسل کیا اور پاک کپڑے پہنے۔ میرے مرنے کے بعد کوئی بھی میرا لباس نہ کھولے۔ اور اس جگہ جہاں میں لیٹی ہوں مجھے دفن کرنا۔ جب حضرت علیؓ گھر

کے اندر آئے تو صورتِ حال آپ کے سامنے بیان کی گئی۔آپ نے دیکھا کہ آپ کی پاک روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔آپ نے حکم دیا کہ خدا کی قسم کوئی آدمی آپ کو نہ کھولے۔اسی پہلے غسل کے ساتھ اور جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، انہیں مین دفن کر دیا گیا۔)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصیت فرمائی کہ اسی جگہ اور اسی لباس میں مجھ کو دفن کرنا۔اور امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے اسی طرح دفن کیا۔لہٰذا حضور وارث پاک کے اس ارشاد کی اور زیادہ وضاحت ہوگئی کہ ''فقیر جس جگہ مر جائے اس کی تہبند میں لپیٹ کر وہیں دفن کر دو۔'' یہ حکم آپ کا بالکل سنت جناب خاتون جنتؑ کے مطابق اور روایت مذکورہ کا صحیح خلاصہ ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''اگر دوسرا تہبند ممکن ہو اس کا کفن دو'' پہلا فرمان تو بطور کلیہ کے ہے کہ فقیر جو تہبند باندھے ہو وہ بھی اس کے کفن کے واسطے کافی ہے۔اور اس دوسرے ارشاد میں یہ سمجھا دیا کہ اگر دوسرا تہبند کفن کے واسطے ممکن ہو تو مضائقہ نہیں اس کو تبدیل کر سکتے ہو۔مگر فقیر کے لئے یہ لازمی گردانا کہ اس کا کفن تہبند اور لنگوٹ کے ساتھ مشروط رہے۔

چنانچہ از روئے شریعت بھی شہدا کو بجائے کفن کے ان کے ملبوس ہی میں دفن کرتے ہیں۔اور عشاق تو حقیقی شہید ہیں۔کیونکہ اصطلاح میں شہید اس کو کہتے ہیں جو راہ خدا میں دشمنان دین کے ہاتھ سے مارا جائے اور عشاق ادائے دوست کے مقتول ہیں۔بقول

غازی زپے شہادت اندرتگ و پوست
غافل کہ شہید عشق فاضل تراز وست
در روز قیامت این بآن کے ماند
این کشتہ دشمن است و آن کشتہ دوست

(غازی شہادت کیلئے کوشش میں ہے۔وہ بے خبر ہے کہ شہیدِ عشق اس سے زیادہ فضیلت رکھنے والا ہے۔قیامت کے دن یہ اُس کی طرح کب ہوگا۔یہ دشمن کا قتل کیا ہوا ہےاور وہ دوست کے دستِ ناز سے فنا ہونے والا ہے۔)

بلکہ دشمن کے ہاتھ سے قتل ہونا جہاد اصغر ہے۔اور محبت الٰہی میں مرنا جہاد اکبر ہے۔جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ایک غزوہ سے واپسی کے وقت خود حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔''**رجعنا من الجهاد الاصغر الى جهاد الاكبر**۔''(ہم چھوٹے جہاد سے واپس آئے بڑے جہاد کی طرف۔)اور صیغہ جمع متکلم کا ارشاد ہوا جس سے عمومیت پائی جاتی ہے۔لہٰذا فقرا کو ان کے ملبوس میں دفن کرنا شہدا کی تدفین کے مطابق ہے۔

بلکہ یہ حکم تو ایسا قطعی ہے کہ تنقید کی حاجت نہیں۔کیونکہ وہ خوش نصیب فقرائے وارثی جو پیشوائے برحق کے شمع جمال جہاں آرا پر نثار ہوکر راہی ملک بقا ہوئے ان کے کفن کے واسطے خود حضور نے تہبند مرحمت فرمایا۔چنانچہ علاوہ شنیدہ واقعات کے بچشم خود دیکھا ہے۔کہ خاص دیوئی شریف میں تین مرتبہ جناب حضرت نے کفن کے لئے تہبند عنایت کیا۔پہلے بدنام شاہ صاحب کا جب انتقال ہوا۔آپ نے تہبند اور لنگوٹ دیا۔اور فرمایا کہ''یہی ان کا کفن ہے۔''اور بہ تاکید ارشاد ہوا کہ''اسی جگہ دفن کر

دو جس مقام پر انتقال ہوا ہے۔'' اور حسب الحکم ایسا ہی کیا گیا کہ موضع کھیولی میں مکان کے اسی حصہ میں ان کو دفن کیا جس جگہ ان کا انتقال ہوا تھا۔ پھر فقیر بخش حضور کے بہشتی نے جو آخر عمر میں تہبند پوش ہو گئے تھے۔ انتقال کیا اور جناب والا کی ہدایت کے مطابق اسی تہبند میں ان کی تلقین ہوئی جو بارگاہ وارثی سے مرحمت ہوا۔ علیٰ ہذا حاجی بھورے شاہ صاحب کا در دولت پر شب کو انتقال ہوا۔ صبح کو جب ان کی تجہیز و تکفین کی اجازت چاہی تو جناب حضرت نے وہی حکم دیا جس پر ہمیشہ سے عمل درآمد تھا اور ان کے کفن کیلئے تہبند مرحمت ہوا۔

غرض فقرائے وارثی کے کفن کے لئے سرکار عالم پناہ نے ہمیشہ تہبند عنایت کیا۔ اور اب تو اس مسئلہ کے لئے کسی تصریح کی بھی ضرورت اس واسطے نہیں رہی کہ خود ہمارے وارث پاک نے بھی آخری لباس وہی پسند فرمایا جو اوائل عمر اور سیاحت حجاز میں اختیار کیا تھا۔ اور اتفاق سے اس آخری لباس کا رنگ بھی وہی تھا جو آپ کے احرام کے لئے مخصوص ہے۔ یعنی زردی مائل بادامی۔

کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ آپ کا تہبند رنگین ہونا تو لازمی تھا۔ مگر ہمیشہ سے باعتبار دیگر الوان کے زرد رنگ یا زردی مائل جس میں بادامی بھی شامل ہے حضور کو زیادہ پسند تھا۔ لیکن سیاہ و سفید و سرخ رنگ کسی وجہ سے مرغوب نہ تھے۔ بلکہ یہ رنگ اس قدر متروک تھے کہ عموماً آپ کی تہبند کے واسطے ممنوع سمجھے جاتے تھے اور برخلاف ان کے زرد رنگ مخصوص ہو گیا تھا جو عشاق کا رنگ ہے۔

ہم اپنی محدود واقفیت کے لحاظ سے یہی خیال کر سکتے ہیں کہ حضور نے تہبند ملون تو شاید اسی وجہ سے پسند فرمایا ہوگا کہ دیگر حضرات عارفین نے بھی اکثر لباس

رنگین استعمال کیا ہے۔ کیونکہ لباس کو صاف کرنا محافظت اوقات میں خلل انداز۔ اور تفریغ خاطر کے منافی ہے۔ اس لئے جامۂ رنگین بہتر اور مستحسنات صوفیہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اور زرد رنگ کو مخصوص طور پر جو حضور نے اختیار فرمایا تو بظاہر اس کا سبب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ زرد رنگ آسان اور بے تکلف ہے۔ اس واسطے کہ آپ کے مزاج ہمایوں کی سادگی نے جس کو تکلفات سے قطعی احتراز تھا۔ اس رنگ کو آسانی کے لحاظ سے پسند کیا ہوگا۔

لیکن نہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے وضع لباس اور اس کے رنگ میں بھی حقانیت و روحانیت کی خاص شان ہے۔ لہٰذا زرد رنگ میں وہ خصوصیت ہے کہ جس کی حقیقت کو ملحوظ فرما کر آپ نے پسند کیا ہوگا۔ جس کو تھوڑی تصریح کے ساتھ نگارش کرتا ہوں۔

چنانچہ حضرات عارفین نے یہ تصفیہ فرمایا ہے کہ اہل طریقت کے لباس کا رنگ ان کے واردات ہی کے مناسب حال ہوتا ہے جس کو شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمتہ نے عوارف المعارف میں بوضاحت لکھا ہے۔ بدین وجہ ہمارے ہادیان طریقت نے اپنی اپنی حالت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف الوان اختیار فرمائے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے حضور نے بھی اپنے لباس کے لئے زرد رنگ پسند فرمایا۔ کیونکہ یہ مسلمہ ہے کہ آپ کا مسلک عشق ہے اور عشاق کی معراج فناء کامل ہے کہ عاشق اپنے وجود کو مٹا کر وجود شاہد حقیقی میں فنا ہو جائے اور اہل فنا کو خاک سے مناسبت خاص ہے۔ جس کا حقیقی رنگ زرد ہے اسی وجہ سے زرد رنگ عاشقوں کو طبعاً مرغوب ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمارے سرکار عالم پناہ نے جملہ منازل عشقیہ اس خوبی اور اہتمام کے ساتھ

طے فرمائے کہ ان کے لوازمات کو بھی نہیں چھوڑا حتےٰ کہ اپنے لباس کے لئے بھی زردرنگ پسند کیا جس کو اہل فنا سے خاص مناسبت ہے۔

علاوہ اس کے حضور نے جو مٹی کے حقیقی رنگ کو دیگر الوان سے زیادہ پسند فرمایا تو اس کو اگر خون کا جوش اور خاندانی اثر کہا جائے تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ کے جد نامدار کو سرکار رسالت سے ابوتراب کا خطاب مرحمت ہوا ہے۔ اور منقول ہے کہ حضرت شیر خدا علی مرتضےٰ علیہ التحیۃ والثنا کو باعتبار دیگر القاب کے یہ خطاب زیادہ پسند تھا لہٰذا وارث ارث مرتضوی نے جد نامدار کی اس سنت کو ادا کیا۔ اور اپنے لباس کے واسطے مٹی کے حقیقی رنگ کو پسند فرمایا۔

قطع نظر اس کے اگر اصولاً بھی دیکھا جائے اور روایات صحیحہ سے استدلال کریں تو بھی زرد رنگ کی فضیلت کما حقہ ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ منقول ہے کہ خود جناب سرور عالم صلی اللہ وآلہ وسلم کو زرد رنگ پسند تھا۔ چنانچہ صاحب تیسیر االقاری شرح صحیح بخاری نے جواز الوان کی بحث میں زرد رنگ کی نسبت لکھا ہے کہ ”عبداللہ ابن عباس گفتہ کہ این رنگ بہترین رنگہا ست آنحضرت دوست میداشت آنرا کہ رنگ می کرد۔“ (حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے کہا کہ یہ رنگ سب رنگوں سے بہتر ہے۔ آنحضرتؐ اس کو پسند فرماتے تھے۔)

علیٰ ہذا صحیح بخاری، کتاب اللباس میں منقول ہے کہ عبید بن جریج نے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ چار باتیں آپ ایسی کرتے ہیں جو دیگر صحابہ نہیں کرتے۔ ازاں جملہ ایک بات یہ ہے کہ ”ورایتک تصبغ بالصفرہ“ آپ زرد رنگ استعمال کرتے ہیں ”فقال لہ عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ

تعالیٰ عنہ اما الصفرة فانی رائیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ وسلم یصبغ بھا'' فرمایا عبداللہ ابن عمر نے کہ زرد رنگ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ کو دیکھا ہے زرد رنگ استعمال کرتے 'فاحب ان اصبغ بھا'' پس میں زرد رنگ کو دوست رکھتا ہوں۔

الغرض احادیث مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ملبوس زرد کا استعمال مسنون ترین ہے۔ اس وجہ سے صفات محمد یہ کے مظہراتم نے اپنے لباس کے واسطے زرد رنگ کو زیادہ پسند فرمایا۔ لیکن دوسری حدیث کے مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس رنگ اور اس وضع کا لباس اسی مرتاض اور صاحب تجرید کا ہوتا ہے۔ جس کو دنیا اور تعلقات دنیا سے قطعی احتراز اور ماسویٰ اللہ سے انقطاع کامل ہو۔ چنانچہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام جن کی روحانیت مسلمہ اور آپ کی تجرید کا تمام عالم کو اعتراف ہے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ہمیشہ لباس آپ کا ہمشکل احرام اور اصفر اللون رہا۔ حتےٰ کہ رفع الی السماء کے وقت بھی زرد رنگ کی دو چادریں زیب جسم تھیں۔

اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ عیسیٰ علیہ السلام طواف بیت اللہ میں مشغول ہیں۔ اور دو چادریں زرد آپکے جسم اطہر پر ہیں۔ اور بالوں سے پانی کے قطرے ٹپکتے ہیں۔

پھر نزول عیسیٰ علیہ السلام کی جب خبر دی تو اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی نشانیاں بیان فرمائیں۔ جیسا کہ سنن ابی داؤد جلد ثانی میں ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ فرمایا رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب عیسیٰ

علیہ السلام نزول کریں گے۔ تو تم دیکھ کر پہچان لو گے کہ مردمربوع یعنی **بین الطویل و القصیر** ہوں گے ''**وَالیٰ حمرة البیاص حمصرتین کان راسه یقطر**''۔ (الیٰ آخرہ) یعنی رنگ صبیح سرخی مائل ہوگا۔ اور دو چادریں زردان کے لباس میں ہوں گی۔ اور بالوں سے قطرے ٹپکتے ہوں گے۔

اب اس وضع اور اس رنگ کے لباس کا احترام کافی طور پر ظاہر ہوگیا۔ کیوں کہ ایسے ممتاز اور جلیل القدر پیغمبر جن کو جناب باری عزاسمہ نے روح اللہ کا خطاب اور رفع الی السماء کا مرتبہ عنایت فرمایا۔ ان کا لباس ہمیشہ زرد اور بہ صورت احرام رہا۔ بلکہ آخر زمانہ میں جب نزول کریں گے تو اس وقت بھی بموجب حدیث نبوی ''حمصر تین'' یعنی دو چادریں اصفراللون آپ کے لباس میں ہوں گی۔ جس کو دوسری لفظوں میں یہ کہنا چاہئے۔ کہ آپ احرام پوش ہوں گے۔ لہٰذا عیسےٰ علیہ السلام کا یہ حلیہ جو حقیقت میں شان روحانیت کا مجسمہ ہے۔ ونیز دیگر اخلاق وعادات آپ کے کہ مزاج حلیم، خلق عمیم، محبت کی ہدایت، حقانیت کی تعلیم، تفرید میں فرد، تجرید میں یگانہ، یہ جملہ اوصاف حمیدہ ایسے تھے کہ جن کا اس موقع پر وضاحت کے ساتھ تبصرہ کیا جاتا۔ مگر اول تو طوالت کا خوف تھا۔ دوم اس خیال سے بھی یہ جسارت نہیں کرتا کہ چھوٹا منھ اور بڑی بات کا مضمون صادق آئے گا۔ اس لئے اس تشریح کو اخوان ملت کی رائے پر چھوڑتا ہوں۔ کہ اپنی اپنی استعداد اور نسبت کے مطابق تنقید و تطبیق فرمالیں گے۔ میں اس قدر وہ بھی مجملاً عرض کرتا ہوں کہ نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سرکار عالم پناہ کو عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص مناسبت تھی کہ حضور کے حالات و عادات عیسیٰ علیہ السلام کے حالات وعادات سے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔

اور یہ خیال ہمارا اصول تصوف و نیز روایت شرعیہ کے بھی خلاف نہیں اس لئے کہ مشاہیر حضرات صوفیہ کرام نے بشرح مبسوط ارقام فرمایا ہے کہ اولیاء امت محمد یہ انبیائے سابقین کے قدم پر ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض اصحاب کو انبیاء علیہم السلام سے مثال دی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق اور عمر فاروقؓ کی نسبت فرمایا کہ تم ابراہیم خلیل اللہ اور نوح علیہم السلام کی مثل ہو۔ جس کے حقیقی معنی یہی ہیں کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ حضرت خلیل اللہ اور نجی اللہ کی فطرت پر تھے۔ لہٰذا یہ مسئلہ متفق علیہ ہے اور علماء شریعت اور محققین ارباب طریقت کے اقوال سے ثابت ہے کہ اولیاء امت محمدی انبیا علیہم السلام کی فطرت پر یا قدم پر ہوتے ہیں۔

اور بعض محققین نے بجائے قدم کے قلب کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ فلاں ولی فلاں نبی کے قلب پر ہے۔ لیکن اس اختلاف لفظی کا تصفیہ امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمتہ نے کردیا۔ اور اپنی کتاب الیواقیت والجواہر، بیان مقام الوارثین للرسل من الاولیاء کی بحث میں شیخ محی الدین عربی علیہ الرحمتہ کا یہ قول نقل کیا ہے ''ان یطلعنی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ مقامات الانبیاے من حیث کونی وارثاً لحم ان من الادب ان یقال فلان علیٰ قدم الا نبیاء ولا یقال انہ علی قلیھم لان الا ولیاء علیٰ اظارا لا نبیاء مقتدون و لدالھم کالو علیٰ قلوب لاا بنیاء ''یعنی اللہ جل جلالہ نے مقامات انبیاءؑ سے مجھ کو خبردار کیا (اولیاء ان کے وارث ہوتے ہیں جن کو بہ لحاظ ادب کہا جاتا ہے کہ انبیا کے قدم پر ہیں۔ اور یہ نہیں کہتے کہ قلب انبیاء پر ہیں۔ ہر چند اولیا انبیاء کے آثار ہیں۔ ان کے قلب پر ہوتے

ہیں۔

حضرت شیخ اکبر کے اس ارشاد سے جو آپ کے انکشافات اور فتوحات میں سے ہے۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ اولیاء امت محمدی انبیاء علیہ السلام کے آثار ہیں اور جس ولی کو جس نبی سے خاص نسبت ہوتی ہے۔ وہ ولی اس نبی کا وارث اور اس کی فطرت پر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے محل نہیں ہے کہ ہمارے سرکار عالم پناہ کو عیسیٰ علیہ السلام سے خاص مناسبت تھی۔ گو باطنی مدارج و مقامات کا ذکر بھی نہ کروں گا۔ اور در حقیقت نہ اس کی مجھ کو صلاحیت ہے۔ لیکن ظاہری حالات اور عادات کو اگر دیکھا جائے تو بے ساختہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ حضرت وارث عالم پناہ کی ذات اقدس یقیناً مجموعۂ آثار عیسوی اور اسوۂ صفات روح اللہی تھی۔ اور حضور کے سوانح حیات کو عیسیٰ علیہ السلام کے حالات سے اسی طرح خاص مشابہت ہے جس طرح لباس اور رنگ لباس وارثی مشابہ تر لباس اور رنگ لباس عیسوی سے ہے۔

غرض یہی خرقہ وارثی جس مختصر طور پر ذکر ہوا جب طالب راہ فقر کو مرحمت ہوتا تھا تو یہ بھی دستور تھا کہ سرکار عالم پناہ اپنے خرقہ پوش کو امتیازی خطاب بھی تفویض فرماتے تھے۔ لیکن یہ امتیاز کبھی تو اسی قدر کافی سمجھا گیا کہ اس کے قدیم نام کے ساتھ صرف لفظ شاہ کا اضافہ ہوا۔ مثلاً مولوی نور کریم صاحب تہبند پوش ہوئے تو ان کا لقب نور کریم شاہ قرار پایا۔ یہ وہی طریقہ ہے جو خاندان چشت میں مروج اور مخدومان طریقت کی سنت جاریہ ہے کہ ان کے برگزیدہ مسترشدین کے اسمائے گرامی اس اعزاز کے ساتھ مشہور ہیں۔

یا کبھی اس امتیاز میں اور زیادہ وضاحت فرمائی تو فقیر کے قدیم اور آبائی نام

میں کامل تبدیل ہوا اور ایسا جدید نام اس کے لئے تجویز ہوا جس کو پہلے نام سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی تھی۔ جیسا کہ جناب کرم احمد صاحب رئیس دیوئی شریف کو جب تہبند مرحمت ہوا تو ان کا قدیم نام بالکل بدل دیا۔ اور بجائے اس کے معروف شاہ خطاب ملا۔

لیکن فقراء کا یہ خطاب جس کی حیثیت امتیازی معلوم ہے اس کو معمولی امتیاز کبھی نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ یہ اعزاز ہے۔ خصوصاً فقراء کا وہ جدید لقب جس کو قدیم نام سے کچھ تعلق نہ ہو اصلاحات باطنی کا بہترین نسخہ ہے کیونکہ طالب راہ فقر جب ترک دینا کے لئے مستعد ہو جاتا ہے تو اس کے عہد زندگی میں انقلاب عظیم ہوتا ہے اور پیشوایان طریقت کو ایسے اسباب مہیا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو طالب کے عادات قدیمہ میں تغیر پیدا کریں کہ اس دور جدید کے اہم معاملات اور غیر معمولی مشکلات کو برداشت کرنا آسان ہو۔ اور دنیوی مرادات اور نفسانی خواہشات سے فارغ ہو کر حصول تقرب الی اللہ میں بجمعیت خاطر مشغول ہو جائے۔ اور چونکہ ملبوسات وملفوفات باعث حظ ولذات ہوتے ہیں۔ اس لئے ہادیان راہ طریقت جس طرح طالب کے قدیم لباس میں تبدل کرتے ہیں۔ اور اپنا خرقہ دے کر اس کی طبیعت کو سادگی اور فروتنی کی جانب مائل کرتے ہیں۔ اسی طرح اس کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے کہ طالب کے خیالات میں اسباب مالوف سے بھی مغائرت پیدا ہو اور چونکہ انسان فطرتاً اپنے قدیم اور آبائی نام سے مالوف ہوتا ہے اس واسطے طالب کا پہلا نام بھی بدل دیتے ہیں کہ سابق کے تعلقات قطعی منقطع ہو جائیں اور جس دور جدید میں وہ آیا ہے اس سے مانوس ہو۔ اس لئے اس کو ایسا خطاب دیتے ہیں جو اس کے ذوق وشوق کے

مناسب حال ہوتا ہے۔اور پھر دنیا میں اسی نام سے وہ پکارا جاتا ہے۔

علی ہذا طالب راہ فقر کا نام تبدیل کرنے کی ایک خاص وجہ حضرات صوفیہ کرام نے یہ بھی ارقام فرمائی ہے کہ جب طالب صادق بہ ارادت واثق مرشد کامل کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوتا ہے اور شوق وصال مطلوب حقیقی میں بہ کمال ثبات و استقلال مستعد سرگرم جدو جہد ہو جاتا ہے تو اصطلاح صوفیہ میں مرید کے اس دور جدید کو ولادت ثانیہ کہتے ہیں۔کیونکہ ولادت کی دو قسمیں ہیں جسمانی و روحانی جس کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ حضرات محققین نے ارقام فرمایا ہے۔

چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمتہ نے طبقات الکبریٰ میں لکھا ہے کہ امام احمد ابوالعباس مرسی علیہ الرحمتہ نے پہلے عیسٰی علیہ السلام کی اس نصیحت کا ذکر کیا کیا کہ ''اے نبی سرائیل جو شخص دوبارہ پیدا نہیں ہوا وہ کونین کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگا۔''اور اس کے بعد فرمایا کہ ''انا و اللّٰه ولدت مرتین ابلا و لا دل ایلا د الطبیعة والا یلا د الثانی ایلاد الروح فی سماء المعارف ''یعنی واللہ میں دو مرتبہ پیدا ہوا ہوں۔ولادت اولےٰ ولادت طبیعی ہے اور ولاوت ثانی روحانی ترقی ہے۔

معہذا الشیخ شہاب الدین بن محمد سہروردی علیہ الرحمتہ نے عوارف المعارف میں اقسام ولادت کی تصریح میں ارقام فرمایا ہے۔جس کا ترجمہ مصباح الہدایت سے نقل کرتا ہوں ''ولادت دو قسم اند،صوری و معنوی ولادت صوری خروج اجنہ ارواح بشری است از مشمیۂ عالم غیب بفضاء عالم شہادت بواسطہ آبائی صوری و دریں ولادت نسبت صوری لازم شود و میراث صوری از اسباب و اموال تابع آن بود۔و ولادت معنوی

برعکس آن خروج اجنہ ارواح مومنا نست از مشمیہ عالم شہادت بہ فضاء عالم غیب بواسطۂ آباء معنوی۔ ودرین ولادت نسب معنوی ثابت گردد۔ ومیراث معنوی از علوم واحوال تعبیت لازم آید۔ وابتداء این آنگاہ بود کہ روح از قید دنیوی ونظر محبت از دنیا واہل آن خلاص یابد۔" (ولادت دو قسم کی ہے۔ ایک صوری دوسری معنوی۔ ولادتِ صوری یہ ہے کہ بچے کی پیدائش۔ عالم غیب کے میدان سے اس ظاہری دنیا کی فضا میں اپنے آباء کی وساطت سے۔ اس ولادت میں ظاہری صورت کی نسبت لازم ہوتی ہے۔ اور ظاہری وراثت اور اسباب اور اموال اس کے تابع ہوتے ہیں۔ اور ولادت معنوی میں اس کے برعکس آباء معنوی کی وساطت سے، بچے کی پیدائش، عالم شہادت سے عالم غیب میں ہوتی ہے۔ اس ولادت میں معنوی نسبت ثابت ہے۔ اور اس کی میراث میں علوم اور بیعت کے احوال لازم ہیں۔ اور اس کی ابتدا ہی اس سے ہوتی ہے کہ روح قیدِ دنیوی، دنیا اور اہل دنیا کی طرف نظر التفات سے چھٹکارہ پا جاتی ہے۔)

پھر حضرت مخدوم سہروردی علیہ الرحمتہ نے فصل چہار دہم علم دراست و دراشت میں ولادت ثانیہ کی اور وضاحت فرمائی کہ جس طرح حکمت الٰہی نے عالم ظاہر کا سلسلہ تولد وتناسل ازدواج متوالدین پر موقوف فرمایا ہے "ہمچنیں در عالم معنی سر حقیقت آدمی کہ آن عبدیت محض است در وجود نیا ید الا بعد از دواج مرید ز مراد برابطۂ محبت وقبول مرید تصرفات مراد را انیست ولادت کہ در پیش مدان اشارت رفت۔" (اسی طرح معنوی جہان میں آدمی کی حقیقت کا راز کیا ہے؟ صرف اس کا بندہ ہونا، اس کا ظہور نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ مرید اور پیر کے شوہر اور زوجہ بننے کے بعد،

محبت اور قبولیت کے رابطہ سے۔ یہ ہے ولادتِ معنوی کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔)

حضرت مخدوم علیہ الرحمتہ کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ انسان کی اس ولادت معروف کے علاوہ ایک ولادت ثانیہ بھی ہے جس کو ولادت معنوی کہتے ہیں۔ اور یہ ولادت معنوی مسترشدین کو بواسطۂ محبت پیشوائے کامل نصیب ہوتی ہے اور جس طرح پدرصوری ہمارا جسمانی باپ ہوتا ہے۔ اسی طرح پدر معنوی ہمارا روحانی باپ ہے تو لازم ہوا کہ جس طرح جسمانی باپ اپنی اولاد کا نام رکھتا ہے۔ اسی طرح روحانی باپ بھی اپنی حقیقی اولاد کا اس کی ولادت کے بعد نام رکھے۔ اور اس حقیقی اولاد کی ولادت حسب ارشاد حضرت مخدوم سہروردی اس وقت ہوتی ہے کہ" روح از قید تعلقات دنیوی ونظر محبت از دنیا واہل آن خلاص یابد" یعنی طالب صادق جب حصول تقرب الی اللہ کے لئے تعلقات دنیا سے دست بردار ہو۔ چنانچہ مطابق اصول طریقت ہمارے پدر معنوی حضرت وارث پاک نے اپنے حلقہ بگوش کا جدید نام ہمیشہ اسی وقت رکھا جب طلب الٰہی میں وہ تہبند پوش اور تعلقات دنیا سے سبکدوش ہوا۔

اور امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمتہ نے طبقاۃ الکبریٰ میں حضرت علی فرزند محمد وفا علیہ الرحمتہ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجازی باپ سے روحانی باپ کا زیادہ اقتدار واختیار ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔"لیس ابوک حقیقة الا من تولدة صورة نفسک من کشفة و بیانه حتی صارت عقلاً وما ابو جسمک فهوا بوک مجازاً لا نک ماانت هذاجسم بل روحه " یعنی حقیقت میں تمہارا باپ وہ ہے جس کے کشف وبیان

سے تمہارے نفس کی صورت پیدا ہوئی۔ اور وہ بالفعل عقل ہوگئی اور تمہارا جسمانی باپ مجازی ہے کیونکہ تم جسم تو ہو نہیں بلکہ جسم میں جو روح ہے تم وہ ہو۔

اس تصریح کے بعد آپ نے صاف لفظوں میں یہ بھی سمجھا دیا کہ تمہارا صحیح نام وہی ہے جو پدر حقیقی تمہارا نام رکھے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں "ولا یحل لک ان تدعی غیر ابیک الحقیقی" پس حلال نہیں ہے کہ تم اپنے حقیقی باپ کے سوا اور کے نام سے پکارے جاؤ۔

سیدی علی فرزند محمد وفا علیہ الرحمۃ نے جس طرح حقیقی باپ کے اقتدار کا ذکر کیا۔ اسی طرح اس کی بھی تاکید فرمائی کہ مسترشدین کے واسطے حلال نہیں ہے کہ پدر معنوی کے سوا اور کے نام سے مشہور ہوں۔ شاید اسی واسطے حضور نے اپنے غلاموں کو جب لباس فقر سے مستفیض کیا اور ان کے قدیم مراسم و عادات متغیر ہوئے۔ اور روحانیت کا دور شروع ہوا تو ان کا آبائی نام بھی بدل دیا اور اپنی جانب سے بحیثیت پدر معنوی خطاب مرحمت فرمایا۔ جس کو حقیقی نام سمجھنا چاہئے۔

لہٰذا حضرات عارفین کے ارشادات سے بخوبی ظاہر ہے کہ طالب راہ فقر کا نام تبدیل کرنا اصول طریقت میں داخل ہے بلکہ علمائے شریعت کا بھی اتفاق ہے کہ جناب سید المرسلین حبیب رب العالمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب اجلہ کو خطابات تفویض فرمائے ہیں جو کبھی تو ان کے اسمائے گرامی کے ساتھ بطور کنیت کے مشہور ہوئے اور کبھی وہ خطاب ان کا نام ہوگیا جس نے پہلے نام کو محو کر دیا۔

چنانچہ امام محمد یعقوب علیہ الرحمۃ نے سفر السعادت میں بہ کمال وضاحت

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کنیت کا ذکر کیا ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے حضرت عائشہ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہا کوام عبداللہ کنیت مرحمت فرمائی۔ اور حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوابویحییٰ فرمایا اور امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کوابوتراب کا ممتاز خطاب دیا جس سے کمال عظمت مرتضوی کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسا کہ شرح سفر السعادت میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ ''بعض اہل تحقیق از ارباب تصوف رادریں اسم اشارتہائے دقیق ومعنی بلیغ است کہ دلالت برکمال مرتبہ ونہایت فضیلت اودارد۔ تراب رااشارت بوجودتوحیدوفنادارند۔ پس حاصل معنی ابوتراب آن شودکہ وے اصل ومقتداوامام ومرجع طائفہ فقراوارباب فناواہل کمال است۔ چنانچہ منتہائے سلاسل مشائخ طریقت بذات شریف اوست۔ واین معنی راجناب حقائق آیات صاحب اسرار والانوار جمال الدین خواب محمدؐ باقی قدس سرہ درکلمات خوددر رشتہ نظم درآوردہ است وگفتہ است۔'' (کچھ اہل تحقیق، جوتصوف والے ہیں، کے نزدیک، اس اسم میں دقیق اور بلیغ اشارے ہیں کہ جوکامل درجہ پرانتہائی فضیلت رکھتا ہے، تراب سے اشارہ توحید کے وجود اور فانی ہونے کی طرف ہے۔ پس ابوتراب کے معنی حاصل ہوئے کہ آپ حقیقی طور پر مقتدااور امام ہیں اور فقراء کے طائفہ کے مرجع ہیں۔ جوارباب فنااوراہل کمال ہیں۔ اور یہ مفہوم جناب حقائق آیات صاحب اسرارونوار جناب محمد باقی قدس سرہ نے ان اشعار میں قلمبند کیا ہے۔)

من حاصل این خطاب گویم — مضمون ابو تراب گویم

خاک اند جماعتے کہ مردند — ہستی بخدائے خود سپردند

از سطوت نور درشکستہ — در آب بقا فرد نشستہ

گردے نہ بہ پشت پائی ایشان — درد کف پای خود چہ امکان
سرحلقہ خاکیان علیؓ بود — سر سلسلۂ جہاں علیؓ بود
زان بحرد و نہر بند بکشود — یکسو حسن و حبیب و داؤد
معروف و سری ،جنید بغداد — کزوے طرق کثیرہ بکشاد
یکسوئے دگر لطیفہ پاک — مستور بزیر پردۂ خاکس
سبطین رسولؐ و زین عباد — پس باقرؓ و صادق نکو زاد
این سلسلہ از طلائے ناب است — این خانہ تمام آفتاب است
معنی ابو تراب این است — تفسیر اشارت این چنین است

(میں اس خطاب کا ماحصل اور خلاصہ بیان کرتا ہوں۔یعنی ابوتراب کا مضمون بیان کرتا ہوں۔ جماعت فوت ہوگئی اور مٹی میں مل گئی۔اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔نور کے دبدبہ سے یہ ٹوٹ گئے اور بقا کے پانی میں بیٹھ گئے۔ایسی ہستیوں کے پاؤں بھی گرد سے نہیں اٹھتے تو ان کے پاؤں میں تھکن کیسی؟ان تمام خاکیوں کے سردار علیؓ ہیں۔اور جہان بھر کے تمام سلاسل کے سردار علیؓ ہیں۔اس سمندر سے دونہروں کا بند آپ نے کھولا ہے۔ایک طرف حسن بصریؒ اور حبیب عجمیؒ اور داؤد طائیؒ ،معروف کرخیؒ ،سری سقطیؒ اور جنید بغدادیؒ ہیں۔آپ سے کثیر تعداد میں سلاسل کا آغاز ہوا۔ بہت سے دوسرے پاک باطن خاک کے پردہ میں پوشیدہ ہوگئے۔دوسری طرف حضور پاک کی اولاد میں بیٹوں سے اور ان بندوں سے حضرت امام باقرؓ اور امام جعفر صادقؓ جیسی اچھی نسل چلی ۔ یہ سلسلۃ الذہب یعنی خالص سونے کا سلسلہ ہے۔ یہ تمام کا تمام گھرانہ گویا آفتاب ہے۔یعنی روشنی بکھیرنے والے ہیں۔ بوتراب کا معنی یہی ہے۔

اس اشارے کی تفسیر اسی طرح ہے۔)

علیٰ ہذا آنحضرت ﷺ نے برادرِ انسؓ کے حق میں ابوعمیر سے فرمایا۔ جس کی صراحت میں ترمذی نے لکھا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میرا چھوٹا بھائی ایک روز کنجشک خانگی سے کھیلتا تھا۔ ناگاہ وہ چڑیا مرگئی۔ تو وہ مغموم ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ ''یا اباعمیر ما فعل النغیر''۔ اور خود حضرت انسؓ صغر سنی میں سبز ساگ لائے تھے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوحمزہ کنیت مرحمت فرمائی اس لئے کہ حمزہ ساگ کو کہتے ہیں۔ جو فارسی میں تیزک کے نام سے مشہور ہے۔ اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلی سے محبت تھی۔ جس کو عربی میں ہرہ کہتے ہیں۔ اس جہت سے آپ کو ہریرہ خطاب ملا۔ اور اس خطاب نے آپ کے پہلے نام کو محو کر دیا۔ چنانچہ حضرات محدثین کا اختلاف ہے کہ پہلے آپ کا نام کیا تھا۔ اسی طرح ایک مقتدر صحابی کو ابوذر خطاب مرحمت ہوا۔ ذر عربی میں چیونٹی کو کہتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بطور کنیت کے نہیں ہے بلکہ جدید نام رکھا گیا ہے۔ کیونکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی خطاب سے پکارے جاتے ہیں۔ اور پہلا نام آپ کا ایسا محو ہوا کہ سنا نہیں جاتا۔

الغرض جناب نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے اسی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو لقب خاص سے ملقب فرمایا کہ رسم قدیم اور اسم آبائی میں تبدل کرنا تغیر عادات میں داخل ہے کہ اس لئے تغیر عادات ہے چنانچہ حدیث ہے کہ ''**بعثت لرفع العادات**'' کہ میں رسمی عادات کو مٹانے آیا ہوں۔ لہٰذا تیرہ سو برس کے بعد حضرت وارث پاک خلف الصدق صاحب لولاک نے اپنے جد نامدار کی اس سنت

قدیم کی پوری تعمیل کی اور وہ مسترشدین جو طلب الٰہی کے شوق میں ترک تعلقات دنیوی پر مستعد ہوئے اور نفسانی خواہشات سے احتراز کیا ان کے لباس میں بھی کامل تغیر فرمایا۔ اور ان کے احوال کے لحاظ سے خاص دے کر ان کے پہلے نام کو آپ نے صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا۔

بلکہ اکثر فقرائے ہند کا بھی یہی مقولہ ہے۔ چنانچہ گیتا میں ہے کہ سری کرشن جی نے ارجن کو اس کی تعلیم دی ہے جس کو ابوالفیض فیضی نے نظم کیا ہے۔

نہ ترک عمل کار ہر کس بود
نہ فضل خدا یار ہر کس بود

(ہر کسی کا کام ترک عمل نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اللہ کا فضل ہر کسی کا یار ہوتا ہے۔)

اور جس طرح فقرائے تہبند پوش کو ان کی حالت کے لحاظ سے مختلف خطاب مرحمت ہوئے اسی طرح ان کی حیثیت کے مطابق ضروری احکام بھی ان کے حق میں صادر فرمائے۔ اور مختصر مگر جامع اور معنی خیز الفاظ میں مسلک فقر کے بعض شرائط سے ان کو آگاہ کر دیا۔ چنانچہ اکثر فقراء سے حضور نے فرمایا ''وضع کے پابند رہنا۔'' کسی کو حکم ہوا ''مر جانا مگر سوال نہ کرنا۔'' کبھی ارشاد ہوا کہ ''فقیر وہ ہے جو دنیا میں بے لاگ رہے۔'' کسی کو ہدایت ہوئی کہ ''دُنیا کا مال و اسباب نہ جمع کرنا۔'' کسی سے فرمایا ''آزاد اور بے غرض رہنا۔'' کبھی یہ نصیحت کی ''فاقہ ہو تو صبر کرنا۔'' کبھی ارشاد ہوا کہ ''فقیر کو چاہئے کہ مصیبت پڑے تو گھبرائے نہیں اور تکلیف کا اظہار نہ کرے۔'' یہ بھی فرمایا ہے کہ ''تکلیف کی شکایت نہ کرے کیونکہ تکلیف اور آرام خدا کی جانب سے ہے پھر خدا کی شکایت کس سے کرو گے۔'' اکثر فقرا سے یہ ارشاد ہوا کہ ''دُنیا کے واسطے

کوئی کام نہ کرنا اور خدا کے واسطے جان دے دینا۔'' یہ بھی حضور نے متواتر فرمایا ہے ''خدا کی محبت میں مٹ جانا۔'' یہ بھی ارشاد ہوا ہے ''محبت کرو کسب سے کچھ نہیں۔'' یہ بھی فرمایا ہے ''محبت ہے تو سب کچھ ہے محبت نہیں تو کچھ نہیں۔'' اور اکثر فرمایا ہے کہ'' فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو''۔ بظاہر یہ احکام مختلف المفہوم نظر آتے ہیں۔ مگر درحقیقت بالمعنی مرادف ہیں۔ کیونکہ سب کا ماحصل یہی ہے کہ طلب الٰہی کے لئے لازمی ہے کہ دنیا اور تعلقات دنیا سے احتراز کرو اور کوچہ فقر میں محب بن کر آؤ۔

لیکن ارشادات مذکورہ کو ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں فصاحت کی عجیب شان ہے کہ الفاظ کے ظاہری معنی سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق اور اعمال کی تعلیم فرمائی ہے۔ اور فقر کے بعض قیود و شرائط سے خبردار کیا ہے۔ اور درحقیقت ان ہدایات سے طالبین راہ فقر کی تعلیم ہی مقصود بھی تھی۔

لیکن نظر غائر سے دیکھا جائے تو ''کلام الملوک ملوک الکلام'' (بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔) کا مضمون صادق آتا ہے۔ اور ارشادات مذکور میں یہ خوبی نظر آتی ہے کہ یہی احکام جو تعلیما ارشاد فرمائے ہیں لفظ فقیر کے حقیقی معنی بھی یہی ہیں۔

یہ حضور کی عین بندہ نوازی تھی کہ نوآموز فقیر سے خطاب تھا اس لئے فقیر کی تعریف اور اس کے لغوی اور اصطلاحی معنوں سے خبردار کر دیا۔ اور سمجھا دیا کہ فقیر اس کو کہتے ہیں جو دنیا سے آزاد ہو۔ اور طلب شاہد حقیقی میں جان بھی ایثار کر لے اور سوال عن الناس کو حرام سمجھے۔

چنانچہ فقیر کے لغوی معنی یہ ہیں کہ ''فقیر آنکہ ہیچ ندارد۔'' (فقیر وہی ہے جو

کچھ بھی نہ رکھے۔) اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمتہ نے عوارف المعارف میں لکھا ہے کہ فقیر اس کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور عدم تملک بغیر ترک دنیا ناممکن ہے اور یحییٰ بن معاذ کا یہ قول بھی نقل فرمایا ہے کہ فقیر وہ ہے جو دنیا کے آگے اور دنیا اس کے پیچھے چلے۔ اور صاحب صحائف السلوک نے فقیر کے معنی ترک ماسویٰ اللہ ارقام فرماتے ہیں۔ اور حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں:۔

حضوری گر ہمی خواہی از وغائب مشو حافظؔ

متٰی ما تلق من تھویٰ کا ع الدنیا و امھلھا

(اگر تو حضوری چاہتا ہے تو اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ تو جس چیز کی خواہش رکھتا ہے جب وہ تجھے مل جائے تو دنیا چھوڑ دے۔)

اور نفحات الانس میں مولانا عبدالرحمٰن جامی علیہ الرحمتہ نے فقیر کی تعریف یہ فرمائی ہے ''فقیر آن طائفہ اند کہ مالک ہیچ چیز و اسباب و اموال دنیوی نباشند و در طلب فضل و رضوان الٰہی ترک ہمہ کردہ باشند'' (فقراء وہ گروہ ہیں کہ جو کسی چیز، دنیاوی مال و اسباب کے مالک نہیں ہوتے۔ اور اللہ کے فضل اور رضا کی طلب میں ہر شے کو ترک کر دیتے ہیں۔) اور حضرت امام غزالی علیہ الرحمتہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے ''ان الفقر عبارة عن فقد ما ھو محتاج الیه'' (فقر عبارت ہے اس سے کہ فقیر کسی چیز کا محتاج نہ ہو۔) اور امام عبدالوہاب شعرانی نے طبقاۃ الکبریٰ میں لکھا ہے کہ شیخ ابو سعید قلوری کا قول ہے کہ ''من شرط الفقیر ان لایملک شیٔا و لا یملکه شئی۔'' کہ نہ کسی چیز کا مالک ہو اور نہ کوئی چیز اس کی مالک ہو۔ اور شیخ ابومدین مغربی علیہ الرحمتہ فقر کی تعریف میں فرماتے ہیں۔ ''الفقر امارة التوحید و دلا لة علی

التفرید ۔''یعنی فقر توحید کی نشانی اور تفرید کی دلیل ہے اور شیخ بقاعلیہ الرحمتہ جو عراق کے صدیقوں میں اور صاحب مقام جلیلہ تھے فرماتے ہیں'' **الفقر تجرد القلب عن العلائق و استقلاله بالله سبحانه و تعالیٰ** ''کہ فقر کی تعریف یہ ہے کہ دل حلائق دنیا سے خالی اور اللہ جل جلالہ کے ساتھ مستقل ہو۔ اور انھیں کا قول ہے۔ کہ ''**الفقر و صف کل مستغن عن غیره**'' کہ فقر اس کا وصف ہے جو غیر سے مستغنی ہو۔ اور حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندر فرماتے ہیں:۔

زہد وتقویٰ چیست اے مرد فقیر

لا طمع بودن ز سلطان و امیر

(اے مردِ فقیر! زہدوتقویٰ کیا شے ہے؟ سلطان وامیر سے لاطمع ہوجانا۔)

غرض حضرات عارفین کے اقوال سے معلوم ہوگیا کہ لفظ فقر کے لغوی اور اصطلاحی معنی وہی ہیں جو حضور کے ارشادات کا مفہوم ہے۔ اور فقیر کی بھی وہی تعریف ہے جو سرکار عالم پناہ نے اپنے تہبند پوش غلاموں کو روز اول با محاورہ الفاظ میں سمجھا دیا۔

علاوہ اس کے یہ ہدایات اگر اخلاقی اور مشربی تعلیم ہی متصور کیئے جائیں۔ تو یہ عرض کروں گا کہ ہمارے حضور نے راہِ فقر کے مسافر جدیدہ کی وہی تعلیم فرمائی جو مشاہیر حضرات صوفیہ کرام کا عین مسلک ہے۔ کیونکہ حضور کے ارشادات مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ فقرا کو ہدایت فرمائی کہ آزاد اور بے تعلق رہو۔ اور دنیا کے واسطے کوئی کام نہ کرو اور یہی سلف صالحین کا مشرب تھا۔

چنانچہ امام غزالی علیہ الرحمتہ نے (احیاء العلوم) میں لکھا ہے کہ حضرت اویس

علیہ الرحمتہ کا قول ہے کہ جب متوکل تلاش معاش میں نکلتا ہے تو توکل اس کا ٹوٹ جاتا ہے۔ اور صاحب تذکرۃ الاولیاء نے حضرت محمد واسع علیہ الرحمتہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ''کسے وصیت خواست۔ گفت وصیت میکنم ترا کہ بادشاہ باشی در دنیا زاہد باشی و بہ ہیچ کس طمع نکنی و ہمہ خلق رامحتاج بینی۔ لاجرم تو غنی و بادشاہ باشی'' (جو شخص وصیت چاہتا ہے اس کو کہہ کہ تجھے وصیت کرتا ہوں کہ بادشاہ بن جا، آخرت اور دنیا میں۔ یعنی دنیا میں زاہد ہو جا۔ اور کسی آدمی کا لالچ نہ کر اور ہر شخص کو تو محتاج سمجھ۔ یقینی طور پہ تو غنی اور بادشاہ ہو جائے گا۔) اور صاحب عوارف المعارف نے لکھا ہے (ترجمہ) جماعتے از جنید رحمہ اللہ پرسیدند کہ اگر مادر طلب رزق سعی نمائم چہ گونہ باشد۔ جواب داد کہ اگر میدانی کہ رزاق شمارا فراموش کردہ است در طلب رزق سعی کنید۔'' (فقرا کی ایک جماعت نے حضرت جنید بغدادیؒ سے پوچھا کہ اگر ہم رزق کی تلاش میں کوشش کریں تو یہ کیسا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ رزاق نے تمہیں فراموش کر دیا ہے تو رزق کی تلاش و جستجو کر۔) اور حضرت ذوالنون مصری علیہ الرحمتہ کا قول ہے کہ 'التوکل ترک تدبیر عن الحول و القوۃ۔'' (توکل کیا ہے؟ تدبیر کا چھوڑ دینا۔) اور حضرت سری سقطی علیہ الرحمتہ کا یہ قول ہے 'التوکل الا نخلاء عن الحول و القوۃ'' (توکل حول اور قوۃ سے نکلنے کا نام ہے۔) اور حضرت حمدون قصار علیہ الرحمتہ کے اس قول کو بھی نقل فرمایا ہے کہ 'التوکل ھو الاعتصام باللّٰہ'' (توکل اللہ کا دامن مضبوطی سے پکڑ لینے کا نام ہے۔) اور حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا ہے۔ کہ 'التوکل ان یکون العبد بین یدی اللّٰہ کا لمیت بین یدی الغسال یقلبہ کیف یشاء ولا یکون لہ حرکۃ ولا تدبیر'' (توکل انسان کا

خدا کے سامنے ایسے ہو جانا ہے جیسے میت غسل دینے والے کے سامنے ہوتی ہے۔ جیسے وہ چاہتا ہے اسے پلٹتا ہے۔اور میت کیلئے کوئی حرکت یا تدبیر نہیں ہوتی۔) بلکہ مولانا روم علیہ الرحمۃ تو یہ فرماتے ہیں کہ جس کو خدا سے سروکار ہو جاتا ہے اس میں دنیوی کاروبار کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔وہو ہذا

تا بدانی ہر کہ را یز دان بخواند — از ہمہ کار جہاں بیکار ماند
ہر کہ را باشد ز یزداں کاروبار — یار آنجا یافت بیرون شد ز کار

(تا کہ تو جان لے کہ جس کو اللہ تعالیٰ بلاتا ہے وہ جہان کے تمام کاموں سے بے کار ہو جاتا ہے۔ جو اپنے کام کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے وہ پھر وہاں اپنا وجود بوجھ سمجھتا ہے اور اپنے کام سے جدا ہو جاتا ہے۔یعنی کسی کام کیلئے ذاتی کوشش کرنا یہ فقراء کا کام نہیں ہے۔اسے مکمل طور پہ اللہ پہ چھوڑ دے۔)

یہ اقوال اور ایسے متعدد دیگر ارشادات حضرات عارفین کے ترک کسب کی تائید میں منقول ہیں۔اور ان حضرات کا وہی مسلک تھا جس کی تقلید کے لئے حضور نے اپنے فقراء کو ہدایت فرمائی ہے کہ کسب اسباب کو سبب معاش نہ بناؤ۔ رضوان الٰہی کا طریقہ یہی ہے کہ حضرت مسبب الاسباب پر بھروسہ کرو۔ کیونکہ اللہ جل جلالہ نے قناعت کی ترغیب میں یہی فرمایا ہے "و علی اللّٰه فتو کلوا ان کنتم مؤمنین" (سورۃ المآئدہ:۲۳) کہ اللہ پر توکل کرو اگر تم ایمان والے ہو۔اس سے معلوم ہوا کہ توکل علی اللہ ایمان کی خاص دلیل ہے۔ کیونکہ ایمان بالغیب ہے۔اور توکل میں ہمہ تن غیب پر نظر رہتی ہے۔اسی وجہ سے عارفین باتمکین کا یہ مسلک ہوا کہ کسب معاش سے احتراز فرمایا۔ چنانچہ صاحب مراۃ الاسرار نے اصحاب صفہ کے حالات میں لکھا ہے

کہ ''در یگانہ سکونت داشتند و آنحضرت ایشان تا تکلیف کسب و جہاد نہ کرد۔'' (جہاں یہ سکونت اختیار کر چکے تھے اور حضرت کے قول کے مطابق کہ وہ کسب اور جہاد اختیار نہ کریں۔) اور صاحب کشف المحجوب نے اصحاب صفہ کے تذکرہ میں لکھا ہے'' دست از دنیا و کسب بداشتہ بودند واز ہمہ اعراض کردہ'' (دنیا اور کسب سے یہ جدا ہو گئے تھے۔ ہر چیز سے انہوں نے بے رُخی اختیار کر لی تھی۔) بلکہ ارباب محققین واصحاب مفسرین نے فقراء صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے صفات فقر و قناعت نص قطعی سے ثابت کئے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ انہیں ذی مرتبت کی شان میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرمایا ہے'' **للفقر آء الذین احصروا فی سبیل اللّٰہ لایستطیعون ضربا فی الارض. یحسبھم الجاھل اغنیآء من التعفف. تعرفھم بسیما ھم. لایسئلون الناس الحافا۔**'' ((خیرات) ان فقراء کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں (کسبِ معاش سے) روک دیئے گئے ہیں، وہ (امورِ دین میں ہمہ وقت مشغول رہنے کے باعث) زمین میں چل پھر بھی نہیں سکتے، ان کے (زھداً) طمع سے باز رہنے کے باعث نادان (جو ان کے حال سے بے خبر ہیں) انہیں مالدار سمجھے ہوئے ہیں، تم انہیں ان کی صورت سے پہچان لو گے، وہ لوگوں سے بالکل سوال ہی نہیں کرتے کہ کہیں (مخلوق کے سامنے) گڑ گڑانا نہ پڑے۔ سورۃ البقرۃ:۲۷۳) شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ'' برائے آن فقیران است کہ بند کردہ سدند در راہ خدا۔ نمی توانند سفر کردن در زمین۔ تونگرمی پندارند ایشان را نادان۔ بہ سبب طمع نکردن۔ تو می شناسی ایشان را بقیافہ ایشان سوال نمی کنند از مردمان بالحاح۔'' (یہ اُن فقیروں کیلئے ہے جو اللہ کے راستے میں روک دیئے گئے ہیں۔ وہ زمین میں سفر نہیں کر سکتے اور لوگ انہیں امیر

خیال کرتے ہیں۔ طمع نہ کرنے کہ وجہ سے تو ان کو پہچان لے گا اس سے کہ وہ لوگوں کو زاری سے سوال نہیں کرتے۔)

ارباب مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیۂ کریمہ اصحاب صفہ کی شان میں نازل ہوئی ہے جس کا ایک حصہ ان کی تعریف میں ہے کہ وہ اللہ جل جلالہ کے واسطے ریاضت اور مجاہدات میں مشغول رہتے ہیں۔ اور اپنے نورانی چہروں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ اورایک حصہ میں زہدواستقامت کا ذکر ہے۔ اوران کے طریق و مسلک کو بیان کیا ہے کہ ان کوسفر سے پرہیزسوال کرنے سے قطعاً احتراز ہے۔ لیکن حضرت محی الدین عربی علیہ الرحمتہ نے اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں فقراء اہل صفہ کے طریق ومسلک کی اورزیادہ وضاحت فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں " **للفقراء الذین احصروا . هم المجاهدة. فی سبیل اللّٰه لایستطیعون ضربافی الارض. لـلتجاوزة للتجارة و لكسب لا شتغا لهم باللّٰه و اشواقهم فی الاحوال و صرف اوقاتهم فی العبادة یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف. عن السوال و الاستغناء عن الناس. تعر فهم بسیما هم . من صفرة وجو ههم و نور جبا ههم و هیبة سجالهم انهم عرفاء اهل اللّٰه لا تعرفهم الا باللّٰه ومن هومنهم. لایسئلون الناس الحافا. ای الحافا و المراد نفیٔ مسئلة الناس بالكلیة.** " ((خیرات)) ان فقراء کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں (کسب معاش سے) روک دیئے گئے ہیں، جہاد کرنے والے ہیں، وہ (امور دین میں ہمہ وقت مشغول رہنے کے باعث) زمین میں چل پھر بھی نہیں سکتے، تجارت کیلئے یا روزی کمانے کیلئے، کیونکہ وہ مستغرق الی اللہ ہیں، حال کی کیفیت میں مست

ہیں اور اپنے اوقات کوعبادت میں صرف کرتے ہیں، ان کے (زھداً) طمع سے باز رہنے کے باعث نادان (جوان کے حال سے بے خبر ہیں) انہیں مالدار سمجھے ہوئے ہیں، سوال نہ کرنے کی وجہ سے اور لوگوں سے بے پرواہ ہونے کی وجہ سے، تم انہیں ان کی صورت سے پہچان لوگے، ان کے چہرے زرد ہیں اور ان کی پیشانیوں کا نور اور ان کی شخصیت کا رعب ہونے کی وجہ سے کہ یہ اہل اللہ میں سے ہیں اور عرفا ہیں، ان کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں پہچانتا، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر، لپٹ کر نہیں مانگتے، گڑگڑانا کیا ہے؟ اس سے مراد ہے لوگوں سے سوال کی مکمل طور پر نفی کرنا۔ سورۃ البقرۃ: ۲۷۳)

حضرت شیخ اکبر نے فرمایا کہ فقراء اہل اللہ کی حقیقی تعریف یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں مجاھدہ کرتے ہیں۔ اور اپنے شوق و احوال کی وجہ سے تجارت اور کسب معاش کے لئے سفر نہیں کرتے۔ اور یاد الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ اور ان کی عفت اور استغناء کے باعث نادان لوگ ان کو غنی سمجھتے ہیں۔ اور چہرے کی زردی اور پیشانی کے نور و ہیبت سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ بیشک یہی فقیر اہل اللہ ہیں۔ اور یہ قطعاً سوال نہیں کرتے۔

حضرت شیخ اکبر کی اس تفسیر سے بخوبی واضح ہو گیا کہ فقراء اہل اللہ کی حقیقی تعریف یہ ہے کہ شدت ریاضت ان کو کسب و تجارت سے باز رکھتی ہے اور وہ قطعاً سوال نہیں کرتے۔ اور یہی ہمارے سرکار عالم پناہ کے ارشادات کا ماحصل ہے۔ کہ دنیا کے واسطے کوئی پیشہ نہ کرو۔ ورنہ کسب کی مشغولیت تمہارے اس دوامی ذکر میں خلل انداز ہوگی۔ جس کی تم کو تاکید ھدایت کی گئی ہے۔ کہ کوئی سانس خالی نہ جا سکے۔ اور خالق عالم کی جب کہ یہ صفت ہے کہ "واللّٰہ المستعان" (اور اللہ ہی مددگار

ہے۔سورۃ یوسف:۱۸) تو پھر مخلوق کی امداد و استعانت کی حاجت نہیں۔تصدیق کے ساتھ اپنے جملہ معاملات کارساز حقیقی کے سپرد کردو۔ وہ بندہ نواز تمہارے بگڑے ہوئے کاموں کو خود بنادے گا۔''وکفی باللّٰہ وکیلا''(اور اللہ ہی کارساز کافی ہے۔سورۃ الاحزاب:۳)

اس تصریح سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہر چند کسب بالذات مذموم نہیں ہے۔ مگر حارج احوال و اوقات ہو تو ترک لازمی ہے۔ کیونکہ شاغل کے لئے اطمینان اور جمعیت خاطر کی ضرورت ہوتی ہے۔اور جمعیت خاطر انہیں قانعین اور متوکلین کو حاصل ہوتی ہے۔جن کو کامل یقین ہو کہ''ان اللّٰہ ھو الرزاق ذوالقوۃ المتین۔''(بے شک اللہ ہی ہر ایک کا روزی رسان ہے، بڑی قوت والا ہے، زبردست مضبوط ہے۔سورۃ الذّٰریٰت:۵۸)یعنی اپنی قوت سے ہم کو رزق پہنچتا ہے۔اور اسی یقین کے پختہ کرنے کے لئے ہمارے حضور نے اپنے فقیروں کو ہدایت فرمائی ہے اور متواتر ارشاد ہوا ہے۔''فقیر اسی پر قناعت کرے جو بے طلب غیب سے اس کو پہنچے۔''اور اکثر یہ فرمایا کہ''کہیں رہو خدا رزق ضرور پہنچائے گا۔ کیونکہ اس نے وعدہ کیا ہے''۔ یہ فرمان وارثی آیۂ''ومامن دآبۃ فی الارض الا علی اللّٰہ رزقھا۔''(اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا(جاندار)نہیں ہے مگر(یہ کہ)اس کا رزق اللہ(کے ذمۂ کرم)پر ہے۔سورۃ ھود:٦)کا ترجمہ ارشاد ہوا ہے''فقیر وہ ہے جو کل کے لئے نہ رکھے۔''حضور کے اس حکم میں کامل ثبات و استقامت کی ہدایت ہے۔کہ فقیر کو اپنے رزق رسان کی قوت کاملہ کا ایسا یقین ہو کہ قلب مطمئن اور مستغنی رہے اور حرص دریوزہ سے جو صریح توکل کے خلاف ہے احتراز کرے بلکہ حضرت مولانا علیہ الرحمۃ نے تو یہ

فرمایا ہے کہ حرص دریوزہ ایسی بے ادبی اور مذموم خصلت ہے جو متوکلین کو عطیات الٰہی سے محروم کر دیتی ہے۔ جس کی تمثیل میں عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب کا ذکر کیا ہے۔ کہ غیب سے خوان نعمت آیا تو انھوں نے قناعت نہ کی۔ اور اس میں سے دوسرے دن کے لئے بھی رکھ چھوڑا اس بے ادبی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عنایت رب العزت سے محروم ہو گئے۔ اور وہ دعوت غیبی ہمیشہ کے لئے موقوف ہوگئی چنانچہ اپنی مثنوی کے دفتر اول توفیق ادب کے سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں۔

باز عیسیٰ چون شفاعت کردحق — خوان فرستاد و غنیمت بر طبق
مائدہ از آسمان شد عائدہ — چونکہ گفت اُنـزل علینا مائدہ
باز گستاخان ادب بگزاشتند — چون گدایان زلہا بر داشتند
کرد عیسیٰ لا بہ ایشان راکہ این — دائمست و کم نگرد داز زمین
بدگمانی کردن و حرص آوری — کفر باشدنزد خوان مہتری
زان گدار دیان نادیدہ زآز — آن در رحمت برایشان شد فراز
نان و خوان از آسمان شد منقطع — بعدازان زان خوان نشد کس منتفع

(پھر حضرت عیسیؑ نے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے خوان بھیجا اور خوان میں مال رکھا۔ مائدہ آسمان کی طرف سے آتا کیونکہ حضرت عیسیؑ نے نزول مائدہ کیلئے دعا کی تھی۔ لیکن پھر گستاخوں نے ادب چھوڑ دیا۔ مانگنے والوں کی طرح اپنے دلوں کو اٹھا لیا۔ حضرت عیسیؑ نے ان کو کہا کہ ایسا نہ کرو۔ یہ ہمیشہ آئے گا اور یہ زمین سے کم نہیں ہوگا۔ لیکن انہوں نے بدگمانی کی اور لالچ کیا۔ اس عظیم خوانِ نعمت سے کفر کیا۔ لالچ کی وجہ سے انہوں نے دینے والے کی طرف نہ دیکھا وہ رحمت کا دروازہ ان پر بند ہو گیا۔ دستر

خوان آسمان کی طرف سے بند ہو گیا۔ بعد ازاں اس دسترخوان سے کسی نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔)

اور جب اللہ جل جلالہ کے وعدہ رزق رسانی پر کافی بھروسہ ہو جاتا ہے تو پھر فقیر مطمئن اور تلاش معاش اور کسب و اسباب کے فکر و اندیشہ سے فارغ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حضور نے فرمایا ہے کہ فقیر تصدیق کے بعد مستغنی ہو جاتا ہے۔ اسی مضمون کو اس طرح بھی فرمایا ہے کہ ''اہل تصدیق کسب نہیں کرتے'' اور اکثر حضور نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ''جو خدا کو پہچانتے ہیں وہ بندوں کی پرواہ نہیں کرتے'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''تصدیق ہی ایمان ہے جس کو تصدیق نہیں اس کا ایمان کمزور ہے۔'' اور جناب حضور نے اکثر اپنے غلاموں سے یہ بھی فرمایا کہ ''کسب پر بھروسہ رہے گا تو تصدیق ہونا محال ہے''۔ اس ارشاد کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ کے وعدہ پر اطمینان نہ ہونا قطعی ایمان کے خلاف ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ رزاق العباد نے ہمارے اطمینان کے واسطے اپنے وعدۂ رزق رسانی پر قسم بھی کھائی ہے اور جوش رحمت میں ارشاد فرمایا ہے ''**وفی السمآء رزقکم وما توعدون O فو رب السمآء و الارض انه الحق مثل ما انکم تنطقون O** '' (اور آسمان میں تمہارا رزق (بھی) ہے اور وہ (سب کچھ بھی) جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ پس آسمان اور زمین کے مالک کی قسم یہ (ہمارا وعدہ) اسی طرح یقینی ہے جس طرح تمہارا بولنا۔ سورۃ الذّریٰت: ۲۲۔۲۳)

چنانچہ اس آیۂ کریمہ کے تحت میں امام غزالی علیہ الرحمتہ منہاج العابدین کے عقبۂ چہارم میں تاج العارفین حضرت حسن بصری علیہ الرحمتہ کا قول نقل فرماتے

ہیں ''حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ گفتہ ست کہ لعنت خدائے برقومے کہ پرورگار ایشان بر سانیدن رزق سوگند خوردہ وایشان استوارش ندارند۔'' (حضرت حسن بصریؒ نے کہا کہ اللہ کی لعنت ہو اس قوم پر کہ پروردگار نے انہیں رزق پہنچانے کی قسم اٹھائی اور انہوں نے اس قسم پر یقین نہیں کیا۔)

الغرض جناب حضرت نے اپنے تہبند پوش غلاموں کو جس طرح ترک سوال کی متواتر تاکید فرمائی اسی طرح ترک کسب کی بھی قطعی ہدایت ہوئی۔ اور مختلف عنوان سے سمجھا دیا کہ اسباب وکسب کو رزق کا وسیلہ نہ بناؤ۔ اور نہ غیر اللہ کی اعانت وامداد پر بھروسہ کرو اور بکمال صدق اس کا یقین کرو کہ رزاق مطلق رزق مقسوم کا ضامن ہے اور وہ وقت پر تم کو ضرور پہنچے گا۔ بقول مولانا علیہ الرحمۃ

ہیں توکل کن ملرزان پا ودست

رزق تو برتو ز تو عاشق ترست

(خبردار! توکل کر اپنے ہاتھ پاؤں نہ مار۔ تیرا رزق تجھ سے بڑھ کر تیرا عاشق ہے۔)

اور ایک صاحب نے اسی مضمون کو یوں نظم فرمایا ہے۔

بے مگس ہرگز نماند عنکبوت

رزق را روزی رساں پر میدہد

(عنکبوت بغیر مکھی کے ہرگز نہیں رہتا۔ رزاق وقت پر رزق پہنچاتا ہے۔)

چنانچہ مشرب فقرائے وارثی میں باعتبار دیگر قیود وشرائط کے ترک کسب مقدم اور لازمی قرار پایا ہے بلکہ ممکن ہے کہ کسی دوسری شرط کی تعمیل سے کوئی فقر مستثنیٰ بھی ہوا ہو۔ لیکن مسلمہ طور پر یہ قطعی اور حکم عام ہے۔ اور حضور نے اس کی ہدایت متواتر

فرمائی اور حقیقت یہ ہے کہ ہدایت کے ساتھ عنایت وارثی نے اپنے فیضان باطنی سے قناعت گذار گروہ فقراء کو مستفیض بھی کیا۔ اور یہ توفیق مرحمت ہوئی کہ عموماً تہبند پوش غلاموں نے اس ریاضت کے آلام وشدائد خاموشی کے ساتھ برداشت کئے۔ اور تقسیم رازق العباد کو قبول کیا۔ اور بہ کمال صبر واستقامت کارساز حقیقی کے بھروسہ پر سوال عن الناس اور تدابیر معاش سے محترز رہے اور دامن قناعت کو کسب واسباب کے بدنما داغ سے محفوظ رکھا۔ بلکہ بعض درویش تو اہل دنیا کی ہمسائیگی سے کنارہ کش ہو کر ویران پہاڑوں اور سنسان جنگلوں میں مقیم ہوئے اور اپنی بودوباش اور ضرورت معاش کو اس قدر سادہ اور محدود کیا جس کا تحمل فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ کہ جنگل کے خودرو نباتات کو اپنی غذا کے لئے مخصوص کر لیا جس کا ذکر انشاء اللہ ریاضت ومجاہدت کے بیان میں بہ تصریح نگارش کروں گا۔

قانعین فقرائے وارثی کا یہ ضبط واستقلال دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اور یہ حیرت بجائے خود بے جا بھی نہیں۔ کیونکہ ایسی اہم ریاضت میں ایسا استقلال ضرور ناممکن اور محال ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقرا کی ہرگز یہ طاقت نہ تھی کہ قناعت کے دشوار گذار راستہ میں مردانہ وار زندگی بسر کرتے اور احاطہ توکل سے باہر قدم نہ دھرتے۔ اس لئے کہ وادیٔ فقر میں عقبۂ قناعت کے مصائب اور شدائد نا قابل برداشت ہوتے ہیں۔ مگر یہ زرین کامیابی ان کو پیشوائے برحق کی نسبت کامل کی بدولت نصیب ہوئی۔ کیونکہ حضور کا مشرب حقیقی عشق ہے۔ جس کو آپ نے متواتر فرمایا ہے کہ "ہماری منزل عشق ہے"۔ اور اسی طرح یہ بھی متواتر فرمایا ہے کہ "ہماری تسلیم و رضا کی منزل ہے جو خاص اہل بیت کے گھر کی چیز ہے"۔ بظاہر یہ دونوں ارشاد مختلف

المعنی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر درحقیقت مترادف ہیں۔ چنانچہ ارباب محققین نے فرمایا ہے کہ رضا عشق کا ضمیمہ ہے اور قناعت رضا کا مقدمہ ہے۔ جیسا کہ صاحب عوارف المعارف نے لکھا ہے۔ ''قناعت مقدمہ رضا است۔ ہرکہ قانع شد مستعد نزول حال رضا گشت۔'' (قناعت رضا کا پیش خیمہ ہے۔ جو کوئی قانع ہوگیا تو رضا کا حال نازل ہونے کیلئے تیار ہوجائے۔) اور ابوسلیمان درانی علیہ الرحمتہ کا قول ہے۔ ''القناعت من الرضاء کما ان الود ع من الزهد۔'' (قناعت رضا سے ہے جس طرح ترک زہد سے ہے۔) لہٰذا مسلمہ ہے کہ حضور کی ذات بابرکات قناعت کامل کے صفات جلیلہ سے بدرجۂ اتم موصوف تھی۔ اور فقرائے تہبند پوش کا اس احتیاط اور استقلال کے ساتھ قناعت گزیں ہونا۔ اس کی عین دلیل ہے کہ جناب حضرت کے مشرب عشق صادق اور مرتبۂ رضا وتسلیم کا پرتو تھا۔ اور آپ کی قناعت کامل کا خاص کرشمہ تھا کہ اپنے غلاموں کو ایسا قانع بنا دیا۔ ورنہ ہر ایک تہبند پوش میں صفت قناعت کا ظہور اس خصوصیت سے محال تھا۔ اس لئے میں یہی عرض کروں گا۔

جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

الغرض فیضان وارثی نے اپنے فقیروں کو ایسا متوکل اور قانع بنایا کہ بالعموم کسب معاش اور سوال عن الناس سے محفوظ رہے۔ گونا قابل برداشت مصائب کا سامنا بھی ہوا لیکن بہ کمال صبر و استقلال ان سختیوں کو گوارا کیا۔ اور نہایت خوبی سے سلف صالحین کی یہ سنت جاریہ ادا کی اور رنج ومصیبت میں زبان حال سے یہی عرض کیا:۔

من بکوئے تو خوشم خانہ من ویران کن
من بہ بوئی تو خوشم نافۂ تاتار بگیر

(میں تیری گلی سے خوش ہوں۔ بے شک میرے گھر کو ویران کر دے۔ میں تیری خوشبو سے خوش ہوں۔ بے شک تو مجھ سے مشکِ تاتار لے لے۔)

لیکن ہدایت وارثی نے بعض فقرا کے واسطے ترک سوال کو اور زیادہ وسیع کیا ہے اور ایسے احکامات صادر فرمائے ہیں جن میں توکل خاص کا ذکر ہے۔ اور وہی مفہوم ہے جو حضرات عاشقین کا حقیقی مشرب تھا۔ مثلاً اکثر حضور نے فرمایا ہے کہ ''مر جائے مگر ہاتھ نہ پھیلائے اور خدا سے بھی شکایت نہ کرے۔'' اور کبھی اس مضمون کو اس طرح بھی فرمایا ہے ''اپنی تکلیف کو بیان نہ کرے خدا سب دیکھتا ہے''۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے ''سات روز کا بھی فاقہ ہو تو نہ زبان پر لائے اور نہ اللہ سے کہے''۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ ''جس کو تصدیق ہے وہ خدا سے بھی نہیں مانگتا اور سمجھتا ہے کہ جو میری قسمت میں ہے وہ ضرور ہوگا۔'' اکثر یہ فرمایا ہے ''فقیر کو چاہئے کہ اللہ سے بھی نہ مانگے کیا وہ نہیں جانتا جو شہ رگ سے بھی قریب ہے۔'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''فقیر وہ ہے جو لاطمع ہو۔ بلکہ خدا سے بھی نہ مانگے اور رضا و تسلیم پر قائم رہے۔'' اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''فقیر خدا کا عاشق ہوتا ہے اور عاشق کو چاہئے کہ وہی کرے جو معشوق کی مرضی ہو نہ اس سے مانگے نہ انکار کرے اسی کا نام رضا و تسلیم ہے۔''

حضور کے یہ احکامات جو توکل خاص کی تعلیم سے مملو ہیں اور جن میں فقرائے تہبند پوش کو ہدایت ہوئی ہے کہ خدا سے بھی اظہار حاجت نہ کرو بظاہر اس مسلک کے منافی معلوم ہوتے ہیں جس میں قاضی الحاجات کی بارگاہ میں مناجات کرنا

ممنوع نہیں ہے۔ مگر تھوڑا غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا یہ خیال ناقص ہے۔ حضرات عارفین کے مشرب میں اصولاً! مغائرت نہیں ہوتی۔ ہمیشہ ان کے اقوال و افعال ان کے درجات کے اعتبار سے گو بظاہر مختلف معلوم ہوں مگر درحقیت مآل ان کا ایک ہی اور وہی ہوتا ہے جو خدا کو پسندیدہ ہے۔ لہٰذا یہ مسلک بھی اہل حق کا ہے۔ اور مقبولان الٰہی نے طلب حاجت کے لئے بارگاہ رب العزت میں ضرور مناجات کی ہے۔ جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی کہ ''رب ارنی انظر الیک۔'' (اے میرے رب مجھ پہ نگاہ فرما، مجھے اپنے جلوہ دکھا۔ سورۃ الاعراف:۱۴۳) اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی ''رب اغفرلی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی انک انت الوھاب O'' (اے میرے رب مجھے معاف فرما اور مجھے ایسا ملک عطا فرما کہ جو میرے بعد کسی کیلئے مناسب نہ ہو۔ بے شک تو بہت عطا کرنے والا ہے۔ سورۃ ص:۳۵)

یہ دعا کرنا ان کی تصدیق کامل اور یقین واثق کے منافی ہرگز نہیں۔ چونکہ انبیا علیہم السلام اپنے زمانہ میں ہادیٔ کل تھے۔ لہٰذا ان کے اقوال اور افعال بھی وہی ہوتے تھے جو عامۃ الناس کے لئے مفید اوران کے استعداد کے مطابق ہوں۔ اس لئے ممکن ہے اگر دوسروں کی تعلیم کے واسطے یہ استدعا فرمائی تو کیا عجب ہے۔

اور ارشادات وارثی کا جو مفہوم ہے یہ مسلک حضرات عاشقین باتمکین کا ہے۔ جو بہ کمال صدق و یقین سمجھتے ہیں کہ ذات حضرت احدیت عزاسمہ علیم وخبیر ہے اور اس قادر مطلق کو جو منظور ہے وہ ضرور ہوگا۔ اور اس کا غیر محدود علم ہمارے مصالح ہم سے زیادہ جانتا ہے۔ اس لئے قضاو قدر کی مصلحت میں دخل دینے کی ہم کو حاجت نہیں

بقول حافظ شیراز علیہ الرحمتہ

جام جہاں نماست ضمیر منیر یار

اظہار احتیاج خود آنجاچہ حاجت است

(میرا جامِ جہاں نما دل مجھے یار کی صورت دکھانے والا ہے۔ اپنی محتاجی کے ذکر کی یہاں کیا ضرورت ہے۔)

ان کا یقین کامل ان کو مستغنی کر دیتا ہے۔ جیسا کہ صاحب عوارف المعارف نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے جبرئیل امین سے طلب اعانت کی نسبت فرمایا کہ۔"حسبی سوالی علمہ بحالی ۔"(میرا سوال کافی ہے کہ میرے محبوب کو میرے حال کا علم ہے۔) یہ مرتبہ عاشقان خدا اور فقرائے باصفا کا ہے چنانچہ مشہور مقولہ ہے کہ۔"الفقیر لا یحتاج الی اللّٰہ ولا الی غیرہ۔"(فقیر اللہ کے نزدیک محتاج نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کسی غیر کا محتاج ہوتا ہے۔)

حضرت شیخ نصیر الدین محمود روشن چراغ دہلی علیہ الرحمتہ نے صحائف السلوک میں "الفقیر لا یحتاج الی اللّٰہ" کی تشریح یوں فرمائی ہے کہ "اے دوست در فقر مقامے است وفقیر درآن مقام ہیچ افتقار بہ ہیچ کس ندارد۔ زیرا کہ احتیاج صفت وجوداست" (اے دوست! فقر میں ایک مقام ہے کہ فقیر اس مقام میں کسی شخص کی محتاجی نہیں رکھتا۔ کیونکہ احتیاج وجود کی صفت ہے۔) اور معدن المعانی میں لکھا ہے کہ خلق و خالق سے اظہار حاجت نہ کرنا جو اہل تصدیق کا مشرب ہے اس کی تصریح حضرت مخدوم شرف الدین بہاری علیہ الرحمتہ نے یہ فرمائی ہے کہ "درین معنی آنست از خلق میخواستند واظہار جوع میکنند شکایت دوست باغیر بودے واین جائز نہ واز حق ہم

کہ نمی خواستند از آن جہت کہ نفس دشمن و نصیب دشمن از دوست خواستن مستحق نیست۔'' (اس میں یہ معنی ہے کہ اگر مخلوق سے کچھ چاہتے ہیں اور بھوک کا اظہار کرتے ہیں تو یہ دوست کی شکایت ہے غیر کے ساتھ۔ اور یہ جائز نہیں ہے۔ اللہ سے بھی وہ نہیں مانگتے۔ اس وجہ سے کہ دشمن نفس کی نصیب کی خرابی کی دوست کو شکایت درست نہیں ہے۔)

لہٰذا فقیر جب توحید حقیقی سے آگاہ ہوتا ہے تو بہ جہت جمعیت خاطر اس کو طلب اعانت کی حاجت نہیں رہتی۔ چنانچہ مکتوبات حضرت مخدوم یحییٰ منیری علیہ الرحمتہ کے مکتوب شصت ونہم میں ہے کہ ''یکے از بزرگان گفتہ است کہ فقیر کسے است کہ اورا بر خداوند حاجت نہ باشد۔ یعنی کہ از صدق و یقین کہ دارد۔ میداند کہ روزئی او اگر چہ نخواہد حق تعالےٰ بدو رساند۔'' (بزرگوں میں سے ایک نے کہا ہے کہ فقیر وہ آدمی ہے کہ اس کو خدا سے بھی حاجت نہ ہو۔ صدق اور یقین جو وہ رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر چہ وہ نہ بھی چاہے تو اللہ اسے پہنچا دیتا ہے۔) اور امام شعرانی نے طبقاۃ الکبریٰ میں حضرت مظفر القرمیسیؒ علیہ الرحمتہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ ''الفقیر ھو الذی لا یکون لہ الی اللّٰہ حاجۃ۔'' کہ فقیر وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ سے بھی کوئی حاجت نہ ہو۔ اور یہی مضمون ہمارے حضور کے ارشادات مذکورہ کا ہے۔

چونکہ مقام توکل بہت بڑا مرتبہ ہے۔ اور قناعت میں حضرات صوفیہ کرام کی حالت ان کے درجات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے اس لئے بعض اہل معرفت بمقتضائے عبدیت اپنی حاجت حضرت احدیت میں عرض کرتے اور حق تعالیٰ جل شانہ کی کفالت چاہتے ہیں۔ جو بجائے خود بالکل درست اور مستحسن ہے۔

اور بعض اہل تصدیق جن کی قوت اختیار یہ قضاوقدر کاملہ کے آگے فنا ہوجاتی ہے وہ نور توحید مطلق کے سامنے ایسے محواور مستغرق رہتے ہیں کہ ان کو دوئی نظر نہیں آتی۔اور جملہ معاملات میں ''رضائی مولیٰ از ہمہ اولیٰ'' ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ اور وہ موحدین ''لا یحتاج الی اللّٰہ'' کے مصداق ہوتے ہیں۔

لیکن اقوال حضرات صوفیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقیر کو یہ مقام اس وقت نصیب ہوتا ہے جب وہ اپنے شہود وجود کی شہود حضرت واجب الوجود میں فنا کر کے اپنی ہستی کی فنا کے علم کو بھی فنا کرتا ہے۔اور اس کو فنا الفنا کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے جس کو اصطلاح صوفیہ میں بقاوفنائے کامل بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ صاحب صحائف السلوک نے لکھا ہے۔''چون اینجا فقیر از وجود بیرون ہیچ احتیاجش نماند۔فقرش تمام شد۔الفقر ھواللّٰہ درست آید۔'' (جب اس جگہ فقیر اپنے وجود سے باہر ہوجاتا ہے، اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے تو اس کی ضرورت نہیں رہتی۔اس کا فقر تمام ہوگیا۔فقیر اللہ کے ساتھ ہے۔ یہ بات درست ہے۔)

حضرت عارفین کے اقوال سے جب مسلمہ طور پر ظاہر ہوگیا کہ صاحب فنائے کامل ''لا یحتاج الی اللّٰہ ولا الی غیرہ'' کا مصداق ہوتا ہے۔تو شاید جناب حضرت کے مذکورہ بالا ارشادات کا خطاب بطور تعمیم نہ ہوگا۔ بلکہ یا تو حضور نے فقرا سے مخاطب ہوکر اپنے عین مسلک کے قیود بیان فرمائے ہیں۔کیونکہ ہمارے وارث پاک کے استغنائے کامل کا چاردانگ عالم میں نقارہ بج رہا ہے۔اور زمانہ معترف ہے کہ ثبات واستقلال میں بہ کمال رضاوتسلیم ''لا یحتاج الی اللّٰہ ولا الی غیرہ'' کی حقیقی شان دکھادی۔

یا حضور نے بطریق تخصیص یہ احکام صادر فرمائے ہیں۔ اور مخصوص فقراء کے حق میں یہ فرمایا ہے کہ فقیر وہ ہے جو لا طمع ہو اور اللہ سے بھی نہ مانگے اس لئے کہ متعدد فقرائے وارثی نے احکام مذکورہ کی تعمیل میں اپنی ہستی کو نیست و نابود کیا۔ جنگل میں زندگی بسر کی۔ غیر آباد پہاڑوں پر ریاضت و مجاہدت میں مشغول رہے اور جانکسل مصائب برداشت کئے۔ مگر حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ یہ لوگ ضرور اس کے مستحق اور اہل ہوں گے۔ کہ پیشوائے برحق نے **لایحتاج الی اللہ** کی تعمیل کے واسطے ان کو منتخب فرمایا ہوگا۔

کیونکہ فقرائے وارثی کی اس جماعت کثیرہ میں گو بہ لحاظ مشرب جملہ درویش ہم خیال ضرور ہیں۔ لیکن باعتبار یافت و استعداد سب کی حیثیت مساوی بھی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے لازم ہوا کہ سب کی حالت و کیفیت بھی جداگانہ ہوگی۔ اور اسی مناسبت سے پیشوائے کامل نے اپنے ہر ایک فقیر کو وہی حکم دیا ہوگا جو اس کی حالت کے متقاضی ہوگا۔ مثلاً کسی کو توکل محض کا پابند کیا ہوگا۔ کسی کے قلب کو اطمینان اور توکل کامل کی صلاحیت عطا فرمائی ہوگی۔ اور کسی کو توکل خاص کے لئے مامور فرمایا ہوگا۔ اور **لایحتاج الی اللہ ولا الی غیرہ** کے معنی سمجھا دیئے ہوں گے۔

جس طرح تقسیم خرقہ ارادت میں حضور نے طالبین کی حیثیت و استعداد کی جانب توجہ فرمائی۔ اور ان کی حالت کے لحاظ سے بعنوان مختلف ان کو خرقہ ارادت مرحمت فرمایا ہے جیسا کہ اوپر نگارش کیا۔ لہٰذا خرقہ جو محسوسات سے ہے جب کہ اس کی تقسیم میں کافی امتیاز پایا جاتا ہے۔ تو تعلیم توکل جس کو مخصوص قلب سے تعلق اور روح سے سروکار ہے۔ ضرور طالب کی یافت و استعداد کے لحاظ سے ہوئی ہوگی اور جو فقراء فنا

ہوکرھو کے سنسان اور چٹیل میدان میں پہنچے ہوں گے ان کوحضور نے **لایحتاج الی اللّٰہ ولا الی غیرہ** کاحکم دیا ہوگا۔

بلکہ اس توکل خاص کے تحت میں بعض ارشادات ایسے بھی ہیں جن میں حضور نے لوازمات توکل کا بصراحت ذکر کیا ہے۔اور اپنے فقیروں کو سمجھا دیا کہ توکل کا انحصار اسی پر نہیں ہے کہ سوال عندالناس وعنداللہ سے احتراز کرو۔ بلکہ دوسروں کے لئے بھی طلب اعانت مشرب فقر اور مسلک تسلیم ورضا کے منافی ہے۔چنانچہ آپ نے متواتر فرمایا ہے کہ۔''جوتم سے محبت کرے تم اس سے محبت کرو۔اور کسی کے واسطے دعا کرو نہ بدعا''۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ۔''فقیر کو چاہئے رضا وتسلیم پر قائم رہے۔گنڈا،تعویذ،دعا،بددعا کبھی نہ کرے۔''اور اکثر حضور نے یہ فرمایا ہے کہ۔''دعا کرنا رضا وتسلیم کے خلاف ہے۔''اور یہ ارشاد ہوا ہے کہ''فقیر نہ دوست کے واسطے دعا کرتا ہے نہ دشمن کے واسطے بددعا۔کیونکہ دوست اور دشمن کا پردہ ہے سب انھیں کا فعل ہے،جن کا ہر شے میں جلوہ ہے۔''

یہ ارشادات بالمعنی متحد اور توکل خاص کی حقیقی تعلیم سے مملو ہیں کہ فقیر کوجس طرح ذاتی خواہشات و مرادات مشیت ایزدی کے سپرد کرنا لازم ہے اسی طرح دوست ودشمن کے آرام وآلام کے لئے بھی استدعا کرنا شان فقر کے خلاف ہے۔

اور جس طرح کہ حضرت موسیٰ اور حضرت سلیمان علیہم السلام نے اپنے واسطے دعا کی۔اور حضرت خلیل اللہ نے مشیت رب العزت پر بھروسہ کیا۔اسی طرح اس کی بھی مثالیں مختلف ہیں کہ مقربین بارگاہ احدیت کا ایک گروہ دوسروں کے واسطے دعا یا بددعا بھی کرتا ہے جیسا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی نافرمان امت کے حق میں

جناب باری جل جلالہ سے عرض کیا کہ ''رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا'' (اے میرے رب نہ چھوڑ زمین پر کافروں کا کوئی شہر۔سورۃ نوح:۲۶)اور ایک مخصوص گروہ اہل اللہ کا ایسا بھی ہے جس کے مسلک میں دعا یا بددعا کرنا ممنوع ہے چنانچہ حضرت مولانا روم علیہ الرحمتہ نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے کہ وہ اہل تمکین جو ہمیشہ میدان رضاوتسلیم میں شاہد حقیقی کے سامنے سرنگوں رہتے ہیں وہ استدعاء دفع قضا میں نہیں فرماتے وہو ہذا

قوم دیگر می شناسم زاولیا
کہ زبان شان بستہ باشداز دعا
ازرضا کہ ہست رام آن کرام
جستن دفع قضاشان شد حرام
در قضا ذوقے ہمی بینند خاص
کفر شان آید طلب کردن خلاص
ہرچہ می آید برون از ملک غیب
خاص خود دانندآن بیشک و ریب

(اولیائے کرام میں سے میں ایک ایسی قوم کو بھی جانتا ہوں کہ ان کی زبان دعا کرنے سے بھی رک گئی ہے۔یعنی وہ اللہ سے دعا بھی نہیں کرتے۔وہ عزت والے اولیائے کاملین جن کو اللہ کی رضا سے سکون ہے۔اللہ کے پوشیدہ فیصلے کو دور کرنا ان کیلئے حرام ہے۔قضا میں بھی وہ ایک خاص لطف محسوس کرتے ہیں۔اور اس قضا سے چھٹکارہ حاصل کرنا ان کیلئے کفر ہے۔جو کچھ غیب سے واقع ہوتا ہے۔وہ حکم اپنے لئے خاص

سمجھتے ہیں اوراس میں کوئی شک وشبہ نہیں کرتے ۔)

حضرت مولانا علیہ الرحمتہ کے اس قول سے بخوبی ظاہر ہوگیا کہ عارفین باتمکین کاایک گروہ استدعا اور اظہارِتمنا نہیں فرماتا۔اور یہی مضمون ہمارے سرکار عالم پناہ کے اس ملفوظ کا ہے کہ ''فقیر کو چاہئے کہ رضاوتسلیم پر قائم رہےاور گنڈا،تعویذ،دعا، بددعا کبھی نہ کرے۔'' کیونکہ گنڈا،تعویذ بھی توکل خاص کے منافی ہے۔اس لئے کہ مشیت قضاوقدر کے خلاف چارہ جوئی کرنا ہے۔حالانکہ بعض سلف صالحین نے رفاہ خلق کے لئے نقش لکھے ہیں۔اوراکثر بزرگان دین نے اس کو مستحسن بھی فرمایا ہے۔ لیکن جس طرح دعا کرنا بہ لحاظ حال ومقام محمود بھی ہےاورممنوع بھی اسی طرح گنڈا اور تعویذ ہے کہ وہ اہل اللہ جن کی حالت اس کی مقتضی تھی کہ رفاہ خلق کا خیال فرماتے انھوں نے اسماء باری تعالیٰ کی تاثیرات سے دوسروں کو فائدہ بھی پہنچایا۔اورجنھوں نے رضائے ایزدی کے آگے سرتسلیم خم کیاانہوں نے گنڈے تعویذ سے بھی ہمیشہ احتراز فرمایا۔

چنانچہ امام غزالی علیہ الرحمتہ نے احیاء العلوم باب توحید وتوکل میں لکھا ہے کہ جناب سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ جس شخص نے تعویذ کرایایا داغ دیا۔اس نے توکل نہیں کیا۔پھر امام موصوف نے ایک حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ہر چند ایسا تعویذ جو آیات قرآنی سے لکھا جائے وہ جائز ہے۔مگر توکل کی شان یہ ہے کہ اسباب ماسوئ اللہ کا خیال بھی نہ آئے۔

غرض توکل بام فقر کا خاص زینہ ہے جو سالک کو بام لی مع اللہ تک پہنچاتا ہے۔کیونکہ توکل کی اصل توحید جناب باری کی تصدیق ہے۔اورحضرت احدیت جل

جلالہ کی وحدانیت کی تصدیق کامل ہی کا نام فقر ہے جس کو عشق بھی کہتے ہیں۔اس لئے کہ توکل نفس کا مجاہدہ ہے کہ جملہ خواہشات و مرادات مالک حقیقی کی رضا و مشیت پر موقوف ہوں۔اور تعلقات ماسوی اللہ سے انقطاع کامل ہو جو بغیر محبت صادق حاصل نہیں ہوسکتا۔لہٰذا عارفین نے طالب صادق کے لئے توکل کی تعلیم کو مقدم فرمایا ہے۔ جیسا کہ ہمارے سرکار عالم پناہ نے اپنے تہبند پوش فقراء کو اس ریاضت شاقہ کی ہدایت فرمائی۔اور شفقت وارثی نے بکمال صراحت سمجھا دیا کہ سوال نہ کرنا، سبب و اسباب کو ذریعہ معاش نہ بنانا۔رضا و تسلیم پر قائم رہو۔کسی کے واسطے دعا و بددعا نہ کرو۔

بلکہ جناب حضرت نے تکمیل مدارج زہد کی تصریح میں قناعت کے ان فروعات کی بھی تفصیل فرمائی جو بظاہر بہت معمولی معلوم ہوتے ہیں۔لیکن درحقیقت نہایت مفید اور ضروری ہیں اور بغیر ان کے زاہدین کا دستور العمل مکمل نہیں ہوسکتا۔اس لئے حضور نے اپنے متوکل ارادت مندوں کو سمجھا دیا کہ تعلقات کے انقطاع کے واسطے لازمی ہے کہ ضروریات روزمرہ کو بھی محدود اور مختصر کرو جس طرح اہل دنیا کے مکلّف لباس کو چھوڑ کر سادہ اور آزادنہ لباس تم نے اختیار کیا ہے۔اسی طرح طرز معاشرت بھی تمہارا اغنیاء کے طرز معاشرت سے بالکل جداگانہ اور تکلفات سے معرا ہو۔

چنانچہ فقرا سے مخاطب ہوکر اکثر مجملاً اور اکثر بصراحت ارشاد فرمایا کہ ’’تخت پلنگ، مونڈھے، کرسی پر نہ بیٹھنا‘‘ اور اکثر یہ فرمایا ہے کہ ’’انسان کا خمیر خاک سے ہوا ہے۔اور خاک ہی میں اسکو ملنا ہے۔تو فقیر کو چاہئے کہ انجام کو دیکھے اور زمین ہی کو اپنا بستر بنائے۔‘‘ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ’مونڈھے کرسی پر بیٹھنے سے رعونت آتی ہے جو فقیر

کے واسطے زہر ہے۔'' اور اکثر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''فقیر ہمیشہ زمین پر سوتے ہیں۔'' اور یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ''زمین پر بیٹھنا خاکساری کی دلیل ہے۔'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ۔ ''جن کا ذکر دائمی ہوتا ہے وہ زمین پر سوتے ہیں۔'' اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''زمین پر سونا اور زمین پر بیٹھنا ہمارے دادا کی سنت ہے۔''

طالب راہ فقر کے لئے ہدایات مذکورہ کی تعمیل ضروری ہے۔ و نیز لوازمات توکل کی تکمیل بھی اسی پر منحصر معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ زمین پر سونا اور بیٹھنا عین آزادی ہے اور یہ مسلمہ ہے کہ سامان تکلف اور اسباب راحت کا انتظام تفریغ خاطر کے صریح منافی ہے۔ فقیر کی جمعیت خاطر اسی وقت ہوتی ہے۔ جب تعلقات سے آزاد ہو۔ اس واسطے ہادی برحق نے اصول فقر کے مطابق اپنے تہبند پوشوں کو معاشرت کا طریقہ بھی بتا دیا۔ تاکہ حصول مراد میں ان کو آسانی ہو۔ اور تکلفات کے خراب اثر سے محفوظ رہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی یہ ہدایت کہ زمین کو اپنا فرش بناؤ متوکلین اہل ارادت کے لئے کس قدر مفید ہے۔ اور علاوہ باطنی مفاد کے ظاہری نتائج بھی اس کے بہترین خوبیوں سے مملو ہیں۔ اس لئے کہ اول تو اس طرز معاشرت میں اسباب آرائش و آسایش سے منافرت کا حکم ہے جو زاہد کے لئے لازمی ہے۔ کیونکہ فقیر کو دنیاوی تعلقات سے ہمیشہ تکلیف ہوتی ہے بلکہ زہد کامل کا نتیجۂ آخری تو یہ ہے کہ طلب راہ مطلوب میں زاہد پختہ خیال اسباب عیش و آرام سے رنجور۔ اور صدمات ہجر یار سے مسرور ہوتا ہے۔ بقول

گردیگران بعیش و طرب خرم اند و شاد

مارا غم نگار بود مایۂ سرور

(اگر دوسرے لوگ زندگی کے عیش وعشرت کے لحاظ سے خوش وخرم ہیں تو ہمارے لئے بھی محبوب کا غم خوشی کا سرمایہ ہے۔)

دوم یہ کہ اس طریق معاشرت سے خصائل ذمیمہ یعنی رعونت ونخوت، کبرو غرور کا سدباب ہوتا ہے۔ سوم طبیعت ایثار وانکساری کی عادی ہوتی ہے۔ جس کی طالب راہ فقر کو خاص ضرورت ہے۔ چہارم حضرات صوفیہ نے بہ لحاظ ادب ذکر الٰہی کے واسطے زمین ہی کی نشست کو اختیار فرمایا ہے۔ اس وجہ سے بھی فقرائے وارثی کا بستر زمین پر ہونا چاہئے کیونکہ حضور نے متواتر اور بتاکید فرمایا ہے کہ ''فقیر وہ ہے جس کی کوئی سانس خالی نہ جائے۔'' اگر توفیق الٰہی سے یہ حالت نصیب ہے تو ذکر خداوندی کا آداب مقتضی ہے کہ ہمیشہ زمین پر بستر ہو۔ پنجم علاوہ دیگر مفاد کے زمین پر سونا اور بیٹھنا فقرائے وارثی کے فخر ومباہات کے واسطے بھی کافی ہے۔ کیونکہ ہمارے مبدۂ فیض اور منبع فقر کی خاص سنت ہے شاید اسی وجہ سے مصلحت وارثی نے اپنے تہبند پوش غلاموں کے حق میں تخت، پلنگ مونڈھے اور کرسی کی نشست کو ممنوع گردانا۔ تاکہ زمرہ مقلدین مرتضویؑ ومتبعین مصطفویؐ میں یہ داخل ہوں۔

بلکہ خود جناب حضرت نے اپنے جدامجد کی اس سنت خاص کو بکمال اہتمام ادا کیا اور ہمیشہ زمین کا فرش پسند فرمایا۔ اور تخت وپلنگ وغیرہ سے اس درجہ نفرت تھی کہ دیکھنا بھی ناگوار خاطر ہوتا تھا۔ چنانچہ ارادت مندان وارثی کا دستور تھا کہ جب سرکار عالم پناہ کو اپنے گھر میں لے جاتے تھے تو اس کا بھی اہتمام ضرور کرتے تھے کہ تخت پلنگ وغیرہ پیش نظر نہ ہوں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جس گھر میں حضور نے پلنگ

دیکھا تو منغض ہوکر فوراً واپس آئے۔

لہٰذا تخت پلنگ وغیرہ کی نشست جناب والا نے قطعی ممنوع ومتروک گردانی۔ اور زمین پر سونا اور بیٹھنا فقراء کے مسلک میں داخل فرمایا اور مرشد برحق کی اس تاکیدی ہدایت کی تعمیل جملہ فقرائے وارثی نے بھی کی۔اور ہمیشہ کے لئے زمین کا فرش اختیار کیا۔ بلکہ حالت مجبوری میں بھی ان کے اس خیال میں کامل استقلال رہا حتیٰ کہ اپنے احباب سے اگر فقرا نے آخری وصیت کی ہے تو یہی کی ہے کہ ہماری لاش کو پلنگ پر نہ لے جانا۔

بلکہ ایک تہبند پوش نے میلادخوانی کے وقت چوکی پر بیٹھنے کی اجازت چاہی تھی۔جس کو حضور نے ناپسند فرمایا۔اورارشاد ہوا کہ جائے نماز یا ممتاز فرش طاہر پر بیٹھ کر پڑھا کرو۔اس سے ظاہر ہوگیا کہ حضور نے تحفظ مسلک میں کامل اہتمام فرمایا کہ ایک تہبند پوش کو وہ بھی خاص وقت کے لئے اس کی اجازت نہیں دی کہ چوکی پر بیٹھا کرو۔

اوراگر کسی تہبند پوش سے اس فرمان وارثی کی تعمیل میں لغزش واقع ہوئی تو پیشوائے برحق نے تنبیہہ وتہدید فرمائی۔اورعرصہ تک وہ معتوب رہا۔اوراس کے معاصرین فقرا نے بھی اس کے اس ارتداد کو منافی مسلک تصور کیا۔اوراس کو تحقیر کی نظر سے اس لئے دیکھا کہ اس نے ہدایت وارثی کی نافرمانی کے ساتھ حضوراقدس کی تقلید سے بھی روگردانی کی اوروہ متروکات جن کا دیکھنا بھی جناب حضرت کو ناپسند ہوا ان کو تہبند پوش ہوکر استعمال کیا اور خرقہ وارثی کے ساتھ بےادبی کی۔

ان تمام وجوہات سے فرمان وارثی کی تعمیم ظاہر ہوگئی۔اورمعلوم ہوگیا کہ

تخت پلنگ مونڈھے کرسی وغیرہ کی نشست مسلک فقراء میں قطعی ممنوع ہے۔اوراس حکم کی تعمیل کے لئے جملہ تہبند پوش بغیر کسی فرق وامتیاز کے مکلّف اور مامور ہیں اور شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ سرکار عالم پناہ نے مخصوص طور پر مجھ سے یہ خطاب نہیں فرمایا ہے کہ تخت، پلنگ، مونڈھے، کرسی پر نہ بیٹھو۔تو یہ خیال اس وجہ سے درست نہ ہوگا کہ فقرائے وارثی کا جب دستور العمل یہی ہے۔تو جملہ تہبند پوشوں کی ایک حیثیت ہے اوراس حکم کی تعمیل سب کو یکساں لازم ہوگی۔

علاوہ اس کے پیشوائے برحق کی عادات کو دیکھنا چاہئے کہ نشست و برخاست، ملفوفات وملبوسات، مطعومات ومشروبات میں حضور اقدس نے کیا اختیار کیا اور کس سے احتراز فرمایا پس جس چیز کو ہادی کامل نے منظور اور پسند کیا ہو۔وہ متبعین کے واسطے جائز ہے اور جس چیز سے احتراز فرمایا ہو وہ متبعین کے لئے بھی ممنوع ہوگی۔ اور جب کہ حکم قطعی موجود ہو تو بجز تسلیم کرنے کے چارہ نہیں۔ بلکہ حضرات صوفیہ کرام نے مرید صادق کے لئے پیر طریقت کے ارشادات کی تعمیل کو اس تاکید کے ساتھ واجب گردانا ہے کہ ہر چند کسی ارشاد کا مفہوم اگر تمہارے نصب العین کے خلاف ہی کیوں نہ ہو مگر مقتضائے اطاعت یہی ہے کہ اس حکم کی بھی تعمیل کے لئے ہمہ تن اور بصدق ویقین آمادہ ہو جاؤ بقول حافظ شیرازیؒ:۔

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بیخبر نبود زراہ و رسم منزلہا

(اگر تجھے پیر مغاں کہے تو شراب سے اپنے مصلے کو رنگین کر دے۔ کیونکہ اللہ کے راستے پر چلنے والا سالک اپنی منزل کے راہ ورسم سے بے خبر نہیں ہوتا۔)

ممکن ہے کہ ایسے احکام کی تعمیل میں شاید اہل ظواہر کو پس ہو لیکن ہمارے سلف صالحین نے اتباع خاص کی تعریف میں یہی فرمایا ہے کہ مرید کو بہ کمال خلوص پیر طریقت کی اطاعت میں ایسا غلو ہو کہ معلومات و معقولات کے جملہ وسائل و دلائل پیر کے ہدایات و ارشادات کے روبرو محو اور فنا ہو جائیں۔ اور یہ غلو کسی صلہ اور معاوضہ کی غرض سے نہ ہو۔ بلکہ مرشد کو حاکم حقیقی سمجھے اور بہ حیثیت محکوم اس کے جملہ احکام کو فرض عین جانے۔ اور ہدایات کے حسن و عیوب اور ان کی ممنوعیت و مشروعیت کے توہمات و تخیلات کے تردد و تکدر سے قلب کو محفوظ رکھے۔ کیونکہ درحقیقت اہل ارادت کو پیر طریقت کے حکم میں تحقیق و تدقیق کی حاجت ہی نہیں۔ اس لئے کہ حضرات عارفین اپنے مسترشدین کی وہی تعلیم فرماتے ہیں جو نزد معبود بالیقین مستحسن و محمود ہوتی ہے چنانچہ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔

اولیا اطفال حق اند اے پسر　　دَر حضور و غیب آگاہ از خبر
پاسبان　آفتابند　اولیا　　دُر　بحر　علم　اسرار　خدا

(اے لڑکے! اولیائے کاملین اطفالِ حق ہیں۔ حضوری اور غیابت میں یہ آگاہ ہوتے ہیں۔ اولیاء اللہ حفاظت کرنے والے سورج ہیں۔ علم کے سمندر کے اعلیٰ موتی ہیں۔)

اور حضرات محققین نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ جس طرح ارشادات پیشوائے برحق کی تعمیل مرید صادق کے لئے مفید ہے اور رہبر کامل کے افعال و عادات کی تقلید اگرچہ وہ مخصوص نہ ہوں تو اہل ارادت کو فیضان الٰہی سے فائز اور مستفیض کرتی ہے۔ اس لئے کہ عارفین کا ارادہ بھی ارادہ اللہ کے سامنے فنا ہو جاتا ہے۔ اور کوئی فعل مراد مصلحت حق کے خلاف نہیں ہوتا۔

چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمۃ نے طبقاۃ الکبریٰ میں فرزند سید محمد وفا قدس سرہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے:۔"یقول الفلاح المریدین استاذہ ثلاث علامان ان یحبہ بالا یثار و یتلقی منہ کل ماسمع منہ بالقبول و یکون معہ فی شیؤ نہ کلھا بالموافقۃ" یعنی مرید کے کامیاب ہونے کی تین علامتیں ہیں۔ پیر کو سب سے زیادہ دوست رکھے اور پیر جو کچھ کہے اس کو مان لے اور پیر کے کل شیؤن میں از راہ موافقت اسی کے ساتھ رہے۔

فرزند سید محمد وفا علیہ الرحمۃ کے اس قول سے بخوبی ظاہر ہوگیا کہ پیر کے اقوال وافعال کی تعمیل وتقلید مرید صادق کی کامیابی کا خاص ذریعہ ہے۔ لیکن صاحب مراۃ الاسرار نے اس مسئلہ کی اور زیادہ وضاحت فرمائی ہے۔ اور صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ متابعت پیر طریقت حضرات صوفیہ کا عین مسلک ہے۔ ہر چند وہ اقوال وافعال بہ لحاظ ظاہر خلاف مذاہب ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ آپ ارقام فرماتے ہیں کہ "سلطان المشائخ شیخ نظام الدین بدایوانی و دیگر پیران چشت اقدس اللہ اسرارہم در معاملات اکثر اقتدا بمذہب ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ واشتند د۔ ومن ہم دراں مذہب ام۔ ولیکن سماع کہ در مذہب او حرام است آنرا موافق مشرب پیران خود می شنیدند۔" (سلطان المشائخ شیخ نظام الدین بدایونی اور ہمارے دوسرے پیرانِ چشت اکثر معاملات میں امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کی اقتدا کرتے ہیں۔ اور میں بھی یہی مذہب رکھتا ہوں۔ لیکن سماع کہ جو آپ کے مذہب میں حرام ہے اس کو اپنے پیران طریقت کے مشرب کے مطابق سنتے ہیں۔)

صاحب مراۃ الاسرار نے مخدومان چشت کے صحیح حالات کے حوالہ سے سمجھا

دیا کہ پیران طریقت کے افعال وعادات کی خلوص وعقیدت کے ساتھ حضرات صوفیہ عظام نے تقلید کی ہے باوجود یکہ اس کا علم تھا کہ یہ عادات ہمارے مذہب کے منافی ضرور ہیں۔لیکن پیر طریقت کی تقلید کو امام شریعت کی متابعت پر ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ اسی کے بعد آپ استدلال کے ساتھ لکھتے ہیں کہ پیر طریقت کی تقلید مرید کا خاص مشرب ہے وہو ہذا ''سید اشرف جہانگیر سمنانی کہ بدو واسطہ ارادت وخلافت از سلطان المشائخ دارد وجمیع عقائد صوفیہ را در لطائف اشرفی ومکتوبات خود از فتوحات مکی دیگر کتب معتبر این طائفہ انتخاب کردہ بطریق واضح فرمودہ کہ تمام مدار افعال واحوال این طائفہ بر متابعت پیر است۔وبحکم الصوفی لا مذہب لہ ایشان را مذہبے ومشربے نمی باشد الا مذہب ومشرب پیران خود کہ در کار ایشان بر نصوص بودہ است۔'' (سید اشرف جہانگیر سمنانی کہ جو حضور سلطان الاولیاء سے ارادت اور خلافت رکھتے ہیں۔اور صوفیاء کے تمام عقائد میں لطائف اشرفی اور اپنے مکتوبات میں فتوحات اور دیگر معتبر کتابوں سے انتخاب کیا ہے۔اور اس طریق کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ اس طائفہ کے اعمال اور افعال کا دارومدار پیر کی اتباع پر ہے۔اور صوفی وہ ہوتا ہے کہ جس کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو۔سوائے پیر طریقت کے مذہب ومشرب کے۔اپنے کاموں میں اسی پر عمل کرے۔)

اس ارشاد سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عادات پیران طریقت کی تقلید اس وجہ سے لازمی ہے کہ محققین اسرار حقیقت امر حق کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے۔اس لئے ان کے افعال واحوال رموز حقانیت سے مملو ہوتے ہیں۔چنانچہ مولانا فرماتے ہیں۔

شیخ کو بنظر بنور اللہ بود　　　ازنہایت و زنخست آگہ بود

ہر کہ او خوئے ولی حق گرفت　　　نورگشت و تابش مطلق گرفت

(شیخ کہ جواللہ کےنور سے دیکھتا ہے وہ ابتدااورانتہا سے آگاہ ہوتا ہے۔ جوشخص اللہ کے ولی کی عادت اختیار کر لیتا ہے وہ نور ہو جاتا ہے اوراس نے گویامکمل روشنی حاصل کر لی۔)

بلکہ بعض عارفین نےتعمیل احکام سےتقلید افعال واحوال کومقدم فرمایا ہے۔ چنانچہ صاحب طبقاۃ الکبریٰ نے لکھا ہے کہ شیخ احمد بن الحسین رفاعی علیہ الرحمتہ جن کا مشاہیرصوفیہ میں شمار ہوتا ہےارشادفرماتے ہیں کہ 'یقول من لم ینتفع بافعالی لم ینتفع با قوالی ۔''جس نے میرےافعال سےفائدہ نہ اٹھایااس نے میرےاقوال سےفائدہ نہ اٹھایا۔

علاوہ اس کےتقلید شیخ کی اہمیت روایات شرعیہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ امام غزالی علیہ الرحمتہ نے احیاءالعلوم میں تقلید شیخ کااس حدیث سے استدلال فرمایاہے کہ''الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ''مولاناعلیہ الرحمتہ بھی یہی فرماتے ہیں:۔

گفت پیغمبر کہ شیخ وقت خویش　　　چون نبی باشدمیان قوم خویش

قول اِن من اُمتہ را یاد گیر　　　تا بہ الا و خلا فیھا نذیر

(نبی پاکؐ نے ارشادفرمایا کہ شیخ اپنے وقت میں اپنی قوم میں نبی کی طرح ہوتا ہے۔ ''کوئی ایسی امت نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی ڈرسنانے والا نہ ہو''اس بات کو یاد کر۔)

بلکہ ہادی برحق کےاقوال وافعال کی تعمیل اورتقلید مرید صادق کی اس لئے

بھی ضرور کرنا ہوتی ہے کہ اس کے خلوص وعقیدت کا حقیقی نام عشق ہے۔ اور عشق کا خاصہ ہے کہ خواہشات عاشق کو مغلوب کرتا ہے اور اثر عشق سے قلب عاشق میں عظمت معشوق ایسی جاگزین ہوتی ہے جو اطاعت پر مجبور کرتی ہے لہٰذا مرید صادق اضطراری میں پیشوائے کامل یعنی اپنے شاہد حقیقی کے احکام واقوال کی تعمیل وتقلید پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ محققین حضرات صوفیہ کرام نے ارقام فرمایا ہے کہ صفات عشق متعدد ہیں۔ اور جس موقع پر جس صفت کا اظہار ہوتا ہے تو بلحاظ مواقع اس کے اصطلاحی نام بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔ اور یہی عشق اس موقع پر اس نام سے پکارا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابن منصور حلاج علیہ الرحمتہ نے اپنی مثنوی میں بہ کمال صراحت ارشاد فرمایا ہے۔

آن یقین ہست ایمان قوی
ہست ایمان عشق دان اے مولوی
عشق را خود می نہ جنبا ندگذر
برنگرد و عشق ازخوف و خطر
گر پدر راعشق باشد از پسر
شفقتش نام اندوہم مہر پدر
شوہرے را عشق چون بازن فتاد
ہم محبت نام در عالم نہاد
گر پسر را عشق شد با مادریں
شد سعادت نام آن بے ریب درین

گر مریدے رانہ پیر عشق اوفتاد
نام آن گویند نیکو اعتقاد
گر کسے رابا خداشد عشق بان
نام آن در شرع ایمانش بخوان
در طریقت نام آن باشد یقین
کزیقین دار د تعلق کا ردین
آن یقین درمعرفت چون محوخودرسید
عشق میگو یند نامش اہل دید

(یہ یقین اور ایمان کامل ہے، اے مولوی یہ عشق کا ایمان ہے۔ اپنے عشق میں وہ متزلزل نہیں ہوتا اور جو بھی تکلیف آئے وہ گذر جاتا ہے۔ عشق کے خوف وخطر کی وجہ سے وہ پیچھے مڑ کے نہیں دیکھتا۔ اگر باپ کو بیٹے کا عشق ہوتو باپ سے جو کچھ بیٹے کے حق میں واقع ہووہ شفقت اور محبت ہے۔ خاوند کو جب اپنی عورت سے عشق ہو جائے تو اس کا نام محبت اس دنیا میں ہے۔ اگرلڑ کے کو والدین سے عشق ہو جائے تو اس کا نام بلا شک وشبہ سعادت ہے۔ اگر کسی مرید کو پیر سے عشق ہو جائے تو اس کا نام حسن اعتقاد ہے۔ اگر کسی کو خدا کے ساتھ عشق ہو جائے تو اس کا نام شرع میں ایمان رکھتے ہیں۔ طریقت میں اس کا نام یقین ہے کہ یقین سے دین کے کام کا تعلق ہے۔ وہ یقین جب اپنی معرفت میں پہنچ جاتا ہے تو اس کا نام اہل دید عشق رکھتے ہیں۔)

حضرت ابن منصور کی اس تفصیل مدارج سے ظاہر ہوگیا کہ یہی عشق جب باپ کی جانب سے ہوتا ہے تو اس کو شفقت اور مہر پدری کہتے ہیں۔ اور اگر بیٹے کی

طرف سے ہوتو اسکا نام سعادت ہوگا اور پیر سے عشق ہوتو اسکو عقیدت کہیں گے۔اور خدا کے عشق کا نام شریعت میں تو ایمان اور طریقت میں یقین اور معرفت میں عشق ہے۔

غرض احکام پیر کی تعمیل ہو یا افعال پیشوا کی تقلید درحقیقت مرید صادق سے بہ اقتضائے محبت وقوع پذیر ہوتی ہے جو اس کی ارادت کا عین نتیجہ ہے۔اور اسی واسطے اس اطاعت کو لازمی گردانا ہے کہ اگر مرید واثق ہے تو ضرور محبت کے جوش میں پیر کا فرمان بردار رہے گا۔ کیونکہ ارادت اور بیعت کا بھی مدار پیر کی محبت پر ہے۔ چنانچہ حضرت سلطان المشائخ علیہ الرحمتہ کے ملفوظ موسومہ فوائد الفواد میں ارادت مرید کی یہ تعریف فرمائی ہے کہ ''ارادت و بیعت عبارتیست از عشق ومحبت پیر۔'' اور اسی وجہ سے مرید عقیدت مند کامیاب اور فائز المرام ضرور ہوتا ہے کہ درحقیقت اس کو پیر سے محبت ہوتی ہے اور محبت کا یہ نتیجہ لازمی ہے کہ ادنیٰ کو اعلےٰ بناتا ہے اور بے واسطہ محبّ کو محبوب سے ملاتا ہے۔جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ''**المرء مع من احب** '' کہ جو جس سے محبت رکھتا ہے وہ اسی کے ساتھ ہوگا۔

اگر شبہ ہو کہ ایک معمولی اور بدکردار شخص کسی صاحب مراتب علیا سے محبت کرے گا تو وہ گنہگار اس برگزیدہ خدا کی معیت میں کیونکر ہوسکتا ہے۔تو حضرت خاتم النبیین حبیب رب العالمین ﷺ نے ہم کو اس کی بھی بشارت دی ہے۔اور سنن ابی داوٗد میں منقول ہے کہ ابوذر غفاری رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عرض کیا ''**یا رسول اللّٰہ الرجل یحب القوم ولا یستطیع ان یعمل کعملھم** '' یارسول اللہ ﷺ ایک شخص ایک قوم سے محبت رکھتا ہے۔مگر ان کے مثل عمل نہیں کرسکتا۔'' **قال انت یا ابا**

ذر مع من احبت ''ارشاد ہوا کہ اے ابوذرتو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔''قال فانی احب اللّٰہ و رسولہ ''۔ابوذر نے عرض کیا کہ میں خدا اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔''قال فانک مع من احببت ''۔رحمت اللعالمین ﷺ نے فرمایا کہ اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔''قال فاعادھا ابو ذر فاعادھا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ''پھر مکرر ابوذر نے وہی عرض کیا اور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے وہی جواب دیا۔

اس حدیث سے وہ خدشہ بھی جاتا رہا اور معلوم ہوگیا کہ محبت صادق ادنےٰ و اعلیٰ کے فرق و امتیاز کو مٹا دیتی ہے اور انسان کی رسائی جہاں محال اور ناممکن ہو وہاں اسکی محبت اس کو پہنچا دیتی ہے۔تو ہر چند مرید اپنے پیر کو جملہ افراد عالم میں بہترین فرد جانتا ہے۔مگر اپنے پیر کا گرویدہ ہوگا تو ضرور ہے کہ معیت پیر اس کو نصیب ہوگی۔اور محبت پیر کی دلیل صرف مرید کی عقیدت ہے بقول حضرت ابن منصور علیہ الرحمتہ۔

گر مریدے را بہ پیر عشق اوفتاد
نام آن گویند نیکو اعتقاد

(اگر کسی مرید کو پیر سے عشق ہو جائے تو اس کا نام حسن اعتقاد ہے۔)

اور عقیدت کا اظہار اتباع و تقلید سے ہوتا ہے۔اس لئے مرید صادق کو رہنمائے برحق کے احکام کی تعمیل اور پیشوائے کامل کی تقلید لازمی ہے۔کیونکہ اسی اطاعت سے طالب خدا کامیاب اور فائز المرام ہوتا ہے۔بقول

بطاعت کوش گر عشق بلا انگیز میخواہی
متاع جمع کن شاید کہ غارتگر شود پیدا

(اطاعت کرنے میں کوشش کر۔ اگر تو بے پناہ عشق چاہتا ہے۔ ساز و سامان اکٹھا کر کہ شاید کوئی لوٹنے والا ظاہر ہو ہی جائے۔)

اور تقلید کی یہی صورت ہے کہ جس چیز کا استعمال ہادی برحق نے پسند کیا ہو۔ مرید کے واسطے بھی اس کا استعمال جائز ہے اور جس چیز سے مشربا احتراز کیا ہو اس کا استعمال مرید کے لئے قطعی ممنوع ہے۔

الغرض جب ثابت ہوگیا کہ ہادئ راہ طریقت کے اقوال و افعال کی تقلید مسترشدین کو لازم ہے تو یہ خیال کہ جناب حضرت نے مخصوص طور پر مجھ سے یہ نہیں فرمایا کہ تخت، پلنگ، مونڈھے کرسی پر نہ بیٹھنا کافی دلیل نہیں۔ بلکہ عذر بارد ہے۔ اور اقتضادئے ارادت مندی یہ ہے کہ جس طرح تعمیل احکام میں کوشش اور مستعدی کی جائے اسی طرح تقلید افعال میں اگرچہ مخصوص نہ ہوں جدوجہد ضروری ہے اور جبکہ بخوبی معلوم ہے کہ تخت، پلنگ وغیرہ کی نشست مشرب وارثی میں متروک ہے تو لازم ہوا کہ پیشوائے برحق کی تقلید میں وارثی خرقہ پوش بھی تخت پلنگ وغیرہ سے قطعی متنفر اور محترز رہیں۔ البتہ وہ فقرا ضرور اس کلیہ میں نہیں آتے ہیں جن کو مخصوص طور پر کسی شرط کی پابندی سے مستثنیٰ فرمایا ہو۔ ورنہ عموماً یہی کہا جائے گا کہ وہ قیود جن کا درحقیقت مشرب وارثی سے گہرا تعلق ہے۔ خواہ تعمیلاً ہو خواہ تقلیداً ان کی پابندی ضروری ہے۔

کیونکہ آقا کے حکم کی تعمیل غلام کا فرض منصبی ہے اور مرید اپنے پیر کا قطعی غلام ہے اسلئے لازم ہوا کہ مرید اطاعت پیر میں ہمہ تن مصروف رہے۔ بلکہ احکام پیر کی کلیتاً تعمیل تو اسی وقت ہوگی جب مرید عقلاً و نقلاً پیر کو اپنا ولی کل اور شاہد کل سمجھے۔ اور ہستی پیر کے سامنے اپنی ہستی کو نیست و نابود کرے۔ اور "موتوا قبل ان تموتوا۔"

(مرنے سے پہلے مرجاؤ۔) کا مصداق ہوجائے یہی ایک طریقہ ایسا ہے جو طالب دیدار کو جوار یار تک پہنچاتا ہے۔ بقول

یک قدم برجان خود دیگر قدم درکوئے دوست

عاشقان را درجہان بہتر ازین رفتار نیست

(ایک قدم اپنی جان پر اور دوسرا دوست کی گلی میں ہوتا ہے۔ عاشقوں کیلئے اس جہان میں اس سے بڑھ کر کوئی رفتار نہیں۔)

خصوصاً وہ شرائط وقیود جن کی پابندی میں ہر دو مفاد مضمر ہوں کہ احکام کی تعمیل بھی اور افعال کی تقلید بھی ان کی بجا آوری تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہے۔ چنانچہ اسی قبیل سے مسئلہ تجرید بھی ہے۔ جناب حضرت نے تجرید کی متواتر تاکید بھی فرمائی۔ اور بہ نفس نفیس تجرد کے تمامی مدارج کا تکملہ فرما کر اپنے فقرا کے واسطے مثال قائم کر دی۔ چنانچہ بار ہا ارشاد فرمایا کہ ''ہم لنگوٹ بند ہیں۔'' اس لحاظ سے غلامان خرقہ پوش کی تجرید عین پیشوائے برحق کی تقلید بھی ہے اور تعمیل اس وجہ سے ہے کہ حضور نے اپنے فقراء سے تجرید کی ہدایت بھی فرمائی ہے۔ مثلاً کبھی فقرا سے مخاطب ہو کر یہ ارشاد ہوا کہ ''فقیر وہ ہے جو اکنگ رہے''۔ اور فرمایا کہ ''فقیر کو چاہئے کہ جورو، بچوں کی محبت میں نہ پھنسے۔'' اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''زن، زمین، زر میں جھگڑا ہے ان کو چھوڑے تو آزاد ہو۔'' یہ بھی فرمایا ہے ''عورت فساد کا گھر ہے۔'' یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''فقیر کو چاہئے کہ دنیا کی عورتوں کو ماں بہن سمجھے۔'' اور اکثر فرمایا ہے کہ ''ہم نے شادی نہیں کی۔''

ارشادات مذکورہ میں صاف صاف تجرید کی تاکید اور آزادی کی ہدایت ہے

اس لئے فقرائے وارثی کا غیر متاہل رہنا احکام پیشوا کی پوری تعمیل بھی ہے کہ ہادی برحق نے بلحاظ مشرب اپنے خرقہ پوش غلاموں کے واسطے آزاد اور مجرد رہنا لازمی گردانا ہے۔ بلکہ یہ شرط تجرید ایسی قطعی اور ضروری ہے کہ فقرائے وارثی کے دستور العمل میں خصوصیت کے ساتھ درج ہوئی، کہ تہبند کے ہمراہ لنگوٹ بھی ملتا تھا اور بندھوایا جاتا تھا۔ حتےٰ کہ خرقہ وارثی کا تکملہ لنگوٹ پر موقوف ہے۔ جس کی ہمیشہ سختی سے نگرانی اور باز پرس ہوتی تھی چنانچہ یہ شرط تجرید غیر معمولی طور پر اس قدر مشہور ہوئی کہ جو شخص حضور کے نام نامی سے واقف ہے وہ جناب حضرت کے تجرید کامل سے بھی خبردار ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ آپ کے فقرائے تہبند پوش آزاد اور غیر متاہل ہیں۔

اور درحقیقت یہی ہوا کہ سرکار وارثی سے جس طالب خدا کو تہبند اور لنگوٹ مرحمت ہوا اس نے تعلقات زن وفرزند ضرور منقطع کئے۔ اور بکمال استقلال ہمیشہ مناکحت اور مواصلت سے احتراز کیا۔ اور تمام عمر مجرد وآزاد رہا۔ بلکہ فقرائے وارثی اگر اپنے تجرد پر فخر ومباہات کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ پیشوائے کامل کے تصرف سے اس مجاہدہ میں ان کو پورا ثبات نصیب ہوا۔

اور جناب حضرت نے تجرید کے مفاد میں جس قدر ارشاد فرمائے ہیں ان سے تجرد کی عجیب شان اور مجردین کا مخصوص تقرب ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ تو مسلمہ ہے کہ تجرد عشق کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور ایسے ممتاز اور برگزیدہ حضرات نے تجرد اختیار فرمایا ہے جن کے شرف واختصاص کا زمانہ معترف ہے۔

لیکن یہ خدشہ کہ مناکحت کی ترغیب روایات شرعیہ میں ہے۔ لہٰذا اگر تجرید بہتر اور مفید ہوتی تو معلمین شریعت مناکحت کی تاکید نہ فرماتے اور نہ بزرگان دین

متین متاہل ہوتے۔اس لئے احتراز مناکحت ترک سنت ہے۔اور یہ جائز نہیں۔

اس کی نسبت یہ عرض کروں گا کہ یہ خیال بھی اس وجہ سے بے جانہیں کہ قانون شریعت میں جواز مناکحت ضرور ہے۔اوراس کے نفس جواز میں اسلام کے کسی فرقہ کو عذر نہیں۔کیونکہ عالم اسباب کا قیام زن ومرد کے ازدواج پر موقوف ہے۔اس لئے مناکحت اور مواصلت کی خاص ضرورت تھی۔اور مقتدر وممتاز حضرات نے اس کے ظاہری مفاد کے لحاظ سے مناکحت بھی فرمائی۔اور متاہل بھی ہوئے۔اس لئے تزوج کو شریعت اسلام کا جزو لاینفک کہنا چاہئے۔جس کا جواز ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گا۔لیکن شریعت میں جواز مناکحت ضرور ہے۔وجوب مناکحت نہیں اس لئے متاہل ہونا جس طرح ممنوع نہیں۔اسی طرح مجرد رہنا بھی ممنوع نہیں ہوسکتا۔البتہ اگر مناکحت کا حکم قطعی ہوتا تو تجرد اس کی ضد تھی جس کی حمایت کی فسق اورارتداد کہہ سکتے تھے۔

چونکہ مناکحت سے ترقی نسل بھی مقصود ہے۔اور مناکحت پر انسان کی صحت بھی موقوف ہے۔اور مناکحت سے تمدنی اور اقتصادی معاملات بھی درست ہوتے ہیں۔اور مناکحت سے انسان کی شخصیت کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔اور مناکحت سے عافیت کا انتظام بھی وابستہ ہے۔اور مناکحت سے خواہشات کا بھی سد باب ہوتا ہے۔حتیٰ کہ مناکحت وہ قدیم رواج ہے جس کو انسان کا حقیقی ورثہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔اسی رعایت سے شریعت نے اس کے جواز کا حکم عام دیا۔اور مشاہیر اہل اسلام کا بھی اس پر عمل درآمد رہا۔

لیکن وہ مخصوص مقبولان الٰہی جن کو دنیا سے سروکار نہ مفاد دنیا کے خواستگار۔بلکہ تعلقات دنیا سے دست بردار ہو کر شوق وصال شاہد حقیقی میں اپنی ہستی سے بیزار

ہوئے اور بقول حضرت مولانا علیہ الرحمتہ ان کی یہ حالت ہوئی کہ

ہر کرا شد یزداں کاروبار
بار آنجا یافت بیرون شدز کار

(جن کا کاروبار اللہ سے ہوتا ہے وہ ہر قسم کے کاروبار سے فارغ ہوجاتے ہیں۔)

جب دنیا اور اہل دنیا سے تعلق نہ رہا تو مفاد دنیا کی جانب ان کا میلان کیونکر ہوتا۔ اس لئے ان برگزیدہ ہستیوں نے مواصلت اور مناکحت سے احتراز کیا۔ اور حالت تجرید میں وہ مردان خدا زندگی بسر کرتے رہے۔

لہٰذا حضرات محققین نے مسئلہ مناکحت میں وہی عمل جوان کی حالت کے لحاظ سے مناسب اور موزوں تھا۔ کیونکہ بمصداق۔ ع ۔''ہر کسے را بہر کارے ساختند۔'' (ہر کسی کو اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی مقصد کیلئے پیدا فرمایا ہے۔) خالق مطلق نے اس نگارخانہ عالم میں ہر فرد انسان کو خاص صلاحیت اور استعداد مرحمت فرمائی ہے اور ہر ایک بندہ اسی خیال میں مصروف رہتا ہے جو اس کو ودیعت ہوا۔ اور وہی کام کرتا ہے جس کا وہ اہل ہے۔ اور جس کے لئے مشیت رب العزت نے اس کو پیدا کیا ہے اس لئے وہ حضرات جن کی حالت کے لحاظ سے مناکحت مفید اور مناسب تھی۔ وہ متاہل ہوئے اور جن کے مذاق ومشرب کے لئے تجرد لازمی تھا۔ وہ مجرد اور آزاد رہے ہر دو فریق نے راہ ثواب اختیار فرمائی۔ اس واسطے عقلاً ونقلاً نہ حضرات اوّل الذکر کا خیال مذموم ہے۔ اور نہ آخر الذکر کا فعل ممنوع۔ بلکہ روایات شرعیہ میں جس اہتمام کے ساتھ مناکحت کی ترغیب ہے اسی تکرار کے ساتھ ترہیب بھی مذکور ہے۔

چنانچہ حجۃ الاسلام حضرت امام محمد غزالی علیہ الرحمتہ احیاء العلوم باب آداب

النکاح میں ارقام فرماتے ہیں کہ ''اعلم ان العلماء قد اختلفو فی فضل النکاح '' کہ فضیلت نکاح میں علما کا اختلاف ہے۔ پھر امام ممدوح نے اختلاف علما کی بھی تصریح فرمائی ہے کہ بعض علما کا یہ قول ہے کہ ''افضل من تخلی لعبادة اللّٰه '' کہ نکاح کرنا بہتر ہے عبادت الٰہی کے لئے تنہائی اختیار کرنے سے۔ اور بعض فضل النکاح کے تو قائل ہیں لیکن ''قد مو اعلیه تخلی العبادة لعبادة اللّٰه'' عبادت الٰہی کے لئے تنہائی کو بہتر سمجھتے ہیں۔ ''وقال آخرون لا فضل ترکه فی زماننا هذا و قد کان له من قبل اذلم تکن الاکتساب محظورة و اخلاق النساء مذمومة ۔'' اور بعض نے یہ کہا ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں ترک مناکحت ہی بہتر ہے۔ اور اس کی فضیلت پہلے وقت میں تھی کہ کمائی کے طریقے حرام اور ممنوع نہ تھے اور نہ عورتوں کی عادتیں خراب تھیں۔

جس طرح اس محقق امام نے اس مسئلہ میں علما کے اختلاف کو بصراحت لکھ دیا۔ اسی طرح شیخ الشیوخ تاج العارفین مخدوم حضرت شیخ شہاب الدین بن محمد سہروردی علیہ الرحمتہ نے عوارف المعاوف باب ششم فصل ہشتم درآداب تجرد و تاہل میں ارقام فرمایا ہے:۔ ''اخبار نبوی و احادیث مصطفیٰ ؐ در فضیلت تجرد و تاہل متقابل و متعارض اند۔'' (اخبارِ نبویؐ احادیثِ مصطفیٰؐ تجرد اور تاہل کی فضیلت کے متعلق مقابل ومخالف ہیں۔ از مصباح الہدایۃ ترجمہ عوارف المعارف)

ایک مستند امام شریعت اور ایک مقدس پیشوائے طریقت نے جن بالاتفاق لکھ دیا کہ فضل تجرد و تاہل میں علمائے اسلام کا اختلاف ہے تو ہر چند ان کا محققانہ ارشاد ہمارے اطمینان کے واسطے کافی تھا۔ لیکن فضل تزوج و تجرد میں علما کا اختلاف کیوں

ہے؟اس کی بھی مختصر طور پر صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

لہٰذا وجہ اختلاف کی یہ ہے کہ روایات شرعیہ متعارض ہیں۔ چنانچہ پہلے قرآن پاک کی ان آیات کو دیکھنا چاہئے جو فضل تاہل و تجرد میں متعارض ہیں۔مثلاً اللہ جل جلالہ نے سورۂ نساء میں فرمایا ہے کہ ''فانکحوا ماطاب لکم من النساء '' (سورۃ النساء:۳) یعنی جو عورتیں تم کو پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔ پھر رخصت بھی وہی کہ دو یا تین یا چار بیبیاں تک کر سکتے ہو۔اگر عدل بھی کر سکو۔اس آیۂ کریمہ سے جواز مناکحت ثابت ہے۔ پھر دوسری آیت میں ارشاد ہوا کہ ''ولقد ارسلنا رسلامن قبلک وجعلنا لهم ازواجا وذرية '' (سورۃ الرعد:۳۸) کہ تم سے پہلے ہم نے رسول بھیجے جن کی بیبیاں اور اولاد تھی۔اس آیہ وانی ہدایہ میں تزوج کی صریح ترغیب ہے کہ مناکحت کو پیغمبران ماسلف کی سنت فرمایا پس اس آیہ کریمہ سے تزوج کی فضیلت ظاہر ہے۔

لیکن اس حکیم مطلق نے نقائص تزوج سے بھی خبردار کر دیا۔اور سورۂ تغابن میں ارشاد ہوا ''ان من ازواجكم و اولادكم عدوا لكم فاحذروهم ''۔ (سورۃ التغابن:۱۴)

تمہاری بعض بیبیوں اور اولاد میں سے تمہاری دشمن ہیں پس ان سے پرہیز کرو۔اور دوسری آیت میں فرمایا کہ '' انما اموالكم و اولادكم فتنة '' (سورۃ التغابن:۱۵) یعنی تمہارا مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہے۔ان آیات کا مضمون ترہیب تزوج پر دلالت کرتا ہے۔

لہٰذا ظاہر ہو گیا کہ آیات قرآنیہ میں تاہل کی ترغیب بھی ہے۔اور ترہیب بھی

جس طرح پیغمبروں کی مثال دے کر فضل تزوج کا اظہار فرمایا۔اسی طرح یہ بھی سمجھا دیا کہ بعض بیبیاں تمہاری دشمن ہیں ان سے پرہیز کرو۔اور تمہارا مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہے۔

علیٰ ہذا حضرت سیدالمرسلین حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی تزوج وتجرد کی تعلیم میں اپنی امت کو مناکحت کی فضیلت سے بھی آگاہ کیا۔اور اس کے ضروری نقصان سے بھی مطلع کر دیا۔چنانچہ ارشاد ہوا''النکاح سنتی فمن رغب عن سنتی فقد رغب عنی ''کہ نکاح میری سنت ہے جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس نے مجھ سے اعراض کیا۔اور یہ بھی فرمایا ہے''من رغب عن سنتی فلیس منی''کہ جس نے میری سنت سے روگردانی کی وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یہ فضل تزوج کی عین دلیل ہے کہ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے نکاح کو اپنی سنت فرمایا جو ترغیب امت کے لئے کافی ہے۔

لیکن صحیح احادیث میں ترہیب تزوج بھی بصراحت مذکورہ ہے۔چنانچہ منقول ہے کہ۔''خیر کم بعد الماتین رجل خفیف الحاذ ''کہ دوسو برس کے بعد اچھا وہ شخص ہے جو خفیف الحاذ ہو۔صحابہ نے عرض کیا''یا رسول اللّٰہ وماخفیف الحاذ؟ فقال صلی اللہ علیہ وسلم الذی لا اہل لہ ولا ولد ''فرمایا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ خفیف الحاذ وہ ہے جو زن وفرزند نہ رکھتا ہو۔یہ حدیث اہل تجرد کی حمایت میں ہے۔اور یہ بھی فرمایا ہے کہ''یاتی علی الناس زمان یکون ھلاک الرجل علی یدی زوجتہ و ابویہ وولدہ'' فرمایا آنحضرت ﷺ نے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ انسان اپنی بی بی اور والدین اور

اولاد کے ہاتھ سے تباہ ہوں گے۔اس حدیث میں احتراز تاہل کی تعلیم اور تجرد کی ترغیب ہے۔

مگر اس حدیث میں تو بغیر کسی تاویل وتوجیہہ کے مناکحت کی صریح ترہیب ہے۔کہ حضرت سیدالمرسلین نے فرمایا کہ''ماترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء''یعنی میرے بعد بڑا فتنہ مردوں کے واسطے عورتیں ہیں۔

یہ چند حدیثیں ترک تزوج کی تعلیم سے مملو ہیں کہ حضرت مخبر صادق نے نقصانات مناکحت کو یوں سمجھایا کہ دوسو برس کے بعد خیرالناس آزاداور اہل تجرید ہوں گے۔اور ایسازمانہ آنے والا ہے کہ انسان اپنی بی بی اور بچوں کے ہاتھ سے تباہ وبرباد ہوں گے۔پھر صاف الفاظ میں ارشاد ہوا کہ میرے بعد مردوں کو بہت بڑا نقصان پہنچانے والی جو چیز ہے وہ عورتیں ہیں۔

پس جس طرح آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ میں تاہل اور تجرد کی ترغیب اور ترہیب مساوی طور پر مذکور ہے اسی طرح آثارات کے مطالعہ سے بھی یہی صورت نمایاں ہوتی ہے۔چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ''لایتم نسک للناسک حتی یتزوج''یعنی عابد کی عبادت پوری نہیں ہوتی جب تک وہ متاہل نہ ہو۔علیٰ ہذا منقول ہے کہ''وکان عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ یکثر النکاح ویقول ما اتزوج الا لاجل الولد''کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نکاح زیادہ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ صرج اولاد کے لئے نکاح کرتا ہوں یہ ارشادات نکاح کی ترغیب میں ہیں۔

اور حضرت امام محمد غزالی علیہ الرحمۃ نے احیاءالعلوم میں لکھا ہے کہ ابوسلیمان

دارانی علیہ الرحمتہ سے نکاح کی نسبت کسی نے پوچھا تو فرمایا''فقال الصبر عنهن خیر من الصبر علیهن و الصبر علیهن خیر من الصبر علی النار ''آپ نے فرمایا کہ عورتوں سے صبر کرنا اس سے بہتر ہے کہ ان کی حرکات پر صبر کیا جائے۔اور ان کی حرکات پر صبر کرنا آگ پر صبر کرنے سے بہتر ہے۔اور یہ بھی آپ کا قول ہے کہ ''الوحید یجدمن حلا وۃ العل و فرا غ القلب مالا یجد متاهل ''کہ تجرید میں عمل کا ذائقہ اور دل کا فراغ اسقدر حاصل ہوتا ہے کہ متاہل کو نہیں ہوتا۔اور یہ بھی آپ نے ارشادفرمایا ہے کہ''مارایت من اصحابنا تزوج حیث علےٰ مرتبة الاولــــی ''یعنی اپنے یاروں میں کسی کو نہیں دیکھا کہ نکاح کرنے کے بعد اپنے پہلے مرتبہ پر ثابت رہا ہو۔اور حسن بصری علیہ الرحمتہ کا قول ہے کہ''اذا اراد اللّٰـه خیرا لم یسشغله باهل ولا مال ''کہ جب اللہ جل جلالہ کا کسی بندہ پر فضل ہوتا ہے تو اس کو مال اور اہل وعیال میں مشغول نہیں کرتا۔یہ جملہ اقوال ترک تزوج کی حمایت میں ہیں۔

لہٰذا اس تفصیل سے بخوبی واضح ہو گیا کہ فضل تزوج وتجرد متقابل ومتعارض ہے۔نہ ترغیب نکاح کو حکم عام وقطعی کہہ سکتے ہیں۔اور نہ ترہیب مناکحت کو ترہیب صریح اور تراہیب نہ مطلق کا درجہ حاصل ہے۔لیکن حضرات محققین نے اس ظاہری تعارض کی بھی تطبیق کی ہے۔اور فرمایا ہے کہ نہ تزوج مفید عام ہے۔ورنہ فضل تجرد میں تعمیم ہے۔بلکہ بلحاظ مواقع اس کا حکم مخصوص اور انسان کی حالت پر موقوف ہوتا ہے۔اور چونکہ بشریت مختلف الحال ہے اس لئے بعض کے واسطے تزوج مناسب ہے اور بعض کے واسطے تجرد۔اور نتیجہ دونوں کا واحد یعنی زہدوتقویٰ ہے بس یہ ظاہری

تعارض بھی درحقیقت تعارض نہیں بلکہ عین ثواب ہے کہ طریق خداطلبی میں جوصورت مناسب حال متصور ہووہ اختیار کی جائے۔ ہر دوفریق ماجوراوراہل حق ہیں بقول

نیست درعالم روی سر برآن درگاہ نیست
عالمے سرگشتہ ہست وہیچ کس گمراہ نیست

(اس جہان میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے کہ جس کی توجہ اللہ کی بارگاہ کی طرف نہیں ہے۔ تمام جہان سرگرداں ہے اورکوئی گمراہ نہیں۔)

چنانچہ صاحب عوارف المعارف نے اپنی مبسوط اور مدلل تقریر میں منشاء تعارض یہی فرمایا ہے کہ انسان کی حالت مختلفہ کے لحاظ سے تزوج وتجرد کا حکم ہوتا ہے۔ اگر کوئی مغلوب شہوت ہے اورقلت صبر اورضعف تقویٰ کے باعث ممنوعات شرعیہ کے ارتکاب کا خوف ہو۔اس کے لئے نکاح کرنا ضروری اورلازمی ہے اور جوشخص طالب صادق اور صاحب ارادت واثق اور حصول مراد کے لئے سرگرم جستجو ہو یا اثناء سیر و سلوک میں منزل مقصود کا خواہاں وکوشاں ہواس کے واسطے تجرد وتفرد افضل ہے۔ چنانچہ تمثیلاً ایک درویش کا قصہ نقل فرمایا ہے کہ اس سے دریافت کیا کہ تم کوتزوج سے پرہیز کیوں ہے۔اس نے جواب دیا کہ عورت مردوں کے واسطے مخصوص ہے اور میں ہنوز مقام مردی تک نہیں پہنچا۔اس لیے تزوج مجھ کوشایاں نہیں اور یہی سوال دوسرے درویش سے کیا گیا۔تو اس نے یہ کہا کہ تزوج کی ضرورت تو اس وقت ہوگی کہ پہلے نفس کوطلاق دوں۔

لہٰذا سالکان طریق حقیقت نے طالب راہ حق کے واسطے چونکہ قطع علایق اورمحوعوائق کوشرط سلوک اورلوازم سیر گردانا ہے۔اور یہ مسلمہ ہے کہ تزوج سبب تقلید

ہے۔ جوصریح فراغ قلب کے لئے حارج ہے۔ جیسا کہ اکثر حضرات صوفیہ کرام نے فرمایا ہے چنانچہ صاحب سبع سنابل نے سنبلہ سوم میں لکھا ہے کہ ''وقتے جنید قدس اللہ سرہ رابعہ بصری را پیغام داد کہ مارا بزوجیت قبول کن۔ (اپنے وقت میں جنید نے رابعہ بصری کو پیغام بھیجا کہ ہم کو زوجیت میں قبول کر۔)'' حضرت رابعہ نے جواب میں باستدلال فرمایا کہ 'میخواہی کہ مشوش وقت من باشی واز مشغولی خداوند تعالےٰ محروم گردانی و بخدمت خود مشغول کنی۔ جنید قدس سرہ شرمندہ شد واین بیت خواند۔ (تو چاہتا ہے کہ تو میرے وقت کو پریشان کردے۔ اور بارگاہِ ایزدی کی مشغولیت سے مجھے محروم کردے۔ اور اپنی خدمت میں مشغول کردے۔ حضرت جنید شرمندہ ہوئے۔ اور یہ شعر پڑھا)

آن زن کہ بہ از ہزار مرد است توئی
آن مرد کہ از زنے خجل ماند منم

(وہ عورت کہ جو ہزار مردوں سے بہتر ہے وہ تو ہی ہے۔ اور وہ مرد کہ جو اپنی عورت سے شرمسار ہے وہ میں ہی ہوں۔)

اس لئے بہتر یہ ہے کہ اگر سالک مقاومت نفس پر قادر ہے تو جمعیت خاطر کو غنیمت جانے اور تعلقات زن و فرزند میں منغض و مکدر نہ ہو۔ جو یقینی حصول مراد کے لئے مفید طریقہ ہے۔ خصوصاً مشرب عشق میں تو مدار اسی پر ہے کہ ماسوی اللہ سے انقطاع قطعی ہو۔ بلکہ اپنی ہستی شاہد حقیقی کی ہستی سامنے فنا اور معدوم ہوجائے۔ بقول

اگر با رغبت لیلیٰ بخاطر رغبتے دارد
چون مجنون فرد باید شد ہم از خویش و ہم از خویشان

(اگر تو لیلیٰ کے ساتھ دل سے رغبت رکھتا ہے تو مجنون کی طرح اکیلا ہونا پڑے گا۔اپنی ذات سے بھی اور اپنے رشتہ داروں سے بھی۔)

الغرض اس تصریح سے روایات شرعیہ کے تعارض کا شبہ تو قطعی جاتا رہا۔اور معلوم ہو گیا کہ اطباء امراض باطنی نے جس کے درد کا جو نسخہ مفید تھا وہ اس کے واسطے تجویز فرمایا۔لیکن دوسرا خدشہ اور ہے۔وہ یہ کہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ تجرد اصول اسلام کے منافی ہے اس لئے کہ حدیث صحیح۔"**لا رهبانيت في الاسلام**" موجود ہے کہ رہبانیت اسلام میں نہیں ہے اور رہبانیت کے معنی تجرد محض سمجھتے ہیں۔تو لازم ہوا کہ پہلے رہبانیت سے لغوی اور اصطلاحی معنی کی صراحت کی جائے۔کیونکہ اس حدیث میں رہبانیت کی صریح ممانعت ہے اگر رہبانیت کے معنی تجرد محض ہیں تو واقعی تجرد منافی اسلام ہے۔

لہٰذا لغت میں رہبانیت ورہبان کے معنی ترسیدن اور ترسندہ کے ہیں۔تو یہ لغوی معنی عقلاً و نقلاً اصول اسلام کے منافی نہیں معلوم ہوتے۔کیونکہ خوف الٰہی فعل محمود ہے نہ مذموم۔

اور صاحب صراح اور برہان نے لکھا ہے کہ عرف میں رہبان عابدان ترسا اور زاہدان نصاریٰ کو کہتے ہیں۔کہ پرہیز گاری کی وجہ سے وہ تارک لذات ہوتے تھے اس لئے وہ رہبان کے لقب سے مشہور ہو گئے۔تو ایک حد تک یہ عرفی معنی بھی مذموم نہیں ہیں۔کیونکہ زاہدان نصاریٰ کا تارک لذات اور گوشہ نشین ہونا روایات شرعیہ سے مستحسن ثابت ہے۔

چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے جناب

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں تہتر فرقہ ہوگئے۔ان میں صرف تین فرقہ ناجی ہوئے کہ جب سلاطین نصاری جبر اور تشدد کرنے لگے۔اور انجیل میں باقتضائے مصلحت حکمرانی کی تعریف کی گئی۔تو ایک گروہ صبر کے ساتھ لڑا اور مارا گیا۔اور دوسرا گروہ بھی یوں ہی شہید ہوا۔اور دونوں نے نجات پائی۔لیکن تیسرے گروہ کو مقابلے کی قوت نہ تھی۔وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے لگا۔اور اس نے تعلقات دنیا کو قطع کیا۔اور لذات مباح کو ترک کر کے مجاہدات شاقہ میں مصروف ہو گیا۔

اور دوسری روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ملوک نصاریٰ نے توریت وانجیل میں تحریف کی۔اور مومنین سے کہا کہ تمہاری وجہ سے ہم کو عار لاحق ہوتا ہے۔اور ہمارے احکام نہ اعمال باطل قرار پاتے ہیں اگر مثل ہمارے قرأت نہ کرو گے تو قتل کئے جاؤ گے۔انہوں نے تعرض سے انکار کیا اور گوشہ نشین ہوگئے۔اور بعض جنگلوں میں مسکن گزیں ہوئے اور ان کا لقب راہب ہوگیا۔ بلکہ صاحب گلشن راز انہیں عابدوں کی تمثیل دیگر طالب خدا کو ہدایت فرماتے ہیں۔

حنفی شو زہر قید و مذاہب

در آور دیر دین مانند راہب

(ہر مذہب اور ہر قید سے الگ ہوجا۔تو راہب کی طرح دیر میں آجا۔)

لیکن انہیں پارسایان نصاریٰ کی تقلید جب عابدان متبدعہ نے کی تو ان کی غلط کاری سے رہبانیت کی جدید صورت ہوگئی۔اور اس کا شفاف چہرہ گرد نقائص سے غبار آلود ہوگیا۔کہ قدیم رہبان تو ریاضت ومجاہدات میں جمعیت خاطر کے لئے

لذات نفسانیہ سے اعراض اور تعلقات دنیوی سے احتراز کرتے تھے۔ مگر ان کے مقلدین کی جدت پسند طبیعت نے رہبانیت کی شکل بالکل تبدیل کردی۔ کہ مقاومت نفس کی تو ان کو قدرت نہ تھی۔ اور ترک ازدواج کو رہبانیت کا رسم ضروری جانتے تھے۔ اور رہبان ہونے کا شوق تھا۔ اس لئے وہ آلہ مردانگی کو قطع کرنے لگے۔ تاکہ تجرد قائم رہے اور ہماری رہبانیت میں فرق نہ آئے۔ اس وقت سے رہبانیت کے معنی مذموم ہوگئے۔

چنانچہ اللہ جل جلالہ نے سورۂ حدید میں اس واقعہ کو بصراحت ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا۔ اوران کو انجیل دی اور ''وجعلنا فی قلوب الذین ابتعوہ رافۃ ورحمۃ ورہبانیۃ ابتدعوھا ما کتبنا علیھم الا ابتغآء رضوان اللّٰہ فمارعوھا حق رعایتھا. فاتینا الذین امنوا منھم اجرھم. وکثیر منھم فاسقونO'' (سورۃ الحدید: ۲۷) یعنی ان کے تابعین کے دلوں میں نرمی اور مہربانی اور خدا پرستی پیدا کردی۔ ہرچند یہ رہبانیت ان پر واجب نہیں تھی۔ مگر رضائے الٰہی کی غرض سے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ لیکن اس کی رعایت نہ کی تو ہم نے ان میں سے ایمان والوں کو اجر عطا کیا۔ اور اکثر ان میں نافرمان تھے۔

اس آیہ کریمہ سے بغیر کسی تاویل کے صاف ظاہر ہے کہ عیسےٰ علیہ السلام کی امت پر رہبانیت واجب نہ تھی۔ لیکن رضائے الٰہی کے واسطے جب انہوں نے اختیار کی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان خدا پرستوں کو اجر عطا فرمایا۔ کیونکہ رضائے الٰہی کے لئے مقاومت نفس قطعی محمود ہے۔ البتہ جب اس مستحسن فعل میں مذموم ابتداع کی گئی۔ اور اختصاء ہونے لگے تو اس ارتکاب کبیرہ سے وہ نافرمان سمجھے گئے۔ اور اس حدیث کا

اسی رہبانیت مبتدعہ کی جانب اشارہ ہے کہ ''لا رھبا نیت فی الاسلام '' یعنی نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے اپنی امت کو آگاہ فرمایا کہ ایسی رہبانیت اسلام میں ممنوع ہے کیونکہ ضبط خواہشات نفسانیہ کا نام ترک لذات ہے۔ اور جس خواہش کا قطعی مادہ نہ ہوا اس کا ضبط نہ صبر وزہد میں داخل ہے اور نہ اس کا ترک وامساک مفید اور سود مند ہوسکتا ہے۔

بلکہ مولانا جلال الدین رومی قدس اللہ سرہ نے بھی حدیث ''لا رھبانیت فی الاسلام '' کی شرح یہی فرمائی ہے۔ اور اپنی مثنوی کے دفتر پنجم میں لکھا ہے۔

چون عدونبود جہاد آمد محال شہوت ارنبود نبا شد انتسال

صبر نبود چون نبا شدمیل تو خصم چون نبود چہ حاجت خیل تو

ہیں مکن خود را خصے رہبان مشو زانکہ عفت ہست شہوت را گرد

(جب دشمن ہی نہ ہو تو جہاد محال ہے۔ شہوت ہی نہ ہو تو اولاد کہاں سے آئے۔ اگر ملاقات نہ ہو تو صبر کیسا۔ جب دشمن ہی کوئی نہ ہو تو گھوڑے کی کیا ضرورت ہے۔ خبردار اپنے آپ کو خصی نہ کر اور رہبان نہ بن۔ کیونکہ عفت و پاک دامنی کیلئے شہوت گروی ہے۔)

مولانا علیہ الرحمۃ نے رہبانیت کے اصطلاحی معنی سے خبردار کر دیا اور اس کے نقائص سمجھا کر وہی ہدایت فرمائی جو۔ ''لا رھبا نیت فی الاسلام ''۔ کا مفہوم ہے کہ ''ہین مکن خودرا خصی رہبان مشو'' ۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ عرف میں رہبان خصی یعنی آلت بریدہ کو کہتے ہیں اور اسی رہبانیت مبتدعہ کی ممانعت میں سرکار رسالت کا یہ حکم صادر ہوا کہ ''لا رھبانیت فی الاسلام ''یعنی خصی ہونا شریعت اسلام میں قطعی

ناجائزاورممنوع ہے۔

چنانچہ مولانا علیہ الرحمۃ کے اشعار مذکورہ کی شرح میں مولوی عبد العلی بحرالعلوم فرنگی محلی ارقام فرماتے ہیں''رہبان متعبد ان نصاری رامینگویند۔ وایشہا مجاہدہ عظیمہ میکردند۔ واز نکاح خودرا باز داشتند۔ وچون خائف وقوع درگناہ می شدند خود راخصی میکردند۔''(رہبان عیسائیوں کے عبادت گذارلوگوں کو کہتے ہیں۔اوراس راہ میں وہ بہت زیادہ مجاہدہ کرتے ہیں۔اورخودکونکاح سے باز رکھتے ہیں۔جب گناہ واقع ہونے سے ڈرتے ہیں تو خود کوخصی کر لیتے ہیں۔) مولانا بحر العلوم نے بھی ''لارھبانیت فی الاسلام'' کا وہی مفہوم ارشادفرمایا کہ رہبانیت سے رہبانیت متبدعہ مراد ہے۔جوشریعت اسلام میں ممنوع ہے۔

غرض رہبانیت کے معنی بخوبی ظاہر ہوگئے۔کہ پہلے زاہدان نصاری بغرض مجاہدہ تجرد اختیار کرتے تھے۔مگر بعد کے رہبان رسمی کو جب ضعف تقویٰ کے باعث وقوع گناہ کا خطرہ ہوا تو آلۂ مردانگی قطع کرنے لگے۔اور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے اسی کی ممانعت فرمائی۔کیونکہ یہ مسلمہ ہے کہ بجہت ریاوحیلہ۔تمتع وتصنع جسم کا کوئی حصہ قطع یا بیکار کرنا شریعت اسلام میں قطعی ممنوع ہے۔

لیکن جس طرح شریعت اسلام میں رہبانیت متبدعہ ممنوع ہے۔اسی طرح بالاتفاق علمائے شریعت ومقتدائے طریقت مقاومت نفس وضبط خواہشات مستحسن اور سلف صالحین کی خاص تقلید ہے۔اس لئے مصنوعی اور بدعت آمیز رہبانیت اور چیز ہےاورترک وتجرداور چیز ہے۔امتناع رہبانیت سے ترک تزوج کی امتناع نہیں لازم آتی۔ بلکہ بقول حضرات صوفیہ کرام اگر طالب راہ حق کوضبط خواہشات پر قدرت ہوتو

اس کے واسطے تجرید مناسب اور مفید ہے کہ حصول مراد کی جدو جہد میں فروغ قلب اور جمعیت خاطر لازمی ہے اور جمعیت خاطر تجرید اور انقطاع تعلقات پر اکثر منحصر ہے۔

اس صراحت سے تجرید مستحسن اور رہبانیت مبتدعہ کا فرق اور دونوں کی ماہیت اور حقیقت کما حقہ ظاہر ہوگئی ہے اور معلوم ہوگیا کہ تجرد اور رہبانیت کے معنی مرادف اور متحد نہیں ہیں بلکہ جس رہبانیت کا حدیث 'لا رھبا نیۃ فی الا سلام'' میں اشارہ ہے وہ خصی شدن وخود را خارج از مردانگی کردن ہے۔ اور مجاہدات کے لئے قطع علائق ومحو عوائق اور بکمال ضبط و استقلال تجرید وتفرید پر صابر اور قانع رہنا یقینی مستحسن اور محمود ہے۔ ورنہ سلف صالحین و مشاہیر صوفیہ کرام تجرید وتفرید ہرگز پسند نہ فرماتے۔ بلکہ اکثر ایسے حضرات صوفیہ کرام ہیں جن کے متجر ظاہری کا زمانہ معترف ہے۔ اور جن کا تقدس باطنی طبقہ اسلام میں مسلمہ ہے۔ اور اپنے اپنے وقت میں جو طریقت کے مقتدا اور پیشوا تھے۔ انہوں نے تجرد پر فخر کیا ہے۔ اور بعض نے تجرید کے حسنات و برکات ارشاد فرمائے ہیں جس کا ذکر کتب معتبرہ میں بصراحت منقول ہے جس کی تفصیل کی اس مختصر رسالہ میں گنجائش نہیں مگر بہ نظر اختصار چند مشاہیر اہل تجرد کے نام نامی درج ذیل کرتا ہوں جس سے ناظرین کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ تجرید و تفرید کے حامی کیسے کیسے برگزیدہ اور خدارسیدہ حضرات ہیں۔

چنانچہ صاحب ایمان وایقان مولانا شاہ عبدالرحمٰن صوفی قدس اللہ سرہ مسند آرائے لکھنو نے ازدواج نہیں فرمایا اور ہمیشہ آزاد اور مجرد رہے۔

مظہر اسرار الٰہیہ ومہبط انوار نامتناہیہ حضرت شاہ غلام علی مجددی خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید علیہ الرحمۃ جو مجموعہ تجرد وتقدس تھے کہ علاوہ اہل دل اور

صاحب باطن ہونے کے علوم ظاہری میں بھی آپ کو ایسا کمال اور اتباع سنت رسالت میں وہ غلو تھا کہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اپنے مکتوبات میں آپ کو ''قیم دین احمدی'' لکھا ہے۔ ان کے حالات میں منقول ہے کہ آپ ترک تزوج کے حامی تھے۔ اور خود بھی ہمیشہ مجرد رہے۔ بلکہ آنجناب نے خود اپنے تجرد کا اظہار فرمایا ہے۔ جس کو صاحب درالمعارف نے آپ کے ملفوظات میں نقل کیا ہے کہ جب خانقاہ وسیع کرنے کا آپ خیال ہوا تو ''فرمودند کہ اہل وعیال ندارم کہ برای آن می خواہم۔ مگر خواہش من محض للہ ہست کہ مردمان برای طلب حق جل وعلا از اوطان خود می آیند و جای اقامت نمی یابند۔ برای اینہا وسعت مکان میخواہم۔'' (آپ نے فرمایا کہ میں اپنے اہل وعیال نہیں رکھتا ہوں کہ ان کیلئے یہ کام کروں۔ مگر میری خواہش صرف اللہ کیلئے ہے کہ لوگ، حق کی طلب کیلئے، کہ جو بزرگ و برتر ہے، اپنے وطنوں سے آتے ہیں اور ٹھہرنے کی نہیں پاتے۔ ان کیلئے میں چاہتا ہوں کہ مکان وسیع بناؤں۔) اور یہ بھی آپ کے ملفوظات میں ہے کہ نکاح کا ذکر آیا تو فرمایا ''صوفی را نکاح کردن نہ شاید۔'' (صوفی کو نکاح نہیں کرنا چاہئے۔)

اور یہ بھی آپ کا قول ہے ''صوفی را ترک وتجرید وروگردانی از دنیا۔ انحراف از ماسوی اللہ۔ وخلوت ودوری از اغنیا باید کرد۔ ونکاح مانع این چیز ہاست۔'' (صوفی کیلئے ترک وتجرید، دنیا سے منہ پھیر لینا، اللہ کے سوا ہر شے کو چھوڑ دینا، خلوت میں رہنا اور امیر لوگوں سے دوری اختیار کرنا ضروری ہے اور نکاح ان چیزوں سے روکنے والا ہے۔)

مولانا تاج الدین علیہ الرحمتہ نے بھی قطع تعلق فرمایا۔ اور حامی تجرید

ہوئے۔ چنانچہ محمد مبارک علوی کرمانی موعود بامیر خورد نے آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ ''این بزرگ دراوائل تعلق باہل داشت۔ فاماچہ سعادت ابدی نصیب اوگشت کہ ترک مذلت گرفت و بدولت ارادت سلطان المشائخ مشرف شد۔ ومحبت سلطان المشائخ درسویدائی دل مبارک او جائی کرد۔ ترک یک بارگی پیش گرفت۔ وفقر ومجاہدہ و فاقہ را دولت خود دانست۔'' (یہ بزرگ شروع میں اہل سے تعلق رکھتے تھے۔ ابدی سعادت آپ کا نصیب بن گئی۔ یہ تمام کام جورسوا کرنے والے تھے آپ نے اختیار کر لئے۔ اور سلطان المشائخ کی محبت آپ کے دل میں مضبوط ہوگئی اور فوراً اس تنہائی کو پسند کیا۔ اور فقر اور مجاہدہ اور فاقہ کو اپنی دولت جانا۔ سیر الاولیاء) اور اس کے بعد لکھا ہے کہ ''بہ ترک وتجرید منسوب گشت۔'' (ترک وتجرید سے منسوب ہوگئے۔)

حضرت امیر حسن علاء سنجری علیہ الرحمۃ بھی اہل تجرید سے تھے۔ چنانچہ صاحب سیر الاولیا نے لکھا ہے کہ ''این بزرگ درین عالم مجرد زیست۔'' (اس بزرگ نے اس جہان میں مجرد زندگی گزاری۔)

مولانا فخر الدین مروزی علیہ الرحمۃ بھی اہل تجرید سے تھے۔ چنانچہ آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ ''بمبالغہ تقوٰے وبہ نہایت ترک وتجرید کوشید و پیوستہ کتابت کلام مجید کردے۔ واز اختلاف خلق مجرد زیستے۔'' (اور تقویٰ کیلئے سب سے بڑھ کر ترک و تجرید کی کوشش کی اور کلام مجید کی تعلیم میں مصروف ہو گئے اور مخلوقِ خدا سے اختلاف سے زندگی گزارتے۔ سیر الاولیا)

مولانا وجیہ الدین پائلی علیہ الرحمۃ کی نسبت بھی صاحب سیر الاولیا نے لکھا ہے کہ ''درزہد وورع وتقوی وشدت مجاہدہ وترک وتجرید درزمان خود مثل نداشت۔''

(زہدوورع، تقویٰ اور شدتِ مجاہدہ اور ترک وتجرید میں ان کے زمانے میں ان کی کوئی مثال نہ تھا۔) اور شاہ محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ مولانا شمس الدین خلیفہ حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ جو تجرد و تقدس میں یگانہ روزگار تھے۔ اور اس برگزیدہ خدا نے حالت تجرید میں زندگی بسر کی۔

اخبار الاخیار میں یہ بھی منقول ہے کہ حضرت بہاؤالدین جو نپوری علیہ الرحمۃ خلیفہ حضرت نظام الحق والدین قدس اللہ سرہ تمام عمر مجرد رہے۔

حضرت شیخ علم الدین علیہ الرحمۃ جو حضرت محبوب الٰہی کے خلیفہ اور علوم ظاہری کے عالم متبحر تھے اور نارنول میں جن کے مزار پرانوار سے طالبان حق مستفیض ہوتے ہیں وہ تجرید کے حامی تھے اور خود مجرد وآزاد رہے۔ (اخبار الاخیار)

صاحب اخبار الاخیار نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت شاہ قمیص علیہ الرحمۃ جو اپنے وقت کے مشہور اہل باطن اور متقی تھے۔ وہ بھی عشق الٰہی کے جوش میں مجرد وآزاد رہے۔

مولانا سراج الدین عثمان علیہ الرحمۃ خلیفہ حضرت سلطان المشائخ نے بھی تجرید پسند فرمائی۔ چنانچہ صاحب سیر الاولیاء نے لکھا ہے کہ ''بخدمت سلطان المشائخ مجرد الحال و فارغ البال بودے۔ وعمر عزیز خود ہم در کنج جماعت خانہ سلطان المشائخ گذار یندے۔'' (اور سلطان المشائخ کی خدمت میں مجرد اور فارغ ہو کر رہے اور اپنی پیاری زندگی سلطان المشائخ کے جماعت خانہ کے ایک کونے میں گزار دی۔)

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار نقشبند علیہ الرحمۃ جن کا مشاہیر حضرات صوفیہ میں شمار ہے اور جن کی نسبت مولانا عبدالرحمٰن جامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔

چو فقر اندر قبائے شاہی آمد

بتدبیر عبید اللہی آمد

(جب قبائے شاہی میں فقر آجاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اللہ کی بندگی آتی ہے۔)

ان کا قول حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر علیہ الرحمۃ نے تذکرہ نکاح کے سلسلہ میں نقل فرمایا کہ ''حضرت واقف اسرار کاشف انوار خواجہ عبید اللہ رضی اللہ عنہ مبفر مودند کہ از من گناہے سرزدشدہ است۔ اگر پنج صد سال زندہ مانم وتوبہ واستغفار بجا آرم کفارت آن نمی شود۔ یاران مجلس عرض نمودند کہ کدام گناہ بوقوع آمدہ۔ فرمودند کہ نکاح۔ پس خیال باید ساخت کہ باوجود این حشمت ظاہری ایں چنیں مضرت باطنی دارد''۔ (واقفِ اسرار، کاشفِ انوار حضرت عبید اللہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے اور اگر میں پانچ سال زندہ رہوں اور توبہ واستغفار کرتا رہوں تو یہ پانچ سو سال کا کفارہ بھی اس گناہ کا کفارہ نہیں بنتا۔ مجلس میں بیٹھنے والے دوستوں نے عرض کی کہ کونسا گناہ سرزد ہوا تو آپ نے فرمایا کہ نکاح یہ گناہ ہے۔ پس اس کے بعد خیال کیا کہ باوجود دبدبہ ورعب کے اسی کی دل میں تکلیف رکھتے تھے۔ درالمعارف)

اور حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر علیہ الرحمۃ کے ملفوظات میں ہے کہ آپ نے فرمایا ''در آداب المریدین حضرت ضیاء الدین ابونجیب عبدالقادر سہروردی رضی اللہ عنہ نوشتہ اند کہ فی زماننا نکاح بناید کرد۔ پس وائے برآن صوفی کہ درین زمانہ دست دراز نماید۔'' (آداب مریدین میں حضرت ضیاء الدین ابو نجیب عبد القادر سہروردیؒ نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں نکاح نہیں کرنا چاہئے۔ پس اس صوفی پر افسوس ہے کہ جو اس زمانے میں نکاح کرتا ہے۔ درالمعارف)

حضرت مخدوم شیخ سعد الدین خیرآبادی علیہ الرحمۃ بھی متاہل نہیں ہوئے اور ہمیشہ آپ مجرد اور آزاد رہے(اخبارالاخیار)

حضرت مخدوم محمد شاہ مینا علیہ الرحمۃ بھی حصور تھے۔یعنی آپ نے نکاح نہیں کیا اور تمام عمر مجرد اور آزاد رہے(اخبارالاخیار)

واقف اسرار احدیت کاشف اسرار الوہیت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نظام الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز جن کے فیوض و برکات کے چشمے جاری ہیں وہ حصور تھے کہ آپ کا دامن تجرد تکدرات ازدواج سے آلودہ نہیں ہوا۔ اور تجرید کی فضیلت آپ نے ارشاد فرمائی۔ چنانچہ صاحب سیر الاولیا نے لکھا ہے کہ اہل ارادت نے دریافت کیا کہ یا حضرت مجرد رہنا بہتر ہے یا متاہل۔فرمایا کہ مجرد رہنا عزیمت ہے اور تاہل کی بھی رخصت ہے۔

یہ تمثیلاً ہندوستان کے چند مشاہیر حضرات صوفیہ کے اسمائے گرامی نگارش کئے جن میں کوئی مقتدائے خلق اور کوئی مخدوم ملک ہے۔اور جن کے تصرفات سے اہل ہند مستفیض اور برکات طریقت سے خبردار ہوئے۔اور جس طرح ان کے تقدس باطنی کا زمانہ معترف ہے۔اسی طرح علوم ظاہری میں ان کا تبحر و کمال دنیا کو معلوم ہے۔ لیکن یہ برگزیدہ خدا جب مجرد اور آزاد رہے تو ان کا تجرد فضل تجرید کے لئے کافی دلیل ہے اور طالبان طریق حق کے واسطے مستند مثال ہے۔

علاوہ ان کے اگر ہندوستان کے باہر ممالک اسلام میں سلف صالحین کے حالات میں دیکھا جائے تو حضرات صوفیہ کرام کا وہ مقدس اور ممتاز طبقہ جن کا جلیل القدر اور محققین میں شمار ہے۔اور جن کے علوی مرتبت کا آئمہ شریعت نے اقرار کیا

ہے۔ تاریخ کے ورق گردانی کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر مجرد اور آزاد ہے۔ اور تجرید کی فضیلت بیان کی اور اپنے مقلدین کو تجرد کی ہدایت فرمائی۔

چنانچہ سید ابراہیم متبولی قدس اللہ سرہ جو قاہرہ کے مشہور صوفی اور صاحب دوائر کبریٰ تھے۔ وہ برگزیدہ خدا مجرد اور تجرید کے حامی تھے۔ چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمۃ نے طبقاۃ الکبریٰ میں لکھا ہے:۔ ''و کان سیدی ابراھیم رضی اللّٰہ عنہ مبتلی با لانکار علیہ من کونہ لم یتزوج'' کہ سید ابراہیم نکاح نہ کرنے کے باعث لوگوں کے انکار میں مبتلا ہوئے۔

سید یوسف عجمی کورانی رضی اللہ عنہ جن کے مصر میں لاتعداد مرید تھے۔ اور شیخ نجم الدین محمود اصفہانی اور شیخ بدرالدین حسن شمشیری کا خرقہ آپ کو ملا تھا۔ یہ بھی آزاد اور مجرد تھے جیسا کہ صاحب طبقاۃ الکبریٰ نے لکھا ہے کہ ''و کانت طریقۃ التجرید'' کہ آپ کا طریقہ مجرد رہنا تھا۔

شیخ ابوالحجاج اقصری قدس اللہ سرہ بھی مصر کے مشہور خدارسیدہ اور صاحب تجرید صوفی تھے جن کے حالات میں امام شعرانی نے لکھا ہے کہ ''کان جلیل المقدار کبیر الشان کان مجرداً'' کہ جلیل القدر اور کبیر الشان اور مجرد تھے۔ (طبقاۃ الکبریٰ)

حضرت محمد سماک علیہ الرحمۃ جو زاہد متمکن اور عابد متدین اور مجرد تھے ان کے حالات میں حضرت شیخ فریدالدین عطار علیہ الرحمۃ نے تذکرہ الاولیا میں لکھا ہے کہ ''نقل است کہ او غریب (یعنی مجرد) بود۔ اورا گفتند چرا زن نہ کنی۔ گفت ازانکہ من طاقت دو شیطان ندارد۔ گفتند چہ گونہ۔ گفت مرا شیطانے است و اورا شیطانے۔

دردست دو شیطانے طاقت ندارم۔'' (نقل ہے کہ آپ غریب یعنی مجرد تھے۔ ان کو لوگوں نے کہا کہ تو نکاح کیوں نہیں کرتا۔ آپ نے کہا کہ میں دو شیطانوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ لوگوں نے کہا دو شیطان کس طرح۔ تو آپ نے فرمایا کہ ایک شیطان میرے ساتھ اور دوسرا اس کے ساتھ۔ میں دو شیطانوں کو ہاتھ میں رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔) اور امام شعرانی نے لکھا ہے کہ ابواسحاق ابراہیم بن اسمٰعیل خواص رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''افتـه المـريـد ثـلاثة حب الدرحم و حب النساء و حب الرياسة'' کہ مرید کے لئے تین آفتیں ہیں:۔ روپیہ کی محبت، عورت کی محبت۔ سرداری کی محبت۔ (طبقاۃ الکبریٰ)

اور ابواسحاق ابراہیم ہروی رضی اللہ عنہ بھی مجرد تھے۔ چنانچہ امام شعرانی نے آپ کی نسبت طبقاۃ الکبریٰ میں لکھا ہے ''و کـان مـن اهل التو کل و التجريد'' یعنی آپ متوکل اور اہل تجرید تھے۔

اور ابو اسحاق ابراہیم داؤد قصار رضی اللہ عنہ جو ملک شام کے مشہور اور صاحب فیض و برکات صوفی اور ابوالقاسم جنید علیہ الرحمتہ کے ہم نشین تھے۔ اور خود مجرد اور اہل فقر کے حامی رہے۔ چنانچہ آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ ''مـلازمـا لـلفقر مجردا فيه محبا لا هله'' کہ آپ ہمیشہ مجرد اور اہل فقر کے دوست رہے۔ (طبقاۃ الکبریٰ)

اور حضرت فریدالدین عطار علیہ الرحمۃ نے تذکرۃ الاولیا میں سیدالموحدین ابو یزید بسطامی علیہ الرحمتہ کا یہ قول لکھا ہے کہ ''گفت ہر کہ ترک ہوا کرد بحق رسید۔'' (جس نے ہوا وحرص کو ترک کردیا وہ اللہ تک پہنچ گیا۔)

اور ابوعبداللہ بن اسمٰعیل مغربی رضی اللہ عنہ جو ۲۷۹ھ میں ملک بقا کو تشریف لے گئے اور ابراہیم خواص اور ابراہیم شیبان کے پیر تھے صاحب طبقاۃ الکبریٰ نے لکھا ہے کہ آپ نے تجرید کی حمایت میں فرمایا ''الفقیر المجرد من الدنیاوان لم یعمل شیئا من اعمال الفضائل افضل من ھولاء المتعبدین و معھم الدینا'' کہ دنیا سے فقیر اعمال فضائل میں سے کچھ بھی نہ رکھتا ہو تو ان عابدوں سے افضل ہے جن کے ساتھ دنیا ہے اور یہ بھی آپ کا قول ہے کہ ''بل ذرۃ من الفقیر المجرد افضل من اعمال اھل الدنیا'' بلکہ فقیر مجرد کا ذرہ بھر علم اہل دنیا کے پہاڑ برابر عمل سے بہتر ہے۔

اور صاحب طبقاۃ الکبریٰ نے لکھا ہے کہ ابویعقوب یوسف بن حسین رازی رضی اللہ عنہ جن کا طریقہ دولت وعزت سے دست بردار ہونا تھا۔ وہ فرماتے کہ ''رائت فی انات الصوفیہ وانھافی معاشرۃ الاضد ادوالمیل الی النسوان ''یعنی صوفیوں کو دیکھا کہ اضداد کے ربط اور عورتوں کی طرف میلان میں جملہ آفتیں ہیں۔

اور ابوبکر نعر بن احمد بن نصر وفاق رضی اللہ عنہ جو مصر کے جلیل الشان بزرگ تھے ان کا قول ہے کہ ''آفۃ المرید ثلا ثہ اشیاء التزوج و کتابۃ الحدیث و معاشرۃ الضد '' کہ تین چیزیں مرید کے لئے آفتیں ہیں:۔ نکاح کرنا، حدیث لکھنا اور مخالف مشرب سے ملنا۔ (طبقاۃ الکبریٰ)

اور ابوسلیمان داؤد بن نصیر طائی رضی اللہ عنہ جو زہد وورع میں مشہور اور غیر متاہل تھے ان کے حالات میں امام شعرانی نے طبقاۃ الکبریٰ میں لکھا ہے کہ ''ومکث

رضـی الـلّٰـه عنه رابعا و ستين سنة اغوب " کہ آپ نے چونسٹھ سال تجرد میں زندگی بسر فرمائی۔

اور ابو نصر بشر بن الحارث حافی رضی اللہ عنہ بھی کامل مجرد تھے۔ جن کے حالات میں شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمتہ نے عوارف المعارف میں اور امام عبدالوہاب شعرانی نے طبقاۃ الکبریٰ میں لکھا ہے کہ "قیـل له تتزوج و تخرج عن مـخـالفة السنة فقال رضی اللّٰه عنه اجی مشغول بالفرض حن السنة " یعنی کہا گیا کہ لوگ الزام دیتے ہیں کہ آپ نے سنت نکاح کو ترک کیا۔ فرمایا ان سے کہہ دو کہ ہنوز ادائے فرض میں مشغول ہوں اس وجہ سے ادائے سنت کی فرصت نہیں۔

اور صاحب طبقاۃ الکبریٰ نے انہیں بشر حافی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "لـــم لـحتـج الی النساء فلتيق الله تعالٰی و لايائف ألحاذهن " کہ جو شخص عورتوں سے علیحدہ رہنے پر قادر ہوا سکو لازم ہے کہ اللہ سے ڈرے اور ان کے پاس نہ جائے۔

اور حضرت کریم الدین شیخ ممشاد دینوری رضی اللہ عنہ نے تعلقات عیال و اطفال سے انقطاع قطعی فرمایا۔ چنانچہ آپ کے حالات میں صاحب سیر الاقطاب نے لکھا ہے کہ " آنحضرت در اوائل حال منعم بود۔ چوں محبت حق درویش پدید آمد۔ اموال ومتاع در راہ خدانہو ٔ وبہ محتاجان بداد۔ چنانچہ بہر افطار ہم چیزے نگذاشت۔ درو بسوئے کعبہ آورد وگفت الٰہی جز تو مراہیچ نمی باید۔ عیال واطفال مرا تو دانی۔ پس متوجہ مکہ معظمہ شد۔ ودر آنجا بہ عبادت مشغول گشت۔" (ابتدا میں حضرت مالدار تھے۔ جب اللہ کی محبت ان کے دل میں ظاہر ہوئی تو مال اور ساز وسامان کو اللہ کے راستے میں محتاجوں کو دے دیا۔ چنانچہ افطار کیلئے بھی کوئی چیز نہ چھوڑی۔ اور اپنا چہرہ کعبہ کی طرف

کرلیااور کہااے اللہ تیرے سوا مجھے کوئی چیز نہیں چاہئے۔میرے بال بچے تو جانتا ہے۔ پس مکہ معظمہ کی طرف متوجہ ہوئے اور چلے گئے اور وہاں جا کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔)

اور حضرت داؤد طائی علیہ الرحمتہ بھی آزاد اور اہل تجرید سے تھے۔ چنانچہ صاحب تذکرۃ الاولیا نے آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ ''گفتند چرا زن نخواہی۔ گفت مومنہ را نتوانم فریفت گفتند چہ گونہ گفت چون اورا بخواہم مونت اور ادر گردن خود کردہ باشم۔'' (لوگوں نے کہا کہ تو نکاح کیوں نہیں کرتا۔تو انہوں نے کہا کہ میں مومنہ عورت کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔لوگوں نے کہا کس طرح۔تو آپ نے کہا کہ جب میں اس کے ساتھ نکاح کروں گا تو اس کا بوجھ میں اپنی گردن پر ڈالوں گا۔)

اور حضرت خواجہ حذیفہ مرعشی رضی اللہ عنہ بھی صاحب تجرید تھے۔ چنانچہ صاحب سیر الاولیاء نے آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ ''آنحضرت سالہا در سفر وحضر ملازم پیر روشن ضمیر خود بودہ۔ وزن نداشت۔'' (آنحضرت کئی سال سفر وحضر میں اپنے پیر روشن ضمیر کے ساتھ وابستہ رہے اور نکاح نہیں کیا۔)

اور حضرت ابراہیم ادہم رضی اللہ عنہ کی نسبت منقول ہے کہ آپ نے ترک تعلق کے بعد تجرید کی حمایت فرمائی اور مجرد رہے۔ چنانچہ صاحب سبع سنابل نے لکھا ہے کہ ''ابراہیم قدس اللہ سرہ نزد یک شبانے رفت۔ وجامہائے خود بودے داد۔ وجامہ وے خود پوشید۔ واہل وفرزندان راندا سپرد۔ وسر بہ بیانان نہاد۔'' (ابراہیم قدس سرہ ایک چرواہے کے پاس گئے اور اپنے کپڑے اس کو دے دیئے اور اس کے کپڑے خود پہن لئے اور اپنے بال بچوں کو اللہ کے سپرد کر دیا اور بیابان کی طرف نکل گئے۔)

بلکہ خانوادۂ ادہمیان جو حضرت ابراہیم ادہم سے منسوب ہے وہ جملہ مجرد تھے۔ جیسا کہ صاحب مراۃ الاسرار نے لکھا ہے کہ "ادہمیان مجرد و مسافر انند۔ وذکر جلی بسیار گویند۔" (ابراہیم ادہمؒ کے خانوادہ والے مجرد اور مسافر تھے اور بہت زیادہ ذکرِ جلی کرنے والے تھے۔)

اور صاحب مراۃ الاسرار نے لکھا ہے کہ حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ کے ارادتمند اہل ترک و تجرید تھے۔ وہو ہذا "عیاضیان ہمیشہ مسافر و تنہا و مجردی بودند وزن خانہ نمی کردند۔" (عیاضیان ہمیشہ مسافر، تنہا اور مجرد رہے اور انہوں نے نکاح نہیں کیا اور مکان نہیں بنایا۔)

اور خانوادہ ہبیر یان کی نسبت جو حضرت ہبیرہ بصری رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے۔ صاحب مراۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ "ہبیر یان در شہر و قریہ مسکن نمی کردند۔ و روز و شب باوضو در بیابانِ مجردی بودند۔" (ہبیر یان نے شہر یا بستی میں سکونت اختیار نہیں کی تھی۔ اور رات دن باوضو جنگل میں تنہا رہتے تھے۔)

علیٰ ہذا صاحب مراۃ الاسرار نے حضرت خواجہ حبیب عجمی رضی اللہ عنہ کے خانوادہ کی نسبت لکھا ہے کہ "عجمیان اکثر در کوہ ہا سکونت داشتند و مجرد بوند۔" (عجمیان اکثر پہاڑوں میں تنہا رہتے۔)

اور امام شعرانی علیہ الرحمۃ نے طبقات الکبریٰ میں لکھا ہے کہ مطرف بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "من ترک النساء و الطعام فلا بد له من ظهور الکرامة" کہ جس نے عورتوں اور لذیذ غذاؤں کو ترک کیا اس سے کرامت کا ظاہر ہونا لازمی ہے۔

اور عمر بن عبدالعزیزؒ بھی بعد خلیفہ ہونے کے تازندگی مجرد رہے۔ چنانچہ آپ کی بی بی فاطمہ کا قول ہے"ومنذولی الخلا فتها ما اغتسل قط من جنابة الی ان مات" کہ جب سے خلیفہ ہوئے تاحیات غسل جنابت نہیں کیا۔

حضرت مالک دینار رضی اللہ عنہ جو سراپا ہدایت تھے ان کے حالات میں صاحب تذکرۃ الاولیا نے لکھا ہے کہ "دربصرہ مردے بودتونگر۔ وفات کردومال بسیر بماند۔ دودخترے داشت سخت باجمال۔ دختر نزدیک ثابتؒ بنائی آمد وگفت میخواہم کہ زن مالکؒ باشم۔ تامرادرکارطاعت یاری دہد۔ ثابتؒ مالک راگفت مالکؒ گفت من دنیا راسہ طلاق دادہ ام۔ وزن ازدنیا است۔ پس مطلقہ ثلاثہ رانکاح نتوان کرد" (بصرہ میں ایک امیر آدمی تھا۔ وہ فوت ہوا تو بہت سا مال چھوڑا۔ اس کی ایک حسین لڑکی تھی۔ لڑکی ثابت بنانی کے پاس آئی اور کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ میں مالک کی زوجہ بن جاؤں کہ وہ عبادت کے کام میں میری مدد کرے گا۔ ثابت نے مالک کو کہا۔ مالک نے کہا کہ میں نے دنیا کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ پس تین طلاقیں جس کو ہو چکی ہوں اس کے ساتھ نکاح نہیں کیا جاسکتا۔)

اور امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمتہ نے طبقاۃ الکبری میں لکھا ہے کہ سعید بن المسیب جو تابعین میں ہیں۔ اور جن کا ۹۴ھ ہجری میں انتقال ہوا۔ وہ فرماتے ہیں"ماشیٔ اخوف عندی من النساء" کہ میرے خیال میں عورتوں سے زیادہ کوئی چیز خوفناک نہیں ہے۔

الغرض طبقہ حضرات صوفیہ کے جملہ مجردین کے صرف اسمائے گرامی کا بھی نہ تفصیل لکھنا آسان نہیں۔ کیونکہ عارفین باتمکین سے دنیا کا کوئی گوشہ کسی زمانہ میں

خالی نہیں رہا۔اس لئے ان خداپرست ہستیوں کے نام نامی کی مکمل فہرست مترتب کرنا یقینی دشوار ہے۔اور خصوصاً میری محدود معلومات تو کسی طرح اس خدمت کے لائق نہ تھی۔مگر تمثیلاً بعض مستند کتابوں سے جن کی صحت کا سب کو اعتراف ہے یہ مختصر فہرست نگارش کی جس میں عرب وعجم کے چند مقتدر اور ممتاز حضرات صوفیہ کرام اور اولیائے عظام کے نام اقدس درج ہیں۔ جو اپنے اپنے عہد میں شریعت وطریقت کے امام و مقتدا۔اور احکام حضرت احدیت کے مطیع اور سنت رسالت کے متبع تھے۔

بلکہ بعض تابعین کے اسمائے گرامی بھی اس میں موجود ہیں۔ جن کو قرن اولے کا فضل حاصل ہے اور یہ برگزیدہ خدا مجرد وآزاد وتجرد کے حامی تھے اور طالبان طریق حق کو تجرید کی ہدایت فرماتے تھے۔جس سے معلوم ہوگیا کہ رضای الٰہی کے لئے تجرید بھی مستحسن ہے۔اور''لا رھبا نیت فی الاسلام''میں جس رہبانیت کی امتناع ہے وہ رہبانیت متبدعہ یعنی اختصار شدن ہے۔اور اگر تجرید مستحسن اور رہبانیت متبدعہ کی تعریف بالمعنی مرادف اور متحد ہوتی تو یہ رہنمائے دین متین تجرد کبھی اختیار نہ فرماتے۔

بلکہ علاوہ ان حضرات کے وہ اصحاب رسالت ماب جو سابق الایمان ہیں۔ اور'' رضی اللّٰہ عنھم و رضو عنہ ''(اللہ ان سے راضی ہوگیا ہے اور وہ لوگ اس سے راضی ہیں۔سورۃ البینہ:۸) جن کی شان میں ہے اور اتباع سنت رسالت میں جو بکمال خضوع خشوع تمام عمر مصروف ومشغول رہے۔اس مقدس جماعت میں بعض اصحاب نے رضائے الٰہی کے واسطے تجرید وتفرید اختیار فرمائی اور مجرد وآزاد رہے۔
مثلاً پروانہ شمع جمال احمدی حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ جو عہد رسالت

مصطفوی کے مشہور زاہد و عابد اور متقی و خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ اور کس اہتمام بلیغ کے ساتھ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم نے اپنا خرقہ مبارک ان کو تفویض فرمایا۔ ان کے مقدس حالات دیکھنے کے بعد اس کا اعتراف کرنا ہوتا ہے کہ آپ نے بالکل زاہدانہ زندگی بسر فرمائی۔ صاحب طبقاۃ الکبریٰ نے آپ کا ایک یہ قول نقل کیا ہے کہ ''السلامة فی الوحدة '' (سلامتی تنہائی میں ہے۔ الحدیث) جس کا ترجمہ حضرت فرید الدین عطار علیہ الرحمتہ نے تذکرۃ الاولیا میں یہ فرمایا ہے کہ ''سلامت در تنہائی است و تنہائی آن بود کہ فرد و بود۔'' (سلامتی تنہائی میں ہے اور تنہائی یہ ہے کہ تو اکیلا رہے۔)

علیٰ ہذا اصحاب صفہ جن کی رفعت و عظمت کا آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ میں ذکر ہے اور تاریخ کے صفحات زبان حال سے شاہد ہیں کہ یہ مردان خدا تمام عمر زہد و ورع صبر و شکر میں ہمہ تن مصروف رہے۔ اور یہ سچے ایمان دار رضائے الٰہی کے طلب گار اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شیفتہ اور جان نثار تھے۔ اور بہ اقتضائے حقانیت یہ برگزیدہ متوکلین تعلقات عالم سے محترز اور دست بردار۔ اور دنیا اور اسباب دنیا سے بے سروکار رہے۔ خوف الٰہی سے لرزاں مسجد نبوی کے صفہ میں یہ فقرائے مہاجرین تنہا اور مجرد رہتے تھے۔ جن کی تجرید کی نسبت صاحب مراۃ الاسرار نے یہ لکھا ہے کہ ''قومے بودند در مدینہ از ارباب فقر و ورع مستقیم بر قدم توکل و تجرد۔ ہر کدام غیر از شغل مع اللہ بکارے کسے دست نمیکر دند و در یگانہ سکونت داشتند۔'' (مدینہ شریف میں ایک قوم تھی جو فقر اور پرہیزگاری والے لوگ تھے۔ اور توکل اور تجرد پر قائم تھے۔ ہر شخص اللہ کے شغل کے سوا کسی اور کام کی طرف ہاتھ نہیں کرتا تھا۔ اور وہ تنہا

رہتے تھے۔)

اورابن حجر نے بھی تجرداصحاب صفہ کی تصدیق کی ہےاورلکھا ہے کہ مسجد نبوی کے آخر میں صفہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب فقرا کے واسطے بنایا گیا تھا۔ جواہل نہ رکھتے تھے۔

اورسیوطی علیہ الرحمتہ نے جوصحیح بخاری پر حاشیہ لکھا ہے اس میں ابونعیم کے حوالے سے منقول ہے کہ جماعت اہل صفہ کی تعدادسو سے زیادہ تھی۔اورصفہ مسجد نبوی کےاخیر میں ایک چبوترہ تھاجوان فقراء کےرہنے کے لئے بنایا گیاتھاجن کی کوئی جائے پناہ نہ تھی۔اورنہ وہ متاہل تھے۔

لیکن تعداداصحاب صفہ میں محققین کااختلاف ہےبعض کاقول ہے کہ اس گر وہ فقراء میں چارسونفوس تھے۔بعض نے سو،بعض نے چالیس ارقام فرمائے ہیں۔بہر کیف علی اختلاف الروایات اصحاب صفہ کی تعداد جو کچھ ہو۔اوران میں کل یا جس قدر بھی مجرداورآزادہوں۔مگر یہ مسلمہ ہے کہ قرن اول بلکہ خاص مہاجرین میں آزاداور مجردین کاوجودضرورتھا۔اوراصحاب کی وہ مقدس جماعت جس کوسابق الایمان ہونے کاشرف واختصاص حاصل ہے۔اس کےبعض افرادترک تزوج فرماتے تھے۔اوران کے معاصر جواہل تزوج اورمتاہل تھے وہ ان مجردین کااحترام کرتے تھےاورنہ شارع اعظم نے ان کے تجردکاانکارفرمایاپس فضل تجرد کےواسطے یہ کافی دلیل ہے۔اس لئے کہ جب اصحاب اجلہ کاترک تزوج فرماناثابت ہےاورصحیح روایات سےمعلوم ہوگیا کہ وہ مجرداورآزاد تھے۔اورحضرت نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے بھی ان کا مجردرہنا قبول ومنظورفرمایاتو وہ خدشہ کہ تجردمنافی اسلام ہے بالکل جاتارہا۔اورظاہرہوا کہ اگر

مطلق تجرد کی امتناع ہوتی تو اصحاب رسالت مآب جو آج متبعین شریعت کے امام اور ملجاء وماویٰ ہیں۔

ایسی صریح امتناع کا ارتکاب نہ فرماتے۔ اور معاذ اللہ اگر ایسے قبیح اور ممنوع فعل کا ان سے وقوع ہوتا تو عالم اسلام میں ان کا وقار وتقدس برقرار نہ رہتا۔ اور نہ سلف صالحین میں وہ شمار کئے جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اور آج تک ان کا نام اسی عظمت و احترام کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔ بلکہ اس قطع علایق سے ان کے اعزاز میں خاص امتیاز ہوگیا۔ اور ان کی تجرید ان کے علوی مرتبت کی دلیل سمجھی گئی۔ حتیٰ کہ بانی شریعت نے اپنے اکرام وانعام میں اضافہ فرمایا کہ قریب مسجد ان کے واسطے صفہ بنایا گیا۔ اور یہ عزت افزائی کی کہ کسب وجہاد کی تکلیف سے ان کو مستثنیٰ کیا۔

لہٰذا اصحاب اجلہ کی تجرید ثابت ہونے کے بعد فضل تجرد اور جواز تجرد کے بجائے اب وجوب تجرد کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ حسب منشاء حدیث ''اصحابی کا لنجوم بأیھم اقتد یتم اھتدیتم۔'' (میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ الحدیث) سیرت اصحاب رسالت ماب کی تقلید ہم کو واجب ہے تو جس طرح ارباب متردجین نے اصحاب متاہلین کی اتباع میں ازدواج ومناکحت کو لازم گردانا۔ اسی طرح طالبان حق کے لئے تجرید میں اصحاب صفہ کی تقلید واجب ہے۔ اور دو حالت میں مآل مستحسن ومحمود ہے۔

ہر چند فضل تجرید کے لئے اصحاب رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تقلید کا حوالہ ہم کو کافی اور بس تھا۔ لیکن فضل تجرید کا بھی ایک درجہ اور باقی ہے۔ جو اصحاب اجلہ کی تجرید سے بھی زیادہ رفیع ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بھی مجرد بلکہ حصور

تھے۔اورآپ کی تجرید ایسی خبر متواتر ہے کہ زیادہ تصریح کی ضرورت نہیں۔

علیٰ ہذا یحیٰی علیہ السلام جو نبی وقت تھے مگر آپ نے بھی تجرید اختیار فرمائی۔ لہٰذا ایک پیغمبر صاحب کتاب اور ایک نبی معصوم کا ترک از دواج فرمانا فضل تجرد کے لئے بہت بڑی دلیل ہے۔اور مجردین مابعد کے مباہات کے واسطے خاص سند ہے کہ فخر کے ساتھ وہ کہہ سکتے ہیں کہ تجرد انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔

اب کامل یقین ہوگیا کہ''لا رهبانیت فی الا سلام '' سے محض تجرد اور ترک از دواج مراد نہیں ہے۔ بلکہ زاہدین متبدعیہ کا شوق تجرید میں انتصاء ہونا مقصود ہے۔ جو عقلاً و نقلاً غیر مشروع اور قطعی ممنوع ہے۔ ورنہ عارفین اور صالحین اور اصحاب رسالت مآب اور نبی اور پیغمبر صاحب کتاب کبھی تجرید نہ اختیار فرماتے۔اس لئے بخوبی یقین ہوگیا کہ رہبانیت مبتدعیہ کی ترہیب و امتناع میں حدیث''لا رهبانیت فی الاسلام ''جس طرح مصدقہ ہے اسی طرح طریق خداطلبی میں ضبط خواہشات کے لئے تجرید محمود ممدوح ہے۔

لیکن یہ تو معلوم ہوا کہ طبقہ حضرات صوفیہ میں بھی صاحب تجرید ہوئے۔اور بعض اصحاب نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم بھی مجرد تھے۔ حتےٰ کہ ایک نبی اور ایک پیغمبر کا حصور ہونا ثابت ہے۔اور انہیں مقدس اور مقتدر ہستیوں کے حوالہ سے ہم نے فضل تجرید کا اقرار کیا۔اور انہیں مقبولان الٰہی کا مقلد دیکھ کر مجردین اہل اسلام کی تجرید و تفرید کو مستحسن سمجھا۔مگر پھر بھی خیال ہوتا ہے کہ ہمارا یہ سمجھنا کلیتاً قابل اطمینان نہیں۔ کیونکہ درحقیقت محمود وہی فعل ہوسکتا ہے جو خدا کے نزدیک محمود ہو۔اس لئے دیکھنا یہ چاہئے کہ ان مجردین کے خالق حقیقی نے بھی ان کی تجرید و تفرید پسند فرمائی یا نہیں۔اگر

حضرت رب العزت نے اہل تجرید کے صبر وضبط اور تجرد وتفرد کو مستحسن جانا ہو۔ اور ان کے ایمان وایقان کی گواہی دی ہو۔ اور ان کی رفعت وعظمت کا اظہار کیا ہو تو اس وقت بغیر کسی شک وشبہ کے فضل تجرید کا مان لینا ہم کو لازمی ہوگا۔ مگر بجز قرآن کی شہادت کے خدا کی رضا مندی دوسرے ذریعہ سے ہم کو معلوم نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اب ضرورت اس کی ہے کہ آیات قرآنیہ کو دیکھیں کہ احکم الحاکمین نے مجردین کے حق میں کیا فرمایا ہے۔

لہٰذا تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شاہد ہے کہ حضرت احدیت جل جلالہ نے اپنے مجرد بندوں کی حمایت فرمائی ہے چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام جو حصور یعنی مجرد کامل تھے ان کی یہ رفعت وعظمت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس پاک مجرد کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ اور مقرب خاص کا خطاب مرحمت فرمایا۔ اور سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا ''اذ قالت الملئکة یٰمریم ان اللّٰه یبشرک بکلمة منه اسمه المسیح عیسی ابن مریم وجیها فی الدنیا والآخرة و من المقربین O'' (سورۃ آل عمران: ۴۵) یعنی فرشتوں نے بشارت دی کہ اے مریم مسیح کلمۃ اللہ تم سے پیدا ہوں گے جو دنیا میں ذی وجاہت اور آخرت میں ان کو مقام قرب ملے گا۔ پس مجرد رہنا اگر ممنوع ومذموم ہوتا تو ایسے مستند حصور کو اللہ جل جلالہ کلمۃ اللہ کا خطاب اور مقربین اور صالحین کا مرتبہ نہ مرحمت فرماتا۔

علیٰ ہذا حضرت یحییٰ علیہ السلام جن کا تجرد کامل اور مسلمہ ہے ان کو بھی رب العزت نے صفات حمیدہ کے ساتھ یاد کیا۔ بلکہ علاوہ دیگر اوصاف کے ان کی تجرید کامل کا ایسے الفاظ میں ذکر فرمایا کہ ان کی تجرید ان کی مدحت میں شمار ہوگئی۔ اور ان کی

علوی مرتبت کی خاص دلیل قرار پائی۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا کہ زکریا علیہ السلام نے جناب باری عزاسمہ میں دعا کی کہ مجھ کواولادصالح مرحمت فرما۔ مجیب الدعوات نے اپنے نبی کی یہ دعا قبول کی۔ اور ہاتفِ غیب نے مولودمسعود کی زکریا علیہ السلام کو جب وہ محراب عبادت میں کھڑے تھے بشارت دی کہ ''ان اللّٰـه یبشرک بیحیٰی مصدقا بکلمة من اللّٰه وسیدا وحصورا ونبیا من الصالحین O'' (سورۃ ال عمران:۳۹) یعنی اللہ خوشخبری دیتا ہے تم کو یحییٰ کی جو کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اور وہ سردار اور حصور اور نبی اور صالحین میں سے ہے۔

اس آیہ کریمہ میں خالق حقیقی نے اپنے مجرد بندہ یحییٰ علیہ السلام کو پانچ صفتوں سے موصوف فرمایا ہے:۔ مصدقا بکلمة من اللّٰه۔ اور سید اور حصور اور نبی اور صالح اور یہ پانچوں صفتیں مہتم بالشان ہیں۔ مگر قابل لحاظ یہ ہے کہ تیسری صفت یعنی حصور اسکو بھی حق تعالیٰ جل شانہ نے اپنے مقبول نبی کے صفات میں بیان فرمایا۔ اور اس اہتمام کے ساتھ کہ وسط صفات میں صفت حصور کو قائم کیا اور دو صفتیں مصدقا بکلمۃ اللہ اور سید ارشاد ہوئیں۔ اور آخر میں نبی اور صالح فرمایا۔ لہٰذا سیاق عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح سید اور نبی اور صالح صفات محمود ہیں۔ اسی طرح حصور بھی خاص صفت حمیدہ ہے۔

چنانچہ حضرات محققین کا یہی مذہب ہے کہ حصور بہت بڑا مرتبہ ہے۔ کہ چند لغوی معنی حصور کے ہوئے۔۔۔۔۔ یعنی عورتوں سے باوجود خواہش کے محترز۔ اور بے پرواہ ہونا ہے۔ اور یہی صاحب شرح نے لکھا ہے کہ ''زحصور بالفتح۔ مردے کہ گردزن نگردد'' (جو عورت کے قریب نہ جائے۔) لیکن حضرات مفسرین نے حصور

کے معنی بکمال شرح وبسط ارقام فرماتے ہیں۔

چنانچہ صاحب تفسیر قادری نے لکھا ہے کہ ''وحصوراً اور مجرد عورتوں سے یالہوو لعب سے اپنے کوباز رکھنے والا''اور تفسیر مواہب الرحمٰن میں ہے کہ''وحصورا: ممنوعا عن النساء۔اور سخت باز رکھنے والا اپنے کوعورتوں سے''۔اور ملاحسین واعظ تفسیر حسینی میں لکھتے ہیں کہ''وباز ایستادہ اززنان یاخودراباز دارندہ ازلہوولعب۔'' (جوعورتوں سے رکنے والا ہویا اپنے آپ کولعب ولہو سے باز رکھے والا ہو۔)اور علامہ فیضی نے تفسیر سواطع الالہام لکھا ہے کہ''وحصورا۔ حاصرا لدرہ طارحا مرالعرس اومحصورا محد ودا صا را اوا ما لا و لھوا ''یعنی حصور کے معنی یہ ہیں کہ خوبی اور پرہیز گاری کے ساتھ روکنےاور عورتوں کی لذت کوچھوڑ نے والا۔''یا محصور ومحدود کرنے والا اور خواہشات لہو سے باز رہنے والا۔اور صاحب تفسیر خازن نے حصور کے معنی یہ لکھتے ہیں کہ'' قال ابن عباس وغیرہ من المفسرین الحصور الذی لا یاتی النساء ولا یقربھن ''یعنی ابن عباس وغیرہ مفسرین نے کہا کہ حصوروہ شخص ہے جوعورتوں سے علیحدہ رہے اوران کے پاس نہ جائے۔اور صاحب تفسیر مدارک نے حضور کے معنی یہ ارقام فرماتے ہیں کہ''ھوالذی لایقرب النساء مع القدرۃ حصر النفسہ ''کہ حصوروہ ہے کہ باوجود قدرت کے عورتوں سے دور رہے اوراپنے نفس کوروکے۔اور علامہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر جلالین میں لکھا ہے کہ''وحصورا ممنوعاعن النساء ''کہ حصوراس کوکہتے ہیں جوعورتوں سے ممنوع کیاگیاہو۔

اور مفسیرین حضرات صوفیہ علیہ الرحمتہ نے حصور کی تفسیر میں نکات معنوی

بھی ارقام فرمائے ہیں چنانچہ صاحب تفسیر عرائس البیان نے لکھا ہے کہ "والحصور الذی حصر ماء ہ من النساء" کہ حصور وہ ہے جو خواہش نفسانیہ کے مادہ کو عورتوں سے محفوظ رکھے۔ اور دوسرا قول آپ کا یہ ہے کہ "والحصور المقدس عن شوائب ا لتقلید وعن الا التفات الی الکونین" یعنی اور حصور وہ ہے جو شوائب تقلید سے پاک اور کونین سے غیر ملتفت ہو۔

اور پھر آپ نے حضرت ابن عطا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "والحصورا المنزہ عن الاکوان ومافیھا" کہ حصور وہ ہے جو کونین اور کونین کی چیزوں سے بے پرواہ اور علیحدہ ہو۔ اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے "الحصور الذی یملک الا یملک" کہ حصور نہ کسی کی ملک میں ہے اور نہ کسی چیز کا مالک۔ اور یہ بھی آپ کا قول ہے کہ "والحصور الذی لایعرف سواء اللّٰہ" یعنی حصور اللہ کے سوا اور کسی کو پہچانتا ہی نہیں۔

الغرض جب حضرات مفسرین کے اقوال سے بالاتفاق یہی ثابت ہے کہ حصور کے معنی مجرد و صابر و ضابط قانع و آزاد اور تعلقات عالم سے دست بردار اور صاحب مراتب علیا اور غیر اللہ سے بے سروکار کے ہیں تو اب بالکل اطمینان ہو گیا کہ تجرید نہایت مہتم بالشان صفت ہے۔ اور اس کا بھی کامل یقین ہو گیا کہ حدیث "لا رھبا نیت فی الاسلام" اسی رہبانیت کی امتناع میں ہے جو شرعاً ممنوع اور مذموم ہے یعنی خصی ہونا اور آلۂ مردانگی کو قطع کرنا۔ نہ محض تجرید کی ممانعت ہے کیونکہ جب صاحب تجرید کی صفت میں نص صریح موجود ہے۔ تو حدیث محض تجرید کی مانع نہیں ہو سکتی ورنہ رہبانیت سے اگر محض تجرید مراد ہوتی تو مشاہیر حضرات صوفیہ اور بعض

اصحاب رسول اللہ اور ایک مقتدر نبی اور ایک پیغمبر صاحب کتاب تجرد نہ اختیار فرماتے۔ اور نہ اللہ تبارک و تعالیٰ ایک مجرد کامل کی صفت میں سید اور حصور ارشاد فرماتا۔

بلکہ امام فخر الدین رازی علیہ الرحمتہ نے تفسیر کبیر میں حصور کے جو معنی ارقام فرمائے ہیں تو منجملہ دیگر اقوال کے قول ثانی میں تجرید کا فضل ثابت کیا ہے۔ اور اس قول کی نسبت لکھا ہے کہ ''وھو اختیار المحققین'' نے اسکو اختیار کیا ہے۔ اور وہ قول یہ ہے کہ انہ الذی لایاتی النساء لا المعجز مل للعفة والزھد'' کہ حصور وہ شخص ہے جو مجبوراً نہیں بلکہ زہد و عفت کی وجہ سے عورتوں کے پاس نہ جائے۔ پھر امام موصوف شرح حصور کے دلائل لکھتے ہیں کہ 'احتج اصحابنا بھذہ الایہ علی ترک النکاح افضل'' کہ اس آیۂ کریمہ سے ہمارے اصحاب نے استدلال کیا ہے کہ ترک نکاح افضل ہے کیونکہ ''لا نہ تعالے مدحہ بترک النکاح'' کہ اللہ جل جلالہ نے مدح فرمائی ہے (یحییٰ علیہ السلام کی) تجرد کے سبب سے ''وذلک یدل علی ان ترک النکاح فضل تلک الشریعة'' اور (خدا کا مدح فرمانا) اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ شریعت ہذا میں ترک نکاح افضل ہے۔ ''واذاثبت ان ترکہ فی تلک الشریعة افضل و جب ان یکون الامر کذلک فی ھذاہ الشریعة بالنص والمعقول'' اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ ترک نکاح اس شریعت میں افضل ہے تو نقلاً و عقلاً ایسا ہی حکم اس شریعت میں ہونا چاہئے۔

اس کے بعد امام موصوف نے دلیل نقلی و عقلی کی تفصیل میں پہلے شرعی استدلال یہ فرمایا کہ 'اما النصو فقولہ تعالے اولئک الذی ھدی اللہ و

فبھداھم اقتدہ ''یعنی جن کواللہ نے ہادی کیا ہےان کی اقتدا کرو۔اور معقول دلیل آپ نے ہی پیش فرمائی ہے کہ''واما المقول فھوان لا صل فی الثابت بقاء علی ما کان والنسخ علی خلاف الاصل'' کہ دلیل عقلی یہ ہے کہ جب اصل کی بقا ثابت ہے جیسی کہ تھی تو منسوخ ہونا خلاف اصل ہے۔

امام رازیؒ نے بہ کمال صراحت اور صاف لفظوں میں ثابت فرمایا کہ وہ فعل جس کی احکم الحاکمین نے مدح فرمائی وہ یقینی افضل اور مستحسن ہے اور استدلال شرعی و عقلی سے یہ واضح کردیا کہ جس طرح یحیٰؑ علیہ السلام کے واسطے تجرید کامل موجب فضل اور علوی مرتبت ہوئی اسی طرح شریعت اسلام میں ترک نکاح افضل ہے اور ہونا چاہئے۔

امام رازی علیہ الرحمتہ کی اس مدلل تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ تجرد کو فضیلت اس وجہ سے ہے کہ جنابت احدیت جل جلالہ نے اس کی مدحت فرمائی۔اور مثل دیگر صفات حمیدہ کے اپنے نبی کی شان میں حصور بھی ارشاد کیا۔اور یہ خصوصیت تجرید کی عظمت کے واسطے کافی ہے۔

لہٰذا اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔اور بقول حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمۃ جس طرح اہل انتظام کے لئے تزوج لازمی اور ضروری ہے۔اسی طرح صاحب ریاضت ومجاہدات کی تفریغ خاطر کے واسطے تجرید مناسب اور مفید ہے۔اور اسی اعتبار سے ہمارے سرکار عالم پناہ نے عام مریدین کو مناکحت کی امتناع نہیں فرمائی۔لیکن غلامان خرقہ پوش کے حق میں تجرید کی متواتر تاکید بھی ہوئی۔اور اپنے خرقہ میں لنگوٹ بھی شامل فرمایا۔جو تجرید کی خاص نشانی ہے۔جس کی وجہ یہ ہے

کہ جناب حضرت حصور یعنی مجرد کامل تھے کہ ازدواج کی جانب کبھی التفات نہیں فرمایا۔اسی مناسبت سے آپ کے خرقہ اقدس کی ہیئتِ مجموعی زبان حال سے شاہد ہے کہ یہ زاہدانہ وضع اور اہل تفرید کامخصوص لباس ہے۔اورلنگوٹ سےتو صاف ظاہر ہے کہ مشرب وارثی میں تجرید مقدم اور لازمی ہے۔

چنانچہ حاملان خرقہ وارثی کا یہی مشرب ہے اور جملہ تہبند پوش مجرد اور آزاد رہے۔اوراس لازمی شرط کی کامل پابندی کی۔بجز شاذ فقراء کے۔جن کومنشاء جناب حضرت نے تاہل کی رخصت دی۔یاقبل تہبند پوشی کے وہ متاہل تھے۔اورحضور نے کسی مصلحت سے ان کا اہل وعیال کے ساتھ رہنا مناسب سمجھا۔ورنہ عموماًغلامان خرقہ پوش مجرد اور اسباب دنیا سے بےتعلق اوراہل دنیا کے بےغرض ہمیشہ کسی گوشۂ تنہائی میں مسکن گزیں رہے یا مسافروں کی طرح سیر وسیاحت میں یوں زندگی بسر کی کہ جسے خلوص ومحبت سے مہمان بنایااس کے عارضی طور پر مہمان ہوئے۔

اور پھر خدا کے بھروسہ پر سفر کیا۔ بلکہ اعزاواقربا کے یہاں روزمرہ کی برادرانہ آمدورفت ونیز تقریبات کی شرکت سے محترز رہے۔جو ہادی برحق کی خاص تقلید ہے کیونکہ سرکار عالم پناہ کی عادات میں ہے کہ شادی وغم کی تقریب میں آپ شریک نہیں ہوئے۔جس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ علائق دنیوی کے لوازمات کوبھی آپ نے قطعی منقطع فرمایااوراہل تجرید وتفرید کے لئے بےغرض اورزاہدانہ زندگی بسر کرنے کی مثال قائم کردی۔

چونکہ ہادی برحق نے فقرائے تہبند پوش کوتوکل خاص کی ہدایت فرمائی ہے اس لحاظ سے جملہ شرائط وقیود بھی وہی تجویز کئے گئے جوقناعت کے خلاف اورزہد کے

منافی نہ ہوں۔

چنانچہ جس طرح ان کو لباس سادہ اور بے تکلف مرحمت ہوا اسی طرح ان کے لباس کے ساتھ جو دیگر لوازمات ہیں ان کو بھی مختصر اور محدود کر دیا۔ اور اپنے غلامان خرقہ پوش کے لئے کلاہ و دستار کا استعمال اور جوتہ اور پائتابہ پہننا قطعی ممنوع گردانا۔ بلکہ ان کا ترک مشرب میں داخل کر دیا۔ اور مختلف عنوان سے اس کی ممانعت فرمائی۔

مثلاً ایک طریقہ امتناع کا اس کو بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضور کا حکم عام تھا کہ بوقت تہبند پوشی طالب فقر کے قدیم لباس کے ساتھ اس کی ٹوپی اور جوتہ بھی خیرات کر دیا جائے۔ اور بغیر کسی امتیاز کے ہمیشہ اس فرمان وارثی کے مطابق عمل درآمد ہوتا رہا۔ جس کا صاف منشاء یہی ہے کہ خرقہ وارثی دنیا کے معمولی اسباب تکلفات سے محفوظ ہے۔ اور یہ طریق عمل زبان حال سے شاہد ہے کہ مقتدائے کامل نے روز اوّل اپنے فقرا کو سمجھا دیا کہ جس طرح لباس قدیم کا استعمال آئندہ تمہارے واسطے ممنوع ہے۔ اسی طرح ٹوپی اور جوتہ بھی پہننا اب تمہارے مشرب کے منافی ہے۔ اس کو ترک کرو۔ اور ننگے سر اور پابرہنہ راہ طلب میں سرگرم جستجو رہو۔ جو عاشقان صادق کی تقلید بھی ہے۔ اور محبت کا لازمی نتیجہ بھی۔ اور اصولاً بھی طریق عشق میں آرام و آسائش کا خیال کرنا اور زینت و زیبائش کا سامان رکھنا طالب کے واسطے مکروہ ہے۔

بلکہ یہ حکم امتناعی بعنوان ہدایت صاف لفظوں میں بھی صادر ہوا ہے۔ جس سے بغیر کسی تاویل کے اس ممانعت کی اہمیت اور قطعیت بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ٹوپی اور جوتہ پہننا زہد کامل کے خلاف اور خرقہ وارثی کی شان و عظمت کے قطعی منافی ہے چنانچہ جناب حضرت نے بہ کمال صراحت فقرائے تہبند پوش سے

مخاطب ہو کر اکثر فرمایا ہے کہ ''ٹوپی اور جوتہ تو فقط آرام کے لئے پہنتے ہیں اور فقیر کو آرام و تکلیف برابر ہے۔'' اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''ٹوپی اور جوتا جس طرح دنیادار کے لئے ضروری ہے اسی طرح فقیر کے واسطے جھگڑا ہے۔'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''ادب یہ ہے کہ راہِ طلب میں فقیر ننگے سر اور ننگے پاؤں ہو۔'' اور اکثر ارشاد ہوا کہ ''فقیر کو زینت سے کیا کام۔'' اور بعض فقرا سے تو خاص طور پر بہ تاکید ارشاد ہوا کہ ''ٹوپی، جوتہ، کرتہ، پائجامہ کبھی نہ پہننا۔'' اور یہ تو متواتر حضور نے فرمایا ہے کہ ''ہم نے ٹوپی بھی دے دی اور جوتہ بھی پھینک دیا۔''

ارشادات مذکورہ میں فقرائے تہبند پوش کو جوتہ اور ٹوپی پہننے کی صریح امتناع ہے۔ اور صاف لفظوں میں ہدایت فرمائی ہے کہ راہ طلب میں جوتا پہننا آداب عشق کے خلاف ہے۔ بلکہ دیگر اسباب آرام و عافیت کو بھی منافی مشرب گردانا۔ اور زہد و قناعت کا اصول بتادیا کہ راہ فقر میں آرام و آلام کا فرق و امتیاز نہیں ہے۔

علاوہ اس کے اگر حاملان خرقہ وارثی کو یہ صریح ہدایت نہ بھی ہوتی تو اس حالت میں بھی ان کو تقلید شیخ لازمی تھی۔ کیونکہ خود حضور نے جیسے احرام کو اپنا لباس مستقل قرار دیا کلاہ و دستار کبھی زیب سر نہیں فرمائی۔ اور نہ پائے مبارک کے لئے موزہ اور پائتابہ پسند کیا۔ بلکہ آپ کی خصوصیات میں ہے کہ سر اقدس ہمیشہ بے حجاب اور پائے مبارک برہنہ رہے۔ صرف ضرورت خاص کے وقت نعلین چوبی کو قدم بوسی کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے فقرائے تہبند پوش کو جوتہ اور ٹوپی پہننے سے احتیاط قطعی واجب ہوئی۔ کیونکہ یہ مسلمہ ہے کہ مشرب شیخ مرید کی عین ملت ہے۔ اور تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترک معمولی نہیں ہے۔ بلکہ اس امتناع میں خاص

اہمیت اور اس کو مشرب وارثی سے گہرا تعلق ہے۔اس لئے کہ دیکھا یہ گیا کہ بعض فقراء کوان کی حالت کے لحاظ سے سرکار عالم پناہ نے کسی شرط کی تعمیل سے مستثنٰی بھی کیا ہے مگر یہ حکم ایسا قطعی ہے کہ اس کی بجا آوری میں کوئی رعایت نہیں کی گئی۔اور کسی تہبند پوش کو کسی عذر کی وجہ سے جناب حضرت نے جوتا اور ٹوپی پہننے کی رخصت نہیں دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔کہ یہ ترک لازمی ہے اور حامل خرقہ وارثی کو واجب ہے کہ جوتہ اور ٹوپی پہننے سے احتراز کرے۔اور پیشوائے برحق کے تصرف سے ایسا ہی ہوا کہ عموماً فقرائے وارثی نے اپنے ہادی کامل کی تقلید کا شرف بھی حاصل کیا اور اس حکم قطعی کی پوری تعمیل بھی کی۔یعنی کلاہ ودستار، جوتہ اور پائتابہ ہمیشہ کے لئے ترک کیا۔

علیٰ ہذا ہادی کامل کی مخصوص اتباع یہ بھی ہے کہ فقرائے وارثی سر کے بال نہ قصر کرواتے ہیں نہ حلق۔کیونکہ جناب حضرت کے موئے مبارک جو بہت گنجان اور نہایت نرم وباریک تھے۔وہ ہمیشہ قصر وحلق سے محفوظ رہے۔اور عجیب تر خوبی یہ تھی کہ ہر چند پر پیچ نہ تھے لیکن شانہ کرنے کے بعد دوش اقدس سے اوپر اور نرمۂ گوش کے قریب رہتے تھے۔

اس مسئلہ میں حضور کے کسی حکم صریح کا علم مجھ کو نہیں ہے ممکن ہے کہ آپ نے کسی فقیر کو حلق وقصر کرانے کی ممانعت صاف لفظوں میں بھی فرمائی ہو۔لیکن خیال یہ ہوتا ہے کہ غلامان خرقہ پوش نے جس طرح دیگر امور میں جناب والا کی تقلید کی ہے۔ اسی طرح اپنے آقائے نامدار کی تبعیت میں سر کے بال قصر کرائے نہ حلق۔اور وہی وضع اختیار کی جو عاشقان باصفا اور زاہدان بے ریا کا طریق ہے۔

اور فقرائے وارثی کا عام طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کے بستر میں تکیہ نہیں ہوتا۔

بلکہ احتیاط یہ ہے کہ نہ پس پشت تکیہ لگاتے ہیں نہ تہ زانو رکھتے ہیں۔اور یہ احتراز لازمی اور خصوصیت کے ساتھ داخل مشرب اس وجہ سے ہوا کہ سرکار عالم پناہ نے تکیہ رکھنا کبھی پسند نہیں کیا۔ ہمیشہ بر پہلوئے راست استراحت فرمائی۔ اور بجائے بالش دست یمین زیر سر رہتا تھا۔ بلکہ تکیہ کے ذکر سے آپ کو قطعی نفرت تھی چنانچہ اکثر آپ نے فرمایا ہے کہ ''فقیر کو تکیہ کی ضرورت نہیں۔'' اور یہ بھی فرمایا ''فقیر کا تکیہ اللہ پر ہو تو وہ فقیر ہے۔'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ''ہم نے کبھی تکیہ نہیں رکھا۔''

بلکہ شکوہ آباد کی علالت کے بعد چونکہ ضعف بہت ہوگیا تھا تو بعض اہل ارادت نے بصد اصرار ایک رضائی لپیٹ کر سرہانے لگا دی تا کہ استراحت میں حضور کے دست مبارک کو تکلیف نہ ہو۔ مگر جناب والا کے طریق استراحت میں تغیر نہ ہوا۔ جب آرام فرماتے تو سر اقدس کے نیچے دست مبارک ضرور رہتا تھا۔ اس کی تقلید آپ کے فقرائے تہبند پوش نے کی۔ اور ہادی کامل کی اتباع میں تکیہ رکھنا قطعاً ترک کیا۔

لیکن سر کے بال قصر وحلق کرانے سے قطعی احتراز اور تکیہ رکھنے سے ایسا انکار جو جزو مشرب شمار ہو جائے۔ اس کو حضور نے کیوں اختیار فرمایا۔ اور پھر عموماً فقرائے وارثی نے تعمیلاً خواہ تقلیداً ہر دو شرائط کی بکمال استقلال پوری پابندی کس واسطے کی۔ کیونکہ بظاہر تو ان دونوں مسئلوں میں مفاد طریقت نظر نہیں آتے۔ مگر کتب سیر کی ورق گردانی کرنے سے ان کی اہمیت بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اور بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض سلف صالحین اور اکثر حضرات عاشقین کا یہی طریقہ تھا۔ جس کا ذکر نفحات الانس، تذکرۃ الاولیاء، طبقاۃ الکبریٰ وغیرہ کتب معتبر میں بصراحت موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زہد کامل کی یہی تعریف ہے کہ ترک قطعی ہو۔

حتیٰ کہ روایات شریعہ سے بھی اس طریق ومشرب کی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ منقول ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی یہ خاص سنت ہے کہ ہمیشہ آپ کے سر کے بال تابدوش رہے۔ بلکہ نزول کے وقت بھی آپ کی یہی وضع ہوگی۔اور حلیۂ عیسوی اسی نشانی کے ساتھ مذکور ہے کہ آپ کے لباس میں دو چادریں زرد ہوں گی اور سر کے بال دراز اور چمکدار ہوں گے۔

علیٰ ہذا یہ بھی منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تکیہ بھی کبھی نہیں رکھا ہمیشہ فرش زمین پر استراحت فرمائی۔اور بجائے بالش خشت یا پتھر کا ٹکڑا زیرسر رکھتے تھے۔جو آپ کے زہد کامل کی عین دلیل ہے۔اور چونکہ مشرب وارثی حضرت کلمۃ اللہ کے مذاق ومشرب سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔شاید اسی وجہ سے جناب حضرت نے نہ سر کے بال قصر وحلق کرائے اور نہ کبھی زیرسر تکیہ رکھا۔اور آپ کی تقلید آپ کے غلاموں نے کی۔اور ہمیشہ ہمیشہ کریں گے۔اور اسی تبعیت کا یہ صلہ ہے کہ فیضان مرشد نے ان کو ادنےٰ سے اعلےٰ اور خاک سے پاک کر دیا۔ بقول حافظ شیرازؒ

کیمیا ئیست عجب بندگی پیر مغاں
خاک او گشتم و چندین در جاتم دادند

(پیر مغاں کی بندگی ایک عجیب کیمیا ہے۔ میں اس کی خاک بن جاؤں جو اس کے پاؤں کے ساتھ مس ہوتی ہے۔)

الغرض ارشادات مذکورہ کے مضامین سے صاف ظاہر ہے کہ سرکار عالم پناہ نے اپنے فقرائے تہبند پوش کو طرز معاشرت کی نسبت بھی وہی ہدایت فرمائی جو طالب راہ فقر کے واسطے نہایت مفید ہے۔اور ان کیلئے ظاہری شرائط مشربی بھی وہی تجویز

ہوئے جو تارک دنیا اور متوکل خاص کی تفریغ کے واسطے لازمی اور ضروری ہیں۔ کیونکہ مسلمہ ہے کہ طالب فقر جب دنیا سے دست بردار ہوگا تو ارباب دنیا سے اس کو سروکار نہ ہوگا۔ چونکہ خواہشات کی فکر اور مرادات کا خیال صریح حارج اوقات ہوتا ہے۔ اس لئے حضور نے فقرائے تہبند پوش کی ضروریات زندگی کو کلیتہً مختصر اور محدود کر دیا اور اپنا مقدس خرقہ جس کو کفن سے تعبیر کیا جاتا ہے کفن قرار دے کر اشاراً "موتو اقبل ان تموتو" (مرجا مرنے سے پہلے) کا مفہوم سمجھا دیا جو طریقت کا نتیجہ آخری اور اہل طریقت کا عین مقصود ہے۔ چنانچہ خرقہ وارثی جس طرح سادہ اور بے تکلف اور عاشقانہ وضع میں زاہدنہ لباس ہے اسی طرح دیکھا یہ گیا ہے کہ حاملان خرقۂ وارثی نے عموماً نہایت سادگی سے زندگی بسر کی۔ ہر چند مختلف طبقات اور مختلف اقوام و مذہب کے افراد کو خرقہ پوش ہونے کا شرف اختصاص حاصل ہوا مگر ترک لباس کے بعد اکثر مردہ صفت ہوکر۔ "کالمیت بیدہ الغسال" (جس طرح کہ میت غسل دینے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔) کے مصداق ہوگئے اور "وعد نفسک فی اصحاب القبور" (اور اپنے آپ کو اصحابِ قبور میں سمجھ) کی حقیقی صورت دکھادی۔ کہ ہر حال میں صابر و ضابط اور ہر امر راضی برضائے الٰہی رہے۔ دنیا کی زیب و زینت کو حرام سمجھا۔ نہ راحت کی خوشی نہ تکلیف کا ملال۔ نہ عزت کی جستجو نہ ذات کا خیال ہمیشہ بلبل شیراز کے ہم نوا ہوکر زبان حال سے کہتے رہے۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلان
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ یہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہم عزت اور شان نہیں چاہتے۔)

اور بعض حضرات کی وصال شاہد حقیقی کے خیال میں وفور شوق سے یہ کیفیت بھی ہوئی ہے کہ عالم محویت میں قدیم معلومات قطعاً فراموش ہو گئے۔

چنانچہ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ ملا رضی الدین صاحب بغدادی جو پہلے علم و فضل میں مشہور تھے مگر تہبند پوش ہونے کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ تبحر و تحقق خواب و خیال ہو گیا۔ جدید سبق تو خوب یاد کیا لیکن آموختہ ایسا بھولے کہ حرف شناس بھی نہ رہے۔ بقول

جبھی جا کے مکتب عشق میں سبق مقام فنا لیا

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

لہٰذا فقرائے وارثی کا زہد و توکل، ثبات و استقلال، ریاضت و مجاہدت بھی اپنی نظیر آپ ہے اور ان کے حالات اسی لائق ہیں کہ بہ تفصیل لکھے جائیں۔ لیکن چونکہ طوالت کا خیال ہے اس لئے انشاءاللہ آئندہ بصراحت نگارش کروں گا۔ اور اب رسالۂ ہذا اس گذارش کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ حضور کے ارشادات جن کو مسلک و مشرب سے گہرا تعلق ہے اگر تمام و کمال لکھے جاتے تو ضخیم دفتر ہو جاتا بہ نظر اختصار اور احتیاط ضروری فرمان اور مخصوص وہی احکام نقل کئے جن کا علم جملہ حاضر باش غلامان بارگاہ وارثی کو اس وجہ سے ہے کہ جناب حضرت نے ان کی ہدایت متواتر اور عام طور پر فرمائی اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ارشادات کو تعمیم کا مرتبہ حاصل ہے کیونکہ فقرائے وارثی ہمیشہ ان کی تعمیل میں سرگرم اور ہمہ تن مصروف رہے۔ اور یہ قیود داخل مشرب سمجھے گئے۔ اور ان میں ترمیم و تنسیخ اور اضافہ ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ اور انھیں شرائط و قیود کی پابندی اور عدم پابندی ایسا معیار ہے کہ وارثی اور وارثی نما فقرا کا امتیاز

بہ آسانی ہوسکتا ہے۔

اسی واسطے وہ فرمان جن کی شخصی اور انفرادی حیثیت تھی۔ اور وقتاً فوقتاً بعض فقرا کے حق میں مخصوص طور پر صادر ہوئے۔ اور کسی مشربی شرط میں ان کو عارضی یا ہمیشہ کے لئے رخصت دی گئی ان کو عمداً اس لحاظ سے نگارش نہیں کیا کہ مشربی شرائط کی بحث میں شخصی ہدایات کی تمثیل نہ مفید ہے نہ موزوں۔ البتہ ملفوظات کے سلسلہ میں ان کا بھی ذکر ہوسکتا ہے۔

لیکن رسالہ ہذا میں یہ کمی ضرور ہے کہ میری عدم استعداد کے باعث وہ ارشادات جن کا نکات فقر اور حقائق معنوی سے تعلق تھا بالکل چھوٹ گئے۔ اور اس کا سبب یہی ہے کہ مجھ ایسا نااہل اور ظاہر بین اسی قدر جسارت کر سکتا تھا کہ وہی احکام نقل کرے جن کی فقرا کو عام فہم الفاظ میں متواتر ہدایت ہوئی۔ اور ظاہری شرائط و قیود سے جن کا تعلق ہے۔ اور نمایاں طور پر جن کی تعمیل حاملان خرقہ وارثی کو کرتے دیکھا اور بظاہر جن کے مفہوم تک ہمارے ادراک کی بھی رسائی ہو۔ ورنہ باطنی دقائق اور روحانی حقائق یا کسی مخصوص ہدایت کی شرح اور صراحت مجھ نابلد راہ طریقت سے یقینی ناممکن اور محال تھی۔ کیونکہ رموز معنوی سے ایک سگ دنیا کا آگاہ ہونا قطعاً دشوار بلکہ خلاف قیاس ہے۔

لیکن مشرب وارثی کے یہ ظاہری شرائط و قیود بھی جن کی تعلیم و ہدایت فقرا کو عام فہم اور معروف الفاظ میں ہوئی۔ اور جن کو روزمرہ کے طرز معاشرت سے زیادہ سروکار ہے۔ ان کو بھی طریقت کے جملہ خصوصیات سے مملو پاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں شرائط و قیود کے ظاہری مفہوم کو اور خرقہ وارثی کی ظاہری ہیت مجموعی کو بھی اگر بہ نظر

غائر دیکھا جائے تو اس لطیف اور مقدس مشرب کا خلاصہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سامان عیش و آرام اور اسباب ننگ و نام سے دستبردار ہوکر بکمال صبر و استقلال متوکلین خاص کے طریقہ پر زندگی بسر کرنا۔ اور اسباب دنیا سے ترک و تجرد۔ اور تعلقات دنیا سے انقطاع قطعی اور استعانت غیر اللہ سے احتراز کامل اور شوق وصال میں اپنی ہستی کو ہستی شاہد حقیقی کے سامنے نیست و نابود کرنا ہے۔ اور یہی عشق الٰہی کا لازمی نتیجہ اور طریقت کا عین تکملہ ہے۔

بلکہ انہیں قیود و شرائط کی شرح اگر کوئی اہل دل اور واقف رموز طریقت لکھتا تو اسکی دوسری شان ہوتی اور انہیں شرائط قیود کی حقیقی خوبیوں کا اظہار ہوتا۔ اور معلوم ہوجاتا کہ حاملان خرقہ وارثی کے ظاہری شرائط مشربی بھی حقائق معنوی سے مملو ہیں اور فقرای وارثی کا طرز معاشرت بھی زہد و توکل کے مخصوص مدارج سے وابستہ ہے اسی سلسلہ میں بکمال ادب یہ بھی گذارش کروں گا کہ میری اس عامیانہ تحریر میں اگر کوئی غلطی ہو۔ اور ضرور ہوگی۔ کیونکہ انسان خطاونسیان کا مجموعہ ہے تو ناظرین والاتمکین تصحیح فرما کر مجھ ہیچمدان کو اپنا ممنون فرمائیں۔

والسلام خیر ختام

تقریظ بے مثل تاریخ نایاب

ازنتیجہ فکر جناب فیض مآب مستغرق الی اللہ حضرت حاجی اوگھٹ شاہ صاحب وارثی مدظلہ العالی مقیم بچھرایوں ضلع مراد آباد

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست

آخر آمد ز پس پردہ تقدیر پدید!

(تمام تعریف اللہ کیلئے ہے۔ جودل چاہتا ہے آخر کار وہی تقدیر کے پردہ سے ظاہر ہوتا ہے۔یعنی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔)

اللہ اللہ بعد انتظار بسیار یہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی کہ سیدی ومولائی، وارثی و آقائی، ہادی مطلق، مرشد برحق، سرکار عالم پناہ، آیۂ من آیات اللہ حضرت وارث پاک خلف الصدق صاحب لولاک سلام اللہ علیہ وعلی آباۂ الکرام کے وہ مقدس احکام کو فقرائے تہبند پوش کے مشرب ومسلک سے خاص تعلق ہے مگر ہنوز متفرق طور پر مختلف خدام کے گوشہ قلب میں مستور تھے۔لیکن بفضلہٖ آج ہمارے منبع فیض وتصرف کی قوت کاملہ نے یہ کرشمہ دکھایا کہ اپنے ایک غلام کے ہاتھ سے اس منتشر ذخیرہ کو مجتمع کرادیا۔ یعنی اخی ملت مرزا محمد ابراہیم بیگ شیدا وارثی نے بہ کمال حسن سعی اس جواہر گنج سینہ کو درج سفینہ کیا۔اوراس مشربی دستورالعمل کی شیرازہ بندی سے غلامان وارثی کو عموماً اور فقرائے تہبند پوش کو مخصوص طور پر مرہون منت فرمایا۔ونیز برادر موصوف نے فرامین وارثی کی شرح اس خوبی سے کی اوران کی خصوصیت اوراہمیت ایسے مستند طریقہ سے

دکھائی کہ مطالعہ کے بعد بجز نعم کے لا کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا یہ فقیر بھی اپنے خواجہ تاش مولف ممدوح کے شکریہ میں حضرت لسان الغیب کا ہم نوا ہو کر بصد خلوص عرض کرتا ہے کہ۔ ''جزاک اللّٰہ فی الدارین خیرا''۔ اور تاریخ طبع نذر ناظرین ہے:۔

کرد تالیف نسخہ شیدا	تحفۂ خاص بہر حق بین ہست
آنچہ فرمود وارث نبوی	پے سالک بطور آئین ہست
کردہ شرحش مدلل و مبسوط	قابل صد ہزار تحسین ہست
بہر عشاق نسخہ ہذا	درد دل را دوائے تسکین ہست
نقش تسخیر و حرز جانِ ملول	درنگاہ عقیدت آگین ہست
بہر شالش دلم چوشد مضطر	گفتمش چوں حزین وغمگین ہست
باز آمد ندا بگو اوگھٹ	این سلوک مقام تمکین ہست

۱۳۴۳ھ

(شیدؔا نے یہ نسخہ تلیف کیا۔ حق بیں لوگوں کیلئے یہ ایک خاص تحفہ ہے۔ جو کچھ نبی پاکؑ کے وارث نے فرمایا وہ سالک کیلئے بطور اصول ہے۔ آپ نے اس کی ملل اور مبسوط شرح کی۔ کو کہ قابل صد ہزار تحسین ہے۔ عاشقوں کیلئے یہ وہ نسخہ ہے کہ جو دردِ دل کیلئے سکون کی دوا ہے۔ یہ مسخر کرنے والا نقش ہے اور پریشان جان کیلئے تعویذ ہے اور نگاہ کیلئے عقیدت کا سامان ہے۔ یہ مجھے خوشی دیتا ہے جب میرا دل بے چین، پریشان اور غمگین ہو جاتا ہے۔ پھر ندا آئی اوگھٹؔ کہہ یہ باعزت مقامِ سلوک ہے۔)

تقریظ ریختہ کلک گوہر بار جناب مولوی عمران احمد صاحب وارثی مدظلہ العالی تعلقدار ہیوا ضلع سیتاپور

این زمان جان د امنم برتافتہ است
بوئے پیراہان یوسف یافتہ است

داورِ گیہان رانیائش و وخشور یزدان راستایش۔ وارثیان رامژدۂ جانفزا ویزدانیان رانویدروان افزا۔ بادہ کشان جام بیخودی رادرددی وددرد کشان ایاغ دررع ختگی راسرودے کہ نگارے رعنا بہزاران ہزار کرشمۂ رخ زیبائی خودبجہانیان وانمودو شاہدے زیبا از پردۂ پنہانی بجلوۂ مستانہ برون خرامید۔ آرے این نگار رعناوشاہد زیبا کہ بخش دوم ازارشادات وارثیہ است۔ از دانشہائے آشکارا آراستہ وبینش ہائے نہانی پیراستہ است۔ از دیر باز گیہانیان چشم برراہ وآفریدگان گوش برآواز بودند کہ ناگاہ از سپہرے افرازستان بفرودین تارستان فرودآمد۔ یلا یلا اے جان سپاران مہین مرشد پاک وشیفتگان بہین فرزند صاحب لولاک کہ پیش ازیں بساکس از پرستاران وارثی نامہاز گاشتند وخامہا فرسودند مگر ہیچ یکے بدین مانا فرہنگے نساخت کہ ازبایستنی ہائے بایستہ وشائستنی ہائے شایستہ گوہرآگین بودے۔ کہ رہروان رادستور بود۔ وناراستان رارخنہ بندی باشد۔ نازم گرامی برادر محمد ابراہیم بیگ شیدارا کہ از ژرف نگہی بدین رخنہ پے بردوتنومندی خردوایزدی نیروازتراوش خامہ خامہ شگرف پیش آورد کہ اگراوراگزین دستور ژندہ پوشتیان وارثی گویم زیبد واگرفرخ آئین دردن پردرآن مرشدی خوانم

شاید

حروفش چہرہ آرائے گلستان   سطورش رونمائے سنبلستان

بنام ایزد کہ در نگارش این گرامی نامہ گرانمایہ نگارندہ چہ مایہ رنجہا کہ نبردہ وچہ۔۔۔۔نہا کہ نخوردہ ہمنا کہ دریارا بکوزہ آوردہ کوہ راکاہ نمودہ۔ بوشیرہ گفتار چنین یگانہ گیتی و یکتائے روزگار را کہ از خادر تا باختر ہمتاو ہمال خویش نداشت۔ بدین نہجار سر دون زبین شیوہ نوشتین کار ہر کس جزاو نبود وچنین پہن دشت را بااین زیبائی پیمودان ہر رہروز ہرہ نداشت۔ والا گہر نامہ وخداوند نامہ ہچودریائے بے پایان ومن بے نواو ناآشنارادست وپاخفتہ۔ زیبد کہ سر بہ گریبان فرو برم کہ ازین اندیشۂ لرزہ اندامم رادر گرفتہ است وخامہ ام بسر درآمد۔

(اس وقت جان نے میرا دامن بدل لیا ہے۔ یوسف کے پیراہن کی خوشبو اس نے حاصل کرلی ہے۔ تمام تر حمد وثنا پروردگارِ عالم کیلئے اور تمام تر تعریفیں اللہ کے رسول ﷺ کیلئے۔ وارثیوں کیلئے مژدۂ جانفزا اور اللہ والوں کیلئے روح پرور خوشخبری، مست کرنے والے جام کو پینے والے مے نوشوں کیلئے شرابِ دُرد۔ اور مستی والا پیالہ پینے والوں کیلئے گیت ہے۔ خوبصورت محبوب نے اپنے خوبصورت چہرے کو ہزاروں کرشموں کے ساتھ جہان والوں کے سامنے ظاہر کیا۔ خوبصورت محبوب جو ہزاروں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ہزار ہا ناز نخرے سے اپنے رُخِ انور کو دنیا والوں کیلئے ظاہر کیا۔ اور خوبصورت معشوق پوشیدہ پردہ سے مست لوگوں کیلئے جلوہ افروز ہوا۔ یہ خوبصورت محبوب کون ہے؟ یہ ارشاداتِ وارثیہ کا دوسرا حصہ ہے۔ علم وعقل سے آراستہ ہوکر ظاہر ہوا۔ پوشیدہ مجلس سے سجا ہوا ہے۔ کافی دیر سے جہان والے انتظار کر رہے تھے۔ اور

مخلوقِ خدا آواز پر کان لگائے ہوئے تھے کہ اچانک آسمان سے نوازنے والے ستارے موسم بہار میں نیچے آئے۔ جان نثارانِ مرشد پاک فرزند صاحبِ لولاک، پرستارانِ سلسلۂ وارثیہ نے کئی خط لکھے۔ سالکین کی ضرورت اور اعلیٰ خواہشات کی نسبت سے یہ صحیفہ موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مسافروں کیلئے ایک اصولِ راہ ہے۔ اور گم کردہ راہوں کیلئے راستے کا رہنما ہے۔ میں ناز کرتا ہوں کی برادرم محمد ابراہیم بیگ شیدؔا پر کہ گہری نگاہ سے ان لطائف کا سراغ لگایا اور عقل کی پختگی کی وجہ سے اور اللہ کی عنایت سے، عمدہ قلم سے انہیں قلمبند کیا۔ اگر اس کو وارثیوں کے لباس کی گودڑی پسند کرنے والا کہوں زیادہ موزوں ہوگا۔ اور اگر اس مبارک عادات والے، کہ جس کی مرشد نے دل سے تربیت فرمائی ہے اس کے بارے میں یہ بات کہوں تو یہ بھی بجا ہے کہ اس کے حروف باغ کے چہرہ کو آراستہ کرنے والے ہیں۔ اور اس کی سطریں اس سنبلستان کی رونمائی کرنے والی ہیں۔ اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں اس عزت والی کتاب کی تحریر میں۔ اس کو تحریر کرنے والے نے بمشکل تمام کیا سرمایہ ظاہر کیا ہے۔ گویا اس نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور پہاڑ کو ایک تنکا بنا دیا ہے۔ اور اس کی اعلیٰ باتوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ بے مثل کتاب بن گئی ہے۔ یہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے یکتا ہے کہ جو مشرق سے مغرب تک اپنی مثل نہیں رکھتی۔ اس کو اس طریقہ سے لکھا کہ سوائے اس کے اور کسی کا کام نہیں تھا۔ اور ایسے وسیع جنگل کو اتنی خوبصورتی سے طے کیا کہ ہر مسافر کی یہ ہمت نہ تھی۔ یہ دریا کی طرح بے پایاں شان والی کتاب اور یہ الہامی کتاب اور مجھ جیسا بے سروسامان، ناواقف انسان۔ کیا ایسے آدمی کیلئے مناسب ہے کہ اپنا سر گریبان سے نکالے۔ اس سوچ سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ اور میرا قلم نیچے گر پڑا۔)

ھذا اما قرظہ حکیم مولوی سید احمد وارثی زمانوی ثم السیتافوری

قد شرفت بمطالعة بعض اجزاء الرسالة الموسومة بارشادات الوارثیه فوجدتها کثیرة الفوائد جلیلة العوائد فللّٰه ورمولفها و هواخ المعتمد محمد المد عو بابراهیم بیگ الشیدا افقصدات ان حررفی تاریخها مصاریع عدیدة وھذا ماتیسر لی منهافی التعجیل۔

بیانہا از سلوک وارث پاکؒ بعنوان ہائے گونا گون مفصل

بیاضش خوبتر از روئے خوبان سوادش فائق از چشم مکحل

بصورت لفظ لفظش سورۂ نور بمعنی حرف حرفش وحی منزل

سوادش شد درین فرخندہ آدان بدست حضرت شیدا مکمل

رقم زد سال طبعش کلک احمد

صراط العشق و العرفان مدلل

۱۳۴۳ھ

(رسالہ ارشادالوارثیہ کے کچھ اجزا کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔ پس میں نے اس کو واضح طور پر کثیرالفوائد سمجھا۔ پس اللہ کی رحمت ہواس کے مصنف پر جس نے اسے لکھا۔ مصنف میرے معتمد بھائی محمد ابراہیم بیگ شیداوارثی ہیں۔ میں نے اس کتاب کا قطعہ تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تو یہ وہ الفاظ ہیں کہ جو جلدی جلدی مجھ سے لکھے گئے۔۔۔۔۔۔۔ یہ وارث پاکؒ کے سلوک کا بیان ہے۔ کئی قسم کے عنوانوں کو تفصیل

سے بیان کیا گیا ہے۔ ان اوراق کی سفیدی خوبصورت چہرے والوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اور اس کی سیاہی سرگیں آنکھ سے زیادہ عمدہ ہے۔ اس کے الفاظ کی صورت سورۂ نور کے الفاظ کی صورت ہے۔ اور اس کے حروف کے معنی نازل شدہ وحی ہے۔ اس کی تحریر جس مبارک وقت میں حضرت شیدا کے ہاتھ سے مکمل ہوئی ہے۔ اس کے طبع ہونے کا سال احمدؐ کی قلم نے یہ لکھا ہے کہ عشق اور عرفان کا راستہ دلیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔)

تاریخ از چکیدہ قلم اعجاز رقم جناب شیخ اعجاز احمد عرف نوشہ میاں صاحب مذاقی، چاریاری، بدایونی، مدظلہ العالی

چوشید اے فرزانہ کار دان　　　رقم زد کتابے بطرز عجیب
اگر گویمش راست باشد سخن　　　بہ تصیف آوردہ عشق غریب
چہ لائق مصنف چہ زیبا کتاب　　　مگر نسخہ این باشد و آن طبیب
دلم کرد نوشہ بسالش رقم
کتابے پراز راز عشق حبیب
۱۳۴۳ ہجری

(اگر میں یہ بات کہوں تو سچ ہوگی کہ دانشور شیدا نے اس کتاب کو عجیب انداز سے لکھا ہے۔اس نے عجیب وغریب عشق کی تصنیف کی ہے۔کیا ہی یہ لائق مصنف ہے اور کیا ہی یہ خوبصورت کتاب ہے۔گویا یہ نسخہ ہے اور وہ طبیب۔میرے دل نے اس کی تحریر کا سال یہ رقم کرایا ہے کہ دوست کے عشق کے راز سے یہ کتاب بھری ہوئی ہے۔)

تقریظ دلپذیر وتاریخ بے نظیر از نتیجہ فکر حکیم مولوی ضمیر احمد صاحب وارثی رئیس بچھرایوں ضلع مرادآباد

نحمدہ ونصلی علٰے رسولہ الکریم۔ ہمارے خواجہ تاش مرزا محمد ابراہیم بیگ صاحب وارثی متخلص بہ شیدا نے منہاج العشقیہ کا یہ دوسرا حصہ اس خوبی کے ساتھ تالیف فرمایا جس کو سالکان راہ طلب کا خضر طریق اور واقفان اسرارِ فقر کا مونس و رفیق کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا جس کا ہر نکتہ باب تحقیق کا ایک دفتر اور ہر حرف دریائے تدقیق کا بے بہا گوہر ہے۔ خصوصاً غلامان وارثی اس رسالہ کو اگر حرز جان کہیں تو بجا اور تعویذ بازوئے ایمان سمجھیں تو روا ہے۔ کیونکہ رہنمائی کامل کے ان ملفوظات کا یہ مجموعہ ہے جو فقرائے تہبند پوش کے حق میں حضور نے بطور تعیم متواتر فرمائے ہیں۔ مولف موصوف نے بکمال شرح وبسط سلیس اور بامحاورہ الفاظ میں اور ایسے محققانہ طریق سے نقل کئے ہیں کہ متقدمین حضرات صوفیہ کرام کے حالات اور سلف صالحین کے ارشادات سے تطبیق فرمائی ہے جو ممدوح کا خاص حصہ ہے۔ لہٰذا ہم شکر گذار ہیں کہ پیشوائے حقیقی کے یہ احکام جو ہنوز پردۂ خفا میں منتشر تھے آپکی سعی بلیغ سے مجتمع ہوئے جو ہمیشہ ہمیشہ غلامان بارگاہ وارثی کی معلومات کا ذریعہ ہوں گے۔ آخر میں قطعہ تاریخ نگارش ہے۔

اذنتکم بامعشر الخلان

فی نشر سلک الدر والمرجان

اھدی بہ من ریح الصبافی

نشــر طیــب الــروح و الــریحــان

لــلّٰــــه درالــقــول بــاالتــالیف

مستـحسـن مـا قـال فـی الاحسـان

ارختــــه متیـقــنـــاًبـکــمـــالــه

قــد صــرح بــالعشق و العـرفـان

۱۳۴۳ھ

(اے دوستوں کی جماعت میں تم میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ یہ مرجان اور موتیوں کی ایک لڑی ہے، نثر میں۔ یہ صبح کی ہوا سے زیادہ رہنمائی کرنے والی ہے۔ پاکیزہ خوشبو ہے جو عطر اور ریحان میں ہوتی ہے۔ یہ مخصوص باتیں تصنیف کرنے کیلئے اللہ کی رحمت ہو مصنف پر۔ بہت اعلیٰ ہے جو اس نے احسان کے

بارے میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب کو یقیناً کمال انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ بے شک اس میں عشق اور عرفان کی تصریح کی گئی ہے۔)

قطعہ تاریخ طبع از نتیجہ فکر عالی مقبول بارگاہِ صمد
جناب قاضی سلیمان احمد صاحب وارثی لکھنوی

بہ قیل و قال افتادن نہ دین است مگر گویم کہ اصل دین یقین است
یقین را بالیقین ما عشق دانیم ہمیں است وہمیں است وہمیں است
اگر باشد ہوائے سیر گلشن بیا بنگر چہ گلہا اندرین است
اگر داری سرے در کوئے محبوب بیا خیزبا مارہ چنین است
اگر سینہ دگر باشد سفینہ خوشاہر دو کہ دردی حال این است
بدین منہج بہ الفاظ مبارک کہ گفتہ قبلۂ دنیا و دین است
سطور چندرا مبسوط کردم کہ آخر یاد گار این حزین است
پے سالش ندا آمد سلیمانؔ
بگو، لب طریق عاشقین است

۱۳ ہجری ۴۳

(قیل وقال میں مصروف ہونا دین نہیں ہے۔ اصل دین یقین ہے۔ عشق یہی ہے کہ ہم یقین کو یقین کے ساتھ جانیں۔ حقیقت یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے۔ اگر باغ کی سیر کرنا ہوتو آجااور دیکھ کہ اس کے اندر کیا ہی عجیب پھول ہیں۔ اگر تو محبوب کی گلی کی چاہت رکھتا ہے تو آجااور اٹھ ہمارے ساتھ چل کہ اس کا راستہ یہی ہے۔ اگر سینہ سفینہ بن جائے تو خوش ہوجا اس پہ کہ اصل حال یہی ہے۔ اسی طریقے سے مبارک الفاظ

سے کہ جو دین و دنیا کے قبلہ نے فرمائے ہیں۔ میں نے یہ چند سطور رقم کیں کہ اس پریشان حال کی یہ یادگار رہے۔ سلیمانؔ کو اس کے سال کیلئے یہ ندا آئی۔ بیان کر کہ یہی عاشقوں کے طریقہ کا لب لباب ہے۔)

تمت بالخیر

تفصیل اشاعت کتاب ھذا

الحمدللہ کہ کتاب لاجواب موسوم بہ
منہاج العشقیہ فی ارشادالوارثیہ
از تالیف مرزا محمد ابراہیم بیگ صاحب شیدؔا وارثی
(اوّلیں طباعت۔۱۹۵۶ء)
باہتمام عزیز احمد در مطبع جوبلی پرنٹنگ ورکس
فریئر روڈ۔کراچی۔طبع شد

....

(پہلے ایڈیشن کی سکین کاپی درگاہ وارثی ایسوسی ایشن۔دیوہ شریف ضلع بارہ
بنکی نے ۲۰۰۰ء میں شائع کی)

....

(نقش ثانی مع تسہیل وتخریج وحواشی: ۲۰۱۸ء)
مکتبۂ وارثیہ سنگھوئی، جہلم (پاکستان)

....

سلسلہ وارثیہ کی چند تعارفی کتب

☆ تحفۃ الاصفیاء (فارسی)	منشی خدا بخش شائق
☆ عین الیقین	عبدالآدشاہ وارثی
☆ حیاتِ وارث	مرزاابراہیم بیگ شیداوارثی
☆ مشکوٰۃِ حقانیت	فضل حسین وارثی اوٹاوی
☆ حیاتِ وارث	مرزامنعم بیگ وارثی
☆ جلوۂ وارث	حکیم صفدر علی وارثی
☆ منہاج العشقیہ	مرزاابراہیم بیگ شیداوارثی
☆ الوارث (انگلش)	حاجی غفورشاہ وارثی حسامی
☆ انیسویں صدی کا صوفی (انگلش)	افتخار حسین وارثی
☆ تحفۂ درویش	پنڈت دیندارشاہ وارثی
☆ رسالہ تعارفِ وارثیہ	بیدم شاہ وارثی
☆ ندائے غیبی	محبوب شاہ وارثی
☆ چراغِ راہ	حسین وارثی سہسرامی

☆ شہابِ ثاقب	میاں اوگھٹ شاہ وارثی
☆ خلاصۃ السلوک	مرزاابراہیم بیگ شیداوارثی
☆ بلوغ المرام	مرزاابراہیم بیگ شیداوارثی
☆ آفتابِ ولایت	پروفیسر فیاض کاوش وارثی
☆ عکسِ جمال	راشدعزیزوارثی
☆ عرفانِ حق	راشدعزیزوارثی
☆ گل بستانِ وارث	راشدعزیزوارثی

خصوصی گزارش

تمام احباب کو مطلع کیا جاتا ہے کہ تصوف اسلام اور سلسلۂ وارثیہ کے متعلق ایک جامع انسائیکلو پیڈیا ''معارفِ وارثیہ'' مرتب کرنے کیلئے تحقیق وتحریر کا کام بحمد اللہ تعالیٰ جاری ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم اور مشکل کام ہے۔ جو یقیناً کسی فردِ واحد کے بس کا روگ نہیں بلکہ ایک ٹیم ورک ہے۔ لہٰذا اس کام کو بفضلِ خدا بخیر وخوبی جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے تمام احباب کی خدمت میں بصد ادب واحترام ہر طرح کے مکمل تعاون کی گزارش کی جاتی ہے۔

اس انسائیکلو پیڈیا کے مرتب کرنے کیلئے سرکار سیدنا حاجی وارث علی شاہ قدس سرہ العزیز، حضرت حافظ اکمل شاہ وارثیؒ، حضرت الحاج فقیر عزت شاہ وارثیؒ، سید عنبر علی شاہ وارثی اجمیریؒ، دیگر فقراء اور مشاہیر سلسلۂ وارثیہ کے متعلق ہر قسم کی شائع شدہ کتابوں، غیر شائع شدہ تحریروں (مخطوطات / قلمی کتابیں) وارثی فقراء اور وارثی مشاہیر کی تصانیف، اُن کے خطابات، گفتگو، انٹرویوز، اعراس اور دیگر اجتماعات (تقریبات) کی آڈیو، ویڈیو کیسٹوں، سی ڈیز، ڈی وی ڈی، سلسلۂ وارثیہ کے زیر اہتمام کام

کرنے والے اداروں ، مساجد ، مدارس اور انجمنوں کے متعلق جامع رپورٹس، مختلف لوگوں کی سرکار وارثِ پاکؒ اور دیگر فقراء سے وابستگی کے متعلق حالات وواقعات، مشاہدات اور تاثرات، خطوط، تصاویر، اخبارات، رسائل اور مستند زبانی معلومات کی اشد ضرورت ہے۔

سلسلۂ وارثیہ کی تاریخ، تعلیمات اور تبرکات کو آنے والی نسلوں کیلئے محفوظ کرنے کا فریضہ تمام وارثی احباب پر عائد ہوتا ہے۔ لہٰذا براہِ کرم ایسی تمام دستاویزات اصل یا نقل کسی بھی حالت میں راقم السطور کو مہیا فرما کر مشکور وممنون فرمائیں۔

اللہ کریم اس عظیم کام میں حصہ لینے والوں کو اجرِ عظیم سے نوازے۔ آمین ثم آمین یارب العالمین بحق سید المرسلین ﷺ۔

خاکِ درِ حبیب ﷺ

راشد عزیز وارثی

المعروف فقیر مراد شاہ وارثی

مکتبۂ وارثیہ سنگھوئی، تحصیل وضلع جہلم (پاکستان)

E-Mail: rawarsi707@gmail.com

Mobile: 03465849707---03335842707